اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت اور فن

ڈاکٹر شاہین مفتی

پاکستانی ادب کے معمار

(نمبر ۱۱۹)

ڈاکٹر سلیم اختر
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر سلیم اختر

شخصیت اور فن

ڈاکٹر شاہین مفتی

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	:	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
منتظم	:	زاہدہ پروین
نگران منصوبہ وطباعت	:	علی یاسر
تدوین	:	اختر رضا سلیمی
اشاعت	:	2015ء
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	NUST پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد-/370: روپے
		پیپر بیک-/350 روپے

ISBN: 978-969-472-285-6

Pakistani Adab Ke Maemar

"Dr. Salim Akhtar: Shakhsiat Aur Fun"

Written By

Dr. Shaheen Mufti

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad, Pakistan

فہرست

E Books
WHATSAPP GROUP

پیش نامہ

پاکستانی ادب کے معمار اکادمی ادبیات پاکستان کا اہم اشاعتی منصوبہ ہے۔ اس منصوبے کے تحت پاکستانی ادب کے اہم لکھنے والوں کی حیات، فن اور خدمات کے حوالے سے تعارفی و تحقیقی کتب شائع کی جاتی رہی ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے پاکستانی زبانوں اور ادب کے مشاہیر کے کام اور شخصیت کو عام قاری کے علاوہ مستقبل کے محققین سے روشناس کرایا جارہا ہے۔ پاکستانی ادب کے معمار سیریز میں ہم پاکستانی ادب، زبانوں اور اصناف کے تمام اہم اہلِ قلم کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ ان کتابوں میں پیش کیے گئے علمی، ادبی اور تحقیقی مواد سے یونی ورسٹی کے طالب علم اور مختلف محققین اپنے تحقیقی مقالات میں استفادہ کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر معروف محقق، ناقد، دانش ور، ادبی مؤرخ اور ماہرِ نفسیات ہیں۔ ان کی تصانیف سے اردو ادب کا طالب علم کسی نہ کسی حد تک استفادہ ضرور کرتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے فن و شخصیت کے حوالے سے شائع کر رہے ہیں۔

کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر شاہین مفتی بھی معروف شاعرہ، محقق اور ناقد ہیں۔ ڈاکٹر شاہین مفتی نے ڈاکٹر سلیم اختر کے حوالے سے انتہائی عمدہ کتاب تحریر کی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر سلیم اختر کی حیات و ادبی خدمات کے حوالے سے اہم دستاویز ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو (تمغۂ امتیاز)

چیئرمین، اکادمی ادبیات پاکستان

عرضِ مصنف

کبھی کبھی ہم اپنے آپ کو تلاش کرنے نکلتے ہیں اور بہت دُور جا پہنچتے ہیں، کچھ ایسا ہی وقوعہ ڈاکٹر سلیم اختر کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ فطری اعتبار سے تو وہ اپنے آپ کو منیر شامی کا ہمہ پلہ سمجھتے ہوئے اپنی مجہولیت کی درازعمری اور اپنے ہم زاد حاتم کی سرفرازی کی دعا مانگنا چاہتے تھے لیکن تقلیب آوری کی واردات کب سرزد ہوئی اس کا تعین نہ کر سکے۔ افسانہ نگاری کے کوہِ ندا سے یا اخی کی صدا بلند ہوتی رہی یہ تنقید نگاری کے دشتِ بے اماں میں پرائی آگ سینکتے اور لہولہان ہوتے رہے۔ آہستہ آہستہ مرنجاں مرنج سلیم اختر کی شخصیت دو دھاری تلوار میں ڈھلتی رہی، ایک طرف ہم نوائی کا عذاب اور دوسری جانب بیسٹ سیلر پراڈاکٹ ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' پر ہجوم کی واہ واہ اور رقیبانِ سخن ناشناس کی سنگ زنی، عُزلت نشینی اور مجلس آرائی کا آسمانی جھولا اپنے اپنے وقت پر زیروزبر ہوتا رہا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے نئے پرانے حواریوں اور خود ان کا اپنا کہنا ہے کہ وہ نفسیاتی معاملات کو ہی اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتے ہیں چناں چہ فرد کی نفسیات اور الجھنوں سے شناسائی کے بعد وہ ہجوم کی نفسیات اور اس کے علاج کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ وہ عمر بھر علم، کتاب، تخلیق، تنقید، تعمیر، تربیت، تالیف کے جس کارِ دقیق میں مگن رہے، اُس نے اُن کی شخصیت کے شجر کو ایک آرکی ٹائپ میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان کی کتابوں کے مینا بازار میں قدم رکھیے: تاریخ و تحقیق، تخلیق و تالیف، افسانہ و افسوں، خواتین کی نفسیات، مردوں کی الجھنیں، بچوں کا ادب، نصابی محاکے، مسکرانے کے ٹوٹکے، زندگی کو فعال اور پُرمسرت بنانے کے نسخے، چھوٹے بڑے شاعر، مشہور و غیر معروف ادیب، دیسی بدیسی لکھنے والے، نفسیات دان، دوست دشمن، قصیدے لکھنے والے، پتھر مارنے والے الغرض سب شیر اور سب بکریاں ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتی نظر آئیں گی اور ان سب کے درمیان سب میں موجود اور سب سے مخفی داستان طراز سلیم اختر خوف کے جنگل میں عفریتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کسی محبوبہ، جاں فزا کا منتظر ملے گا۔ نیکی، خیر، حسن، صداقت اور مسرت کی تلاش کے اسی تجربے نے ان کی تحریروں کو ہر طرح کی کہولت سے بے نیاز رکھا ہے اور یہی طرزِ سلیم ہے۔ ان تحریروں کا ایک بڑا وصف پاکستانیت اور بہتر مستقبل کے خواب ہیں۔

اس مختصر سی کتاب میں، ڈاکٹر صاحب موصوف کی کثیر الجہات شخصیت اور ان کی تحریروں کا اجمالی جائزہ ہی ممکن ہوسکا ہے، تاہم ان کے تصورات اور اظہار کے دو بڑے پیمانوں کا مرحلہ وار جائزہ، زندگی اور زمانے کی روش کے بارے میں ان کے نظریات کو، ان کے قاری تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوگا۔ اس سفر میں آپ کو کئی راستے ملیں گے، بند گلی کہیں نہیں اور ہر راستے کے موڑ پر خود سلیم اختر کی پرچھائیں آپ کا سواگت کررہی ہوگی۔

زمانہ ڈاکٹر صاحب کے کمالات کا معترف ہے، ان کی ادبی خدمات کی دمادم صدائے کن فیکون بہت دیر تک جہانِ ادب میں گونجتی رہے گی۔

ذاتی طور پر مجھے اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے، اُردو ادب کی ایک مقبول، مستند اور منفرد شخصیت پر خیال آرائی کا موقع فراہم کیا۔

میں اکادمی ادبیات پاکستان کے انچارج مطبوعات جناب علی یاسر کی بھی شکر گزار ہوں، جنہوں نے بڑے اہتمام سے اس کتاب کو شائع کیا اور مجھے معقول مشوروں سے نوازا۔

میری دعا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر تا دیر سلامت رہیں۔ ان کی جاندار، کاٹ دار اور فکر انگیز تنقید کے ساتھ ساتھ ان کے قارئین ان کی افسانہ طرازی سے بھی فیض یاب ہوتے رہیں۔ شعور و لاشعور کے نرگسی مسائل کے ساتھ ساتھ تذکرہ، اشجار، رزق حلال، طوطا کہانی، بارھواں کھلاڑی، گرو دکھشنا اور خضوع و خشوع جیسے افسانے ہم پر حکمت کے موتی لٹاتے رہیں۔ اسی طرح ان کی تحریروں کے تراجم پاکستانی ادب کا سر فخر سے بلند کرتے رہیں۔

ڈاکٹر شاہین مفتی

چہرہ در چہرہ

برج حوت کی علامت مخالف سمت میں سفر کرتی دو مچھلیاں ہیں۔ مچھلیوں کی رعایت سے اس برج کا بنیادی عنصر پانی اور حاکم سیارہ نیپچون ہے جمعہ سعد دن ہے، ارغوانی رنگ موافق ہے اور پانچ، سات، آٹھ اور نو خوش قسمت اعداد ہیں۔ بارہویں برج حوت کے زیر اثر جنم لینے والے افراد وجدان کے حامل، فنونِ لطیفہ کے دلدادہ اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ برج حوت کے زیرِ اثر گیارہ مارچ ۱۹۳۴ء کو فلیمنگ روڈ قلعہ گوجر سنگھ لاہور کی متصل گلی کے ایک مکان میں سلیم اختر نے جنم لیا۔

سلیم اختر کے والد قاضی عبدالحمید قریشی اکاونٹنسی سے متعلق تھے اور اسی طرح ان کے دادا قاضی عبدالحکیم قریشی بی اے، ملٹری اکاونٹس کے شعبے میں کام کرتے رہے۔ کچھ عرصہ افغان شہزادوں کے اتالیق رہے اور پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے سرحدی علاقوں میں خدمات انجام دیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سیالکوٹ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ سلیم اختر کی والدہ امام بی بی فیروز پور کی تحصیل مکستر کے ایک گاؤں رتہ تھیٹرا کی رہنے والی تھیں ان کے والد نور حسن سکول میں پڑھاتے تھے اسی نسبت سے منشی کہلائے۔ نسلی اعتبار سے یہ ایک راج پوت گھرانہ تھا۔ امام بی بی جو شادی کے بعد رضیہ بیگم کہلائیں ایک ترقی پسند ذہن رکھنے والی تعلیم یافتہ عورت تھیں تین بیٹوں اور تین بیٹیوں کی شاندار پرورش کی اور ان کی زندگیوں کو بھی ویسا ہی موثر اور ڈرامائی بنا دیا جیسا وہ اپنی کہانیوں میں بیان کیا کرتی تھیں۔ ان کے بیان کردہ مافوق الفطرت قصے مصنف کی زندگی پر ان مٹ نقش چھوڑ گئے۔ سلیم اختر کو عرصے تک اپنے والد اور والدہ کی خدمت کا موقع ملا۔ نوجوانی کی شوریدہ سری اور انکار کی عادت نے بسا اوقات والدین اور سلیم اختر کے مابین اکتاہٹ اور بدمزگی کے مواقعے پیدا کیے لیکن رشتوں کی ڈور مضبوط رہی باپ اور دادا کے گوشواروں کی مہارت سے سلیم اختر نے بھی زندگی کا حساب کتاب متوازن رکھنے کی کوشش کی، بقول مصنف:

”باپ اور بیٹے کے نفسیاتی رابطے کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ

بیٹا باپ سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے مگر بھاگ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تو باپ کے جوتے پہن کر ہی بھاگ رہا ہے۔" (ص ۲۶۔ نشانِ جگر سوختہ از سلیم اختر، مطبوعہ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء)

سلیم اختر کے زائچہ نویس عمر زمان نے سلیم اختر کے اعداد و شمار کے پیش نظر انہیں پیدائشی نقاد قرار دیا ہے۔ وہ ڈاکٹر سلیم اختر کی رازدارانہ طبیعت، موسیقی اور سیاحت سے دلچسپی کی نشاندہی کرتے ہوئے پُراسرار علوم سے دلچسپی کا بھی ذکر کرتا ہے اور انھیں انتہا درجے کا انا پسند اور آتشی مزاج شخص سمجھتا ہے، جس کی شخصیت مقبول بھی ہے اور مشکل بھی، جس کے قریبی لوگوں سے تعلقات میں گڑبڑ رہتی ہے جس کے جنسی میلانات نمایاں اور پیچیدہ ہیں، وہ زندہ دل، خوش مزاج اور باصلاحیت ہونے کے باوجود بنیادی طور پر شکی مزاج، سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے والا، مستقل مزاج اور پُرامید شخص ہے۔

بقول سلیم اختر:

"کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری شخصیت دولخت ہے۔ میں بیک وقت دو جذباتی دھاروں میں ہوتا ہوں، ماضی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اس رویے کو بچپن سے خود میں پاتا ہوں۔ باہر شرارتیں کرنے والا سلیم اختر گھر بیٹھ کر مطالعہ کرنے والے اور لکھنے والے سلیم اختر سے ناواقف رہتا۔ میں ایک "Precocious" لڑکا تھا جس کے باعث میں نے ہر کام عمر اور وقت سے پہلے کیا اور ممنوعہ ذائقوں کی لذت سے تعارف پیدا کیا، نہ جانے کیسے غیر مرئی انجینے میرے اعصاب میں لگے تھے کہ ہر طرح کے احساسات اور تاثرات کی لہریں میری شخصیت میں سرایت کر جاتی تھیں۔ عمر بھر ان متضاد خصوصیات کے باعث یہ عالم رہا "Poor Brutus awlays at war with himself" اپنے ہی آئینے میں اپنے عکس سے ٹکرانے کی واردات بار بار جنم لینے والے اور بار بار فنا ہونے والے اس سلسلے سے جا ملتی ہے جسے اقبال نے ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کے لامتناہی سفر سے تعبیر کیا ہے۔ مصنف ہمہ وقت تصور کی اسی رنگ آمیزی سے بہلتا اور خود کو ایک ایسے سرکس میں مشغول پاتا ہے

جہاں وہ بار بار کسی سرکس گرل سے ہم آغوش ہو سکے۔" (ایضاً)

سلیم اختر کا بچپن متوسط گھرانے کے عام بچوں سے کوئی خاص مختلف نہیں تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں سرکاری دفتر کا بابو خوشحال اور عزت دار ہی ہوا کرتا تھا۔ فلیمنگ روڈ کی جس بند گلی میں وہ رہتے تھے، شاہ ابوالمعالی کا مزار اس کے قریب تھا اور اسی راستے پر تاجور نجیب آبادی کے رسالے "شاہکار" کا دفتر تھا، جہاں مصنف کے والد اکثر جاتے اور اختر شیرانی سے ملاقات رہتی۔ اختر شیرانی اور ان کی تصوراتی محبوبہ سلمیٰ بھی مصنف کی ابتدائی یادوں کا حصہ ہے۔

مرتے ہیں جس سلمیٰ پہ وہ سلمیٰ ہی اور ہے

پانچ برس کے سلیم اختر کے لیے اس مصرعے کا آہنگ اور سلمیٰ کی تکرار ہی کافی ہے اسی عمر میں اسے سکول میں داخل کیا گیا، سٹینڈرڈ سٹی ہائی سکول جو میکلوڈ روڈ پر واقع تھا۔ ابتداء میں وہ ایک نالائق طالب علم تھا جسے نہ انگریزی آتی نہ اُردو۔ بس ٹیچر کی ڈانٹ کھاتا اور اپنی کلاس فیلو کے کپڑوں پر سیاہی پھینکتا رہتا۔ اس اثنا میں اُسے نیلے فراک والی عیسائی لڑکیاں اچھی لگنے لگیں، وہ اس پسندیدگی کو Fixation قرار دیتا ہے، کالج کے زمانے میں بھی وہ ایک عیسائی لڑکی کے چکر میں رہا۔

۱۹۳۹ء میں عالمی جنگ شروع ہوئی تو سلیم اختر کے والد ملٹری اکاؤنٹس کے محکمے کی جانب سے مڈل ایسٹ بھیج دیئے گئے اور سلیم اختر اپنی پھوپھی کے پاس بلوچستان کے ایک قصبے فورٹ سنڈیمن آ گئے۔ ۱۹۴۱ء میں والد کی واپسی کے بعد پونا اور پھر بمبئی چلے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں پونا کے قیام کے دوران میں انھیں ایک پرائمری سکول میں دوسری جماعت میں داخل کرایا گیا، نیکر اور قمیص میں ملبوس جب وہ سکول پہنچے تو ماسٹر نے انھیں ہیرو سے زیرو کر دیا، اسلامی انجمن کے مسلم سکول میں انھیں کرسٹان قرار دیا گیا اور دوسرے طلبہ کی طرح ٹوپی اور پاجامہ کی پابندی لگائی گئی، بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> "ہم باپ بیٹا چلے ٹوپی لینے، ٹوپی تو لے لی لیکن بس میں سوار ہونے لگے تو کسی نے پاکٹ مار لی، سو مہینہ بھر کی تنخواہ میں ٹوپی پڑی۔ یوں ٹوپی سے میری ایسی نیگٹیو کنڈیشنگ ہوئی کہ ہنوز ہر رنگ، قطع اور نسل کی ٹوپی ناپسند ہے۔" (ص ۳۷: ایضاً)

پونا ہی میں سلیم اختر شراب اور عدم کے نام سے متعارف ہوئے۔ عدم اور ان کا بھاری جسم، پکے رنگ اور موٹے نقوش والی چیچک زدہ بیوی ملکیہ، ان کے ہمسائے میں آباد تھے۔ قاضی عبدالحمید قریشی اور عبدالحمید عدم دونوں ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے اور سلیم اختر ملکیہ کے لیے سگریٹ خرید کر لانے پر مامور۔ بچپن کے اس تجربے سے شراب و شاعر کے بارے میں مصنف کے ہاں جو ردِ عمل پیدا ہوا اس کے بارے میں

اس نے لکھا ہے:

''در ایام جوانی تلخی ایام کو کم کرنے کے لیے، رومانی فلموں کے ہیرو کی مانند میں نے بھی شراب پی لیکن قطعاً نشہ نہ ہوا۔ سب نے کہا تم تو پرانے پاپی ہو۔ جب نفسیات کا مطالعہ کیا تو میں سمجھا کہ شراب کے خلاف میری داخلی مزاحمت اتنی قوی تھی کہ اس نے الکحل کو مات دے دی۔'' (ص ۳۹،۳۸: ایضاً)

اسی سلیمانی ٹوپی اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہننے والے سکول کے طالب علم کی حیثیت سے سلیم اختر نے آہستہ آہستہ مسابقت کا عمل سیکھا اور اچھے نمبروں کی وجہ سے جماعت کے مانیٹر بن گئے۔ تیسری جماعت تک انہیں ''مسدسِ حالی'' کے ابتدائی بند ازبر ہو چکے تھے اور انھوں نے تقریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا، یہیں انھیں 'قائداعظم' کے نام سے آگاہی ہوئی۔ پونے کے اونچے سڈول درخت، تاڑی پیتے مرد، بیڑی پیتی عورتیں، دوہرے جسم والی مرہٹنیں، سبزی مارکیٹ کی زنانہ دکاندارنیاں اور پونے کی سڑکوں پر ہمہ وقت دیوی دیوتاؤں کے بُت اٹھائے گزرتے جلوس، مصنف کے افسانوں میں جھلکتے ہیں۔ پونے کے تعزیے اور ''باگھ'' دہکتے کوئلوں پر ماتم اور دوندیوں کے سنگم پر تعزیے ٹھنڈے کرنے کی رسومات آگے چل کر وسیع المشرب مذہبی خیالات کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔

پونے ہی میں مصنف نے سینما گھروں کا محلِ وقوع معلوم کیا اور فلم ''قسمت'' کے ہیرو اشوک کمار کی محبت میں مبتلا ہوا۔ فلم دیکھی تو گویا سارے کشٹ کی قیمت وصول ہوگئی۔ وہ بنیادی طور پر impulsive ہے اس لیے جذبات و احساسات کی لمبی اور دیرپا منصوبہ بندی سے قاصر ہے۔ مزاج کی سیمابیت ہردم بے چین اور متحرک رکھتی ہے۔ پونے کی یادیں، بھگوان داس کی چال، اس کے مکین، دل خوش ٹا کی، باوا جان کے مزار کا پرائمری سکول اب صرف اس کی یاد کا حصہ ہے جہاں اگربتی اور لوبان کا دھواں پھیلا ہے۔

۱۹۴۴ء میں ملٹری اکاونٹس کا عملہ انبالہ چھاؤنی میں تبدیل کر دیا گیا، چھوٹے بازار اور تنگ گلیاں، گرد و گرما مستزاد۔ نکا بازار کے قریب شیخ تھن کے محلے میں آباد ہونے کا موقع ملا۔ تین منزلہ مکان میں رہائش کے باعث کبوتر بازی کا شوق بھی پورا ہوا۔ انبالہ آموں اور دریوں کا شہر تھا، جہاں فرشی کھڈیوں پر عورتیں کام کرتیں، یہیں مسلم ہائی سکول میں داخلہ ہوا، انبالہ کی ایک وجہ شہرت ناصر کاظمی اور دوسری حسن رضوی ہیں لیکن مصنف کی بیوی سعیدہ نے بھی ۱۹۳۸ء میں انبالہ ہی میں جنم لیا۔ پونا میں سلیم اختر نے بچوں کی کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کا مطالعہ کیا اور پھر تیرتھ رام فیروز پوری کے جاسوسی ناول، صادق صدیقی سردھنوی کے تاریخی ناول اور ایم اسلم کے اصلاحی و سماجی ناولوں سے کسبِ فیض کرنے

لگے۔ گھر پر تعلیم و تربیت اور دیگر رسالے منگوائے جاتے تھے۔ انھی غیر نصابی کتب نے سلیم اختر کو لکھنے لکھانے کی طرف مائل کیا۔ اسی اثنا میں عدم بھی انبالہ آ گئے جن کے دو بچے مصنف کے دوست بن گئے، مشاعروں اور ادبی تقاریب میں جانے کا موقع ملا اور یہیں ابنِ انشا کو دیکھنے اور ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی۔

شعرا کی محفل اور نشست و برخاست کے نتائج واضح ہونے لگے سلیم اختر نے ''انجان'' تخلص رکھا اور شاعری شروع کر دی۔ عدم اُستاد مقرر ہوئے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا البتہ مطالعہ کی عادت جنون کا درجہ اختیار کر گئی اور ساتھ ہی ساتھ پتنگ بازی کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں چھٹی جماعت میں انھوں نے ایک کہانی لکھی ''ایماندار مصور'' جو 'تعلیم و تربیت' میں شائع ہوئی، اسی طرح ان کی ڈرائنگ اور لطیفے بھی مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔

سلیم اختر کو پونا اور پھر انبالہ میں مجمع بازوں کی لچھے دار گفتگو اور کہانیاں سننے کا تجربہ ہوا، بقول سلیم اختر:

> ''جیسے جیسے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا اسی مناسبت سے اس کے بیان کے جوش کا گراف بلند سے بلند تر ہوتا جاتا۔ بچہ لوگ آگے بیٹھے ہوتے اور پھر عین اس وقت افسانہ کی اصطلاح میں ''کلائمکس'' آتا وہ بالغوں کو آنکھ مار کر ہمیں بھگا دیتا۔ جنس سے میری دلچسپی کی اولین اساس ان گمنام مجمع بازوں کی مرہونِ منت ہے۔'' (ص ۵۳: ایضاً)

پانچویں چھٹے درجے میں پڑھنے والا سلیم اختر مشہور ایکٹرسوں سے اس قدر متاثر تھا کہ جوتوں کے ڈبے کو موٹے تنکوں اور کاغذ کی ریل کی مدد سے ''سلیم ٹاکی'' میں تبدیل کر لیتا اور فارغ وقت میں کاغذ پہ چپکی ہوئی تصاویر کی فلم چلایا کرتا۔ اسی طرح ماچسیں جوڑ کر ان کی عمارتیں اور صوفے سنگھار میز بنا کر اپنا دل بہلاتا۔ فورٹ سنڈیمن میں اس کے پاس ایک کیمرہ تھا جس سے تمام دن فوٹوگرافی کرتا۔

۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے یونینسٹ پارٹی کے خضر حیات کی حکومت کے خلاف تحریک کا آغاز کیا تو سلیم اختر بھی پاکستان کی حمایت میں نعرہ زنی کرتا رہا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں انبالہ منڈی میں جلسہ ہوا، فضا 'جے ہند' کے نعروں سے گونج اٹھی، پنجاب فسادات کی خونیں گرفت میں تھا۔ سفر ناممکن ہو چکا تھا، انبالہ اجڑ چکا تھا۔ نہ رونق، نہ چہل پہل۔ سکول بند، بازار بند، آخر انبالہ سے ٹرین چلنے کا اعلان ہوا۔ سرکاری ملازمین کے لیے درجن بھر لاریاں منگوائی گئیں، یہ قافلہ روانہ ہوا۔ سلیم اختر کا بچپن اور لڑکپن شیخ تھمن کے محلّہ کے سب سے اونچے اور پختہ مکان میں رہ گیا، یادیں اور چند کپڑے ساتھ آئے، فجر کو جس سفر کا آغاز ہوا رات گئے ختم ہوا، پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے سب لوگ سجدہ ریز ہوئے،

کچھ خوشی سے روئے، کچھ انبالہ کو یاد کر کے، کچھ مستقبل کے اندیشوں کے خوف سے۔ اس وقت سلیم اختر کی عمر تیرہ برس تھی اور یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ لاہور میں کوئی بھی سجائی زندگی ان کی منتظر نہ تھی اس کے باوجود والدین نے رہائش کے قریب ایک سکول میں انھیں داخل کروایا، ساتویں جماعت یہیں پاس کی۔ ۱۹۴۸ء میں ملٹری اے جی آفس کے زیر اہتمام والد راولپنڈی میں تعینات ہوئے؛ محلہ کرتار پورہ کے قریب ''نئی'' کا علاقہ تھا جہاں ہندوؤں کی اشنان گھاٹ تھی۔ راولپنڈی ایک محدود شہر تھا، یہیں مسلم ہائی سکول اصغر مال میں آٹھویں جماعت میں داخلہ مل گیا، دو ڈیڑھ برس یہاں رہے۔ ۱۹۵۱ء میں فیض الاسلام ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان دیا اور پھر گورنمنٹ کالج اصغر مال میں فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا، ۱۹۵۵ء میں یہیں سے بی اے کیا مالیاتی مجبوریوں اور کثیر عیال داری کے باعث مصنف کی والدہ اور والد طویل اور جان لیوا بیماریوں میں مبتلا ہوئے۔ آزادی ایک غلامانہ ذہنیت ہمراہ لائی تھی جو نازک مزاج عزت داروں کو راس نہیں آ رہی تھی، بقول مصنف:

> ''اباجی نے ہندوستان میں ہمیشہ امپورٹیڈ کپڑے اور جوتے پہنے تھے۔ جامہ زیب اور وجیہہ تھے، پان کے شوقین تھے، بہترین برانڈ کے سگریٹ پیتے تھے لیکن یہ عہدِ غلامی کے مزے تھے۔ وہ اب فکرمند باپ اور کام کے بوجھ تلے دبے سرکاری اہل کار تھے، تب اندازہ نہ تھا کہ دفتر کا بابو کلمہء توقیر کے برعکس کلمہء تحقیر قرار پائے گا۔ (ص۶۴: ایضاً)

آٹھویں جماعت تک شخصیت کا ایک ہیولیٰ تیار ہو چکا تھا؛ متضاد رجحانات و میلانات، متناقص رویے، بحران آسا احساسات اندر ہی اندر آتش بداماں اور کف آلود، بظاہر بھلا مانس، بالعموم خاموش، ٹھٹھکا اور جھجکا ہوا۔ اعصابیت اور اس کے پیدا کردہ الجھاؤ کے باعث مفاہمت اور مقاومت کے دو محاذوں پر اپنے آپ سے نبرد آزما، چھوڑی ہوئی زندگی کی یاد میں نیم بے دلی اور نیم زندہ دلی کے ساتھ غلطاں و پیچاں، آخری ڈیسکوں پر بیٹھ کر دوستوں سے سرگوشیاں کرنے والا تساہل پسند البتہ عاصیوں کے حلقے میں برگزیدہ۔ اب اُسے انگریزی فلموں کا لپکا تھا۔ راولپنڈی میں آوارہ گرد دوستوں کی منڈلی۔ نہا دھو کر، بن ٹھن کر سرِ شام شکروں کی مانند نکلتی اور ریستورانوں یا سینما گھروں کی خاک چھانتی پھرتی، جب کوئی دوست نہ ہوتا تو سلیم اختر تنہا سڑکوں پر رواں دواں رہتا گویا بلا مقصد میلوں پیدل چلنا تنے ہوئے اعصاب کو پرسکون کرنے کا بہانہ تھا۔ ازاں بعد پشاور، ملتان اور لاہور میں قیام کے دوران میں بھی یہی کیفیت رہی۔ تمام دن سڑکوں کا گز بنا رہنا اور رات مطالعے کی نذر کرنا، دو تین برسوں میں سلیم اختر کا شمار بچوں کے معروف ادیبوں میں ہونے لگا۔ ان دنوں حفیظ جالندھری کی کوٹھی اصغر مال پر تھی، گھر کے

سامنے مسجد تھی جہاں وہ شاہنامہء اسلام سنایا کرتے تھے۔ ایک شام مصنف بھی وہاں گیا لوگ رات گئے تک حفیظ کا انتظار کرتے رہے۔ حفیظ نے نماز تو نہ پڑھی البتہ منتظر سامعین کو ڈیڑھ دو گھنٹے انتظار ضرور کرایا۔

آٹھویں نویں جماعت میں سلیم اختر کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، منٹو، عصمت چغتائی کے ترقی پسند افسانوں کا مطالعہ کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ان کے دو افسانے ''قربانی'' اور ''ساحرہ'' ایک رسالہ میں شائع ہوئے۔ ایک مضمون 'شیرِ میسور' حکیم یوسف خان کے رسالے ''نیرنگِ خیال'' میں چھپا اور دو افسانے ۱۹۵۱ء میں شمع (دہلی) میں ''ایک محبوبہ ایک طوائف'' اور ''کٹھ پتلی'' کے نام سے چھپے، دوستوں میں بڑی سنسنی پھیلی اور یوں ان کا نِک نیم ''افسانہ'' پڑ گیا۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر کی خواہش تھی کہ اسے کسی ایسے ادارے میں داخل کرایا جائے، جہاں وہ فنِ موسیقی کی تعلیم حاصل کر کے فلموں کا میوزک ڈائریکٹر بن سکے۔ افسوس یہ خواہش حسرت ہی رہی۔ والد کی خواہش تھی کہ وہ آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس کو اپنا کیریئر بنائیں اور اعلیٰ افسر بنیں البتہ والدہ انہیں دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند کی سطح پر دیکھنا چاہتی تھیں۔ ایف اے میں سلیم اختر نے انگریزی، فلسفہ، اکنامکس، فارسی اور اُردو آپشنل پڑھی۔ انھیں اُردو کے پروفیسر سید صفدر حسین میسر آئے جو ڈرامیٹک کلب کے نگران تھے۔ مصنف (سلیم اختر) نے کچھ ڈراموں میں نسوانی کردار ادا کیے۔ انھوں نے بی۔ اے میں بھی فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اور نفسیات کی کتابوں سے کسبِ فیض کیا۔

کالج کے زمانے میں سلیم اختر اپنے دوستوں کے ہمراہ ہیرا منڈی پر طائرانہ نگاہ ڈالنے جاتے اور خالی جیب صرف تماش بینی پر اکتفا کرتے۔ اس تجربے کا اظہار مصنف نے اپنے ناولٹ ''ضبط کی دیوار'' میں کیا ہے۔ زمانہء طالب علمی میں ان دوستوں کو راہ چلتی لڑکیوں پر آوازے کسنے کی عادت تھی اور کبھی کبھار خطوط بازی بھی چلتی رہتی۔ اسی اثنا میں ایک رومانی معاشقہ بھی چلا لیکن زیادہ عمر نہ پا سکا۔ بی اے تک آتے آتے مصنف کا شمار کالج کے نمایاں طلبہ میں ہونے لگا۔ اُسے ''بہترین مقالہ نگار'' کا انعام ملا۔ فورتھ ائیر میں والد کا تبادلہ سیالکوٹ ہو گیا اور مصنف کالج ہاسٹل میں رہنے کے بجائے اپنے محلے ہی میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر اپنے دوستوں کے ساتھ رہنے لگا اسی اثنا میں اس نے اناطول فرانس کا مشہور ناول ''تائیس'' پڑھا تو اُسے احساس ہوا کہ مذہبی پابندیاں، معاشرتی اقدار، فلسفہء اخلاق اپنی جگہ لیکن اخلاق کی اساس ذاتی کردار ہے جو مختلف واقعات وحوادث سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ کالج کے زمانے میں سلیم اختر نے راولپنڈی کے اخبارات، ''تعمیر، کوہستان'' کے علاوہ لاہور کے ہفت روزہ ''قندیل'' کے لیے چھوٹے چھوٹے تنقیدی مضامین لکھنے شروع کیے۔ ''فلم کی کہانی، جادوگر کا انتقام اور سانپوں کی ملکہ'' کے نام سے مختصر کتابیں بھی چھپیں جو اب محفوظ نہیں۔ زمانہء طالب علمی میں ''ابن الوقت'' اور

''اکبرالہ آبادی'' پر دو مقالات ''ہمایوں'' میں شائع ہوئے جس کے مدیر ناصر کاظمی تھے۔ ازاں بعد ریڈیو کے لیے پروگرام لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا جو بہت دیر تک جاری رہا۔

مصنف نے لکھا ہے اس نے کبھی ایک خواب دیکھا تھا:

''ایک پیکر جمال، بے حجاب، بے لباس، نسوانی حسن کا ارفع نمونہ، حور پری کی مثال، جسم سے حسن کی شعاعیں یوں خارج ہو رہی ہیں کہ تارِ نگاہ کا جسم پر ٹھہرنا محال، میں نے اُسے صرف دیکھا، چھوا نہیں۔ (ص ۱۰۵: ایضاً)

پھر اس کی تاویل میں خود ہی لکھا:۔

''خاصہ عرصہ بعد میں نے ژونگ کی نفسیات کا مطالعہ کیا تب جانا کہ وہ محض عورت نہ تھی بلکہ مرد میں ملنے والی نسوانی روح (Anima) کا عکسِ جمیل۔'' (ایضاً)

ہم اس نسوانی روح سے آگے چل کر آگاہی حاصل کریں گے۔ شخصیت کی تکمیل کے لیے بہت ضروری تھا کہ سلیم اختر خاندانی نظام کی جکڑ بندیوں سے نکل کر اپنی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے کا تجربہ کرتا۔ بلوغت کے بہت دیر بعد تک اگر وہ بند اور تنگ زندگی بسر کرتا رہتا تو نہایت: دبو، میسنا، نک چڑھا، مشتعل اور لائی لگ شوہر ثابت ہوتا، جو تمام عمر زندگی کا ہینڈ پمپ چلاتے چلاتے، ایک دن پھیپھڑوں کے قدیمی مرض میں مبتلا ہو کر بدرنگ بستر پر پڑے پڑے، چڑیوں کو دانہ ڈالتا اور اپنی صحت مندی کے تعویذ گھول گھول کر پیتا رہتا۔ خدا کا شکر کہ اس کی عائد کردہ دوہری زندگی، زمانہ ءطالب علمی کے آخری ایام میں اپنے انجام کو پہنچی۔ اب وہ تھا اور اس کی اپنی ذات کی تلاش۔ بی۔ اے کے پرچے ختم ہوئے تو ۱۹۵۵ء میں وہ سیالکوٹ آ گیا۔ سیالکوٹ کے اگلے پچھلے رشتہ دار سلیم اختر بی۔ اے کو میرج ٹرافی سمجھنے لگے اور اسے اپنی اس قدر پذیرائی سے وحشت ہونے لگی۔ وہ تو اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے آنچلوں کی مستقل بہار دیکھنا چاہتا تھا، البتہ کوچہ ءحبیب میں قدم رنجہ فرمانے کی ہمت نہ تھی۔ ابا جی کی خواہش تھی کہ وہ ایم۔ اے فلسفہ میں داخلہ لے لے مگر والدہ اس حق میں نہیں تھی چناں چہ اس نے ملازمت کی ٹھانی۔ ۱۹۵۵ء کا پشاور: کراچی اور لاہور سے جداگانہ شہر تھا۔ سٹیل کلر ملیشیا میں ملبوس عوام، چربی میں تلے چپل کباب، نسوار، خشخشی اور حقے پروستے ہوئے نوجوان لڑکے: فارغ بخاری، محسن احسان، رضا ہمدانی اور خاطر غزنوی کا شہر، جہاں سے مشہور ترقی پسند رسالہ ''سنگ میل'' کا اجرا ہوا، لیکن سلیم اختر کی خوشی کا سامان نہ ہو سکا:۔

''پشاور میں دو سالہ قیام، ایام زیست کے بدترین ایام میں سے ہے۔ پریشانی

کی پُر اضطراب اور بے خواب راتیں۔ مسلسل اعصابی تناؤ کے نتیجے میں معدے کے دائمی عوارض، اپنی حالتِ زار پر رویا بھی اور خودکشی کرتے کرتے رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے کسی Bio-Data میں پشاور اور بالخصوص کلرکی کا حوالہ شامل نہیں کیا، یہ بپتا کسی اور سلیم اختر کی تھی، میری نہیں، (ص ۱۱۲: ایضاً)

پشاور میں مصنف نے ماؤتھ آرگن بجانے کا شوق پورا کیا اور اس کے ساتھ ساتھ پامسٹری اور تحریر شناسی کے فنون سے دلچسپی پیدا کی۔ اسے کنٹرولر نادرن ایریا کے Fd.v سیکشن میں ملازمت ملی لیکن وہ دفتر کے ماحول اور فائلوں کی دنیا سے مفاہمت پیدا نہ کر سکا۔ اچانک سب دوست اپنے اپنے سفر پر روانہ ہوئے تو تنہائی، یاس، پژمردگی اور ان کے پیدا کردہ اعصابی اضمحلال نے اسے ابنارمل بنا دیا۔ اسے اپنی ذہنی صحت پر شک ہونے لگا، اس کے لیے دفتر ایک ذبح خانہ تھا جہاں اس کے شکستہ اعصاب ہر روز ایک نئی موت سے ہمکنار ہوتے۔ انھی دنوں وہ اپنے کمرے میں تنہا اپنی حالت اور مستقبل کے بارے میں سوچتا رہتا اور آنسو بہاتا اور پھر اپنے ہی کندھے پر اپنا سر رکھ کر سو جاتا۔

بقول سلیم اختر:

''زندگی کا سب سے اذیت ناک احساس اس کیفیت پر مبنی ہوتا ہے جب فرد اپنے ہاتھوں اپنے لیے قبر کھودتا، اپنا کفن خود ہی تیار کرتا، سنگِ مزار خرید کر خود ہی اپنا کتبہ تحریر کرتا ہے، یوں سامانِ مرگ فراہم کر کے خود ہی قبر میں اُتر جاتا ہے۔۔۔ خود پر رونے میں بے چارگی کا احساس جس طرح شدت پیدا کرتا ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔۔۔ جب انسان کے لیے جسم حالات اور اشک فشانی انتہائی بے معنی ثابت ہوتی ہے تب موت پر کشش حسینہ کی مانند اشارہ دیتی ہے تعجب ہے کہ میں اس کے سحر سے کیسے بچ نکلا؟ ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ!۔۔۔ غالباً نادیدہ ہاتھ کی بدولت۔۔۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ یونہی بے مقصد چلتا جا رہا تھا کہ دور سے ریلوے انجن کی روشنی نظر آئی، ریل آ رہی تھی، معاً میں نے سوچا کیا فائدہ اس بے معنی زندگی کا، کیوں نہ اس کا خاتمہ کر کے ذہنی اذیت سے چھوٹ جاؤں۔ چناں چہ میں ریل کے نیچے سر دینے کو تیار ہو گیا مگر ہونے نہ ہونے میں سیکنڈ کا وقفہ تھا جو عبور نہ کر پایا، گرد اُڑاتی ریل

گزر گئی۔'' (ص ۱۲۰: ایضاً)

یہ سلیم اختر کا دوسرا اور خالص جنم تھا، بے مدار زندگی کا نقطہ ارتکاز۔ چناں چہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا، ڈاکٹر سلیم اختر نے کلرکی چھوڑی اور روزنامہ ''شہباز'' میں ملازمت اختیار کرلی۔ محنت رنگ لائی تنخواہ بھی بڑھی اور اوور ٹائم بھی ملنے لگا۔ عورتوں کا صفحہ مرتب کرنے کے لیے ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنا قلمی نام ''زریں تاج'' رکھ لیا۔ زریں باجی کا پیراہن کارآمد رہا، مدیر اخبار مطمئن ہوا تو اس نے ڈاکٹر سلیم اختر کو ایم۔ اے اُردو میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا۔ اسی دوران میں آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سے کلرکی کے انٹرویو کا نتیجہ آ گیا، اس کی سلیکشن ہو گئی تھی، اس نے گاڑی پکڑی اور سیدھا لاہور کی راہ لی۔ ۱۹۵۷ء کو اس نے آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس (ورکس) میں بطور اپر ڈویژن کلرک جوائن کیا اور جیل میں قائم برانچ کے ایک سیکشن میں کام شروع کیا۔ ایک زمانے میں پھانسی گھاٹ دیکھنے کی خواہش تھی آج اس مقام پر پہنچ کر اسے محسوس ہوا کہ وہ تو خود پھانسی پر لٹک گیا ہے۔ بے زاری کے یہ دن باغ جناح کی پہاڑی پر تنہا بینچ پر گزارتے ہوئے وہ رات گئے اشجار سے سرگوشیاں کرتا، وہ انسانوں سے کٹ گیا تھا، گھر والوں کو پیسوں کی ضرورت تھی اور سلیم اختر کو اپنی الجھنوں کا حل چاہیے تھا۔ انسان وقت کے ساتھ بدلتا ہے چناں چہ اس نے بے مقصدیت کو ہی مقصد بنا لیا اور اس طرح اعصابی خلل سے محفوظ رہنے کے طور طریقے تلاش کر لیے۔ اپنے بدمزہ لیل و نہار میں ایسے سمجھوتوں سے گریز کیا جو اخلاق باختگی کا راستہ استوار کرتے ہیں۔ ایک نادیدہ ہاتھ اسے ہر خطرناک موڑ، مقام، راستے، عورت اور صورتِ حال سے بچاتا رہا۔ اس نے اپنے دوست 'ح' کے ہمراہ فلم سٹوڈیو جانا شروع کیا، یہیں اس کی ملاقات سیف الدین سیف اور قتیل شفائی سے ہوئی۔ علم کی دنیا میں ایک بار پھر سلیم اختر کے اندر گم شدہ موسیقار انگڑائی لے کر بیدار ہوا کہ موسیقی کی شام کی کلاس میں داخلہ لے لیا لیکن سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ وہ لکھتے وقت موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں؛ انھیں ستار، الغوزہ اور بانسری کی آوازوں اور سہگل کے ساتھ ساتھ میرا بائی کے بھجن پسند ہیں۔ وہ گیتا رائے، آشا بھوسلے، لتا منگیشتر اور نور جہاں کی گلوکاری کو پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح مغربی موسیقی میں وٹنی ہیوسٹن، مائیکل جیکسن کی بہن جینٹ جیکسن اور نئی سنسنی خیز آواز برٹنی سپئیرز کو پسند کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں انھیں کیبرے ڈانس دیکھنے کا بھی شوق رہا ہے۔ ان کا خیال ہے اگر رقص و نغمہ کے کچھ دروازے کھلے رکھے جائیں تو سوسائٹی جنسی جرائم سے نجات پا سکتی ہے۔

''میں ذاتی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ تھوڑی سی بینکی پنکی اچھے اخلاق کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح جسم کی قوتِ مدافعت کے لیے ویکسی نیشن۔ ضرورت سے زیادہ دباؤ، قدغنوں اور محرومیوں کے ردِعمل میں

معاشرے میں پُرتشدد رجحانات فروغ پاتے ہیں، کیا کبھی اس پر کسی نے غور کیا
کہ ہمارے مجرموں میں معقول تعداد باکردار لوگوں کی بھی ہوتی ہے، قتل مذہب
کے نام پر ہو یا غیرت کے نام پر، قتل قتل ہی ہوتا ہے۔" (ص ۱۳۳: ایضاً)

آخر کار سیالکوٹ سے سلیم اختر کے اہل خانہ؛ پکی ٹھٹھی، سمن آباد، لاہور منتقل ہوئے اور ایک نو تعمیر مکان کرائے پر لے لیا۔ مصنف کے روز و شب وہی تھے، رات دیر سے گھر لوٹنا اور ایک خاموش تنہا آدمی کی طرح کھانا کھانا اور سو جانا۔ اپنے گھر میں اجنبی، چوبیس پچیس برس کی عمر میں گھر اور شادی سے الرجک رزقِ حلال کی تنخواہ بے برکت ثابت ہو رہی تھی، وہ کسی حد تک گھر والوں کے لیے پیسے کمانے کا ایک اوزار تھا، لاتعلق اور اپنے ہی گھر میں Paying Guest۔ کچھ خوش فکرے دوستوں کے ساتھ انارکلی، بانو بازار اور ریلوے اسٹیشن کے چکر لگاتا رہتا، یہی تانک جھانک ان دنوں حاصلِ زندگی تھی۔

ستمبر ۱۹۵۷ء میں اُس نے سرٹیفکیٹ ان لائبریری سائنس کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ کلاس میں طلبا کی تعداد کم تھی اس لیے یہ ایک مختصر کنبے میں تبدیل ہو گئی۔ تین کلاس فیلوز نے سلیم اختر کو بھائی بنا لیا اور یہیں سلیم اختر نے اپنا دیرینہ مشغلہ یعنی مفت مشورہ کارپوریشن زیادہ شدومد سے آزمایا۔ کورس پورا ہوا تو ان کی تعیناتی پنجاب یونیورسٹی میں اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے ہوئی، کچھ عرصہ انہوں نے پنجاب پبلک لائبریری میں بھی خدمات انجام دیں، گویا ۱۹۵۸ء ان کے لیے بہار کا جھونکا ثابت ہوا۔ یہاں دو چیزیں وافر مقدار میں تھیں؛ لڑکیاں اور کتابیں۔ کچھ کو لطیفے سنائے، کچھ کے ہاتھ کی لکیریں پڑھیں، کچھ سے ہلکی پھلکی دوستی کی، طبیعت کی بے زاری کا درجہ کم ہوا، کتابوں کی رفاقت نے مردم بیزاری سے امکانات کو مزید کم کیا۔ یہیں ان کی ملاقات سید وقار عظیم سے ہوئی جو اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر تھے۔ الغرض کتابوں کی دنیا انہیں بہت راس آئی:۔

> "لائبریری کی ملازمت نے مجھے کتابوں کی عزت کرنا سکھایا میں نے ذاتی
> کتاب پر بھی نہ نام اور تاریخ لکھی اور نہ دستخط کیے نہ سطروں کو انڈر لائن کیا، نہ
> ریمارکس لکھے۔ مطالعہ اور استعمال کے باوجود بھی کتاب کنواری رہتی ہے۔"
>
> (ص ۱۴۵: ایضاً)

گویا کتاب کی تانیثیت سلیم اختر کے نفسیاتی ادراک سے جڑی ہوئی ہے۔ لائبریری ملازمت کے دوران وہ دوستوفسکی کی کتابوں سے متاثر ہوئے اس حد تک کہ اس کے کرداروں سے نفسی تطبیق ہو گئی اور انھیں اپنی ذہنی صحت پر شک ہونے لگا۔ اس اثنا میں ان کی ملاقات میرزا ادیب اور یونس جاوید سے

ہوئی۔ وہ لاہور آنے سے پہلے روزنامہ نوائے وقت، ہفت روزہ قندیل اور دیگر رسائل میں شائع ہوتے تھے اس لیے جاننے والوں کا ایک حلقہ سا بنتا چلا گیا۔ انھوں نے ٹی ہاؤس اور حلقہء ارباب ذوق جانا شروع کیا۔ گویا ادیبوں کا لاہور دریافت کرنے لگے۔ اس زمانے کے مشہور پبلشر عبدالغفور کے مکتبہ ناشرین پر اٹھنا بیٹھنا شروع کیا جہاں سوشلسٹ نظریات کے ادیبوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ ناشرین نے احمد ندیم قاسمی کی ''برگ حنا''، ڈاکٹر سید عبداللہ کی مقاماتِ اقبال اور فیض احمد فیض کی کتاب ''میزان'' شائع کی۔ میزان کے تنقیدی مقالات بہت مقبول ہوئے۔ اسی مکتبے پر سلیم اختر، حبیب جالب اور منصور قیصر سے ملے۔ یہیں عبدالغفور کی فرمائش پر مصنف نے آرنلڈ بینٹ کی مختصر کتاب "How to live on 24 hours a day" کا ''صبح کرنا شام'' کے نام سے ترجمہ کیا یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی اور یہی سلیم اختر کی پہلی کتاب ہے۔

۱۹۶۱ء نئے سلیم اختر کا نیا جنم ہے۔ فکرِ روزگار اور اپنی تنہائی سے برآمد ہوتا ہوا شخص، جو زندگی کی معنویت اور افادیت پر غور کرنے کا تجربہ کر رہا ہے۔ یعنی آسان الفاظ میں کامیاب زندگی کے روایتی ہنر آزمانے پر مائل ہے۔ اپنی پرانی سائیکل پر لاہور کی سڑکوں پر رواں دواں، رموزِ زندگی سے آگاہی حاصل کرتا، یونیورسٹی لائبریری اور ادبی محافل کے مابین سعی کرتا اور اپنے ہونے کا ثبوت دیتا ہوا سلیم اختر اب ایک کارآمد آدمی ہے۔

۱۹۵۸ء میں ایوب خان قوم کے نجات دہندہ کی شکل میں بنیادی جمہوریت کا نظام لایا۔ قصہ مختصر خارجہ پالیسی میں اشتراکی رنگ آمیزی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ادیبوں، صحافیوں اور دانش وروں کو رائٹرز گلڈ کا ہم نوا بنانے کی کوشش کی گئی جن کی بڑی تعداد متوسط رنچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور بڑے بڑے تصوراتی دعووں کے باوجود شدید احساس محرومی کا شکار تھی۔ قدرت اللہ شہاب کا بیوروکریٹک گروپ اور اس کی سرکاری مراعات بہت سے ادیبوں کے لیے چیلنج ثابت ہوئیں، اہلِ علم بتدریج درجہ بندی کا شکار ہوئے اور مراعات یافتہ طبقے کی روحانیت پیدل چلنے والے ادیبوں کے دل کا داغ بن گئی، ہر ادیب ولی کے درجے پر پہنچنے کی تیاری کرنے لگا، جو بچ گئے انہوں نے ملامتی ادب کی تخلیق کا راستہ اختیار کیا جو آگے چل کر مزاحمتی ادب میں تبدیل ہو گیا۔ اسی کشمکش کی اسیری میں سلیم اختر پر محبت کی دیوی مہربان ہوئی۔

> ''وہ اپنی خوبصورت آواز میں باتیں بھی بہت خوبصورت کرتی تھی۔ باتیں نہ تھیں ''آبِ حیات'' کے اسلوب میں تشبیہیں اور استعارے تھے۔''
>
> (ص ۱۵۰: ایضاً)

''اس بے چاری، میں کوئی خرابی نہ تھی، جوان تھی، خوبصورت تھی، خوش گفتار تھی، جذباتی تھی اور Impulse بھی ـــ دراصل خرابی مجھ میں تھی، میں لائف کمٹمنٹ نہ کر سکتا تھا۔ کمٹمنٹ مترادف ہے ذمہ داری کے جب کہ میرے اعصاب ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کی سکت ہی نہ رکھتے تھے اسی لیے میں نے کمزوری ہی کو اپنی طاقت میں تبدیل کر لیا۔'' (ص ۱۵۰: ایضاً)

''اب میں نے اس کے ساتھ بات بے بات الجھنا شروع کر دیا۔ اچھی خاصی گفتگو ہو رہی ہوتی مگر میں ''ایسا نکتہ'' پیدا کر دیتا کہ وہ گرمی کھا جاتی۔'' (ص ۱۵۱: ایضاً)

آخر راستے تبدیل ہوئے پشیمانی ڈپریشن میں تبدیل ہوئی۔ مہینوں ذہن پر بوجھ رہا اور مصنف خود جوزایت کے زیر اہتمام سوچتا رہا کہیں یہ تو نہیں کہ مادرانہ وابستگی اتنی قوی ہے کہ ہر لڑکی کے معاملے میں وہ مزاحم ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی گزشتہ زندگی میں ذمہ داری اور مالیاتی مدد کے شواہد تو ملتے ہیں لیکن ماں سے شدید محبت کے آثار نہیں البتہ یہ درست ہے کہ میکانکی انداز میں معمولاتِ زیست چلانے کے باعث وہ ایک خاص سطح کی بے وزنی اور عدم اعتماد کا شکار رہا۔

شخصی ٹکراؤ اور اضطراب سے ایک نیا راستہ کھلا یہ حنیف رامے کا ہفت روزہ ''نصرت'' تھا۔ سلیم اختر نے اپنا پہلا نفسیاتی مضمون ''شرم یا اک ادائے ناز'' اسی پرچے کے لیے لکھا اور پھر اس پرچے کے جنسی مضمون ۱۹۶۴ء میں ''عورت جنس اور جذبات'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے، پہلی طبع زاد کتاب ایک لحاظ سے سلیم اختر کی پہچان بن گئی، یہ اب بھی چھپ اور فروخت ہو رہی ہے۔

آوارہ گردی، ہوٹلنگ، فلرٹیشن اور دیگر کھیل تماشوں سے بھی بے معنویت کے سوا کچھ برآمد نہ ہوا۔ البتہ کتاب کی رفاقت نے سلیم اختر کو مستقبل بینی کا سبق دیا اس نے ایم اے اُردو کا امتحان دینے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۶۱ء میں سیکنڈ ڈویژن میں امتحان پاس کر لیا۔ اسی اثنا میں سعیدہ اس کی زندگی میں داخل ہوئی، پہلی محبت کے اچانک لیکن سوچے سمجھے فیصلے کے بعد وہ اپنی زندگی کی جمع بندی پر غور کرنے لگا۔ گھریلو اڑچنوں کے بعد آخر کار یہ بیل منڈھے چڑھی۔ دسمبر ۱۹۶۱ء میں سلیم اختر کو ایمرسن کالج ملتان میں تقرری کا اپائنٹمنٹ لیٹر ملا۔ ۱۹۶۱ء سے یکم اپریل ۱۹۶۲ء تک سعیدہ کی محبت اور اہل خانہ کی کشمکش کا سلسلہ چلتا رہا، آخر کار یکم اپریل شادی کی تاریخ طے پائی گویا زندگی کے سب مراحل آسان ہوئے۔

جس طرح لاہور میں گورنمنٹ کالج کی اہمیت تھی اسی طرح ملتان میں ایمرسن کالج کو مرکزی حیثیت

حاصل رہی۔ ۵ جنوری ۱۹۶۲ء کو بطور اُردو لیکچرار کالج میں جائننگ رپورٹ دی اور فروری ۱۹۷۰ء تک تقریباً آٹھ برس ملتان میں رہے۔

چھٹی دہائی کا ملتان ادبی لحاظ سے بڑا زرخیز تھا۔ عرش صدیقی، جابر علی سید، مسعود اشعر، ابنِ حنیف، اسلم انصاری، فرخ درانی، ارشد ملتانی، مقصود زاہدی، انوار انجم، عاصی کرنالی، اے بی اشرف، ساغر صدیقی، شمیم حیدر ترمذی، لطیف الزماں، انور ادیب، خلیل صدیقی، اے ڈی نسیم اور پھر شاگردی کا دم بھرنے کے لیے طاہر تونسوی، انوار احمد، صلاح الدین حیدر، اصغر ندیم سید، یحییٰ امجد، محسن نقوی، رؤف شیخ، ضیغم چوہدری، ایم ڈی کنور اور فخر بلوچ موجود تھے۔ ان کے علاوہ فیاض تحسین، خالد شیرازی، عبدالرشید، نوشابہ نرگس، روبینہ ترین بھی اسی فہرست میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے سلیم اختر ملتان نہ جاتے تو شاید ان کا ذہنی اور فطری ارتقا ادھورا رہتا، ملتانی احباب نے سلیم اختر کے تعارف میں لکھا ہے:

"گہواں رنگ، آنکھیں چھوٹی جن میں سفید زیادہ سیاہی کم بجھی بجھی، سر پر خوبصورت بال، درمیان میں مانگ، چہرہ لمبوترا، ناک لانبی، دہانہ کسی قدر چوڑا، دانت بالکل سفید، نہ پان نہ سگریٹ، سوٹ بہت اچھا نہ بُرا، جوتا براؤن، ہاتھ میں حاضری کا رجسٹر اور ایک چرمی بیگ، دراز قد، تیر کی طرح سیدھا، ناک پر عینک جمائے۔۔ یہ ہیں سلیم صاحب"

(ص ۴۶، سخنور لطیف الزماں ڈاکٹر سلیم اختر، شخصیت و تخلیقی شخصیت: ہم سفر بگولوں کا مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی، لاہور، ۱۹۵۸ء)

"سلیم اختر اپنی نجی زندگی میں کافی شرمیلے ہیں، کم گو ہیں اور بڑی حد تک آدم بیزار۔۔ سلیم اختر جس تیزی سے لکھتے اور پڑھتے ہیں اسی تیز رفتاری سے سڑک پر چلتے ہیں اپنی لمبی لمبی ٹانگوں کو ایک خاص انداز میں جھٹکا دے کر جب چلتے ہیں تو لگتا ہے دوڑ لگانے والے ہیں۔"

(ص ۲۶، بکری دودھ اور۔۔ مسعود اشعر ڈاکٹر سلیم اختر۔۔۔۔: ایضاً)

اسی طرح ان کا ایک اور دوست لکھتا ہے:۔

"محنتی آدمی ہے، رزقِ حلال کماتا ہے، قلم اور علم ذریعہء معاش ہے، مسلسل کام

کرتا ہے، چوبیس گھنٹوں میں سے بیس گھنٹے مصروف رہتا ہے، دن کو کالج، شام کو ٹیوشن، ادبی محفلوں میں مضامین، ادبی حلقوں کی صدارت، کتابوں کی رونمائی، ٹی وی ریڈیو کے مباحثے، دیباچے، تقریظیں۔" (ص ۳۷، رحیم گل اُستادوں کا اُستاد: ایضاً)

"سلیم اختر ایک شرمیلے آدمی ہیں بہت کم (نجی محفلوں) کے علاوہ کھلتے ہیں۔ عزت نفس کا پاس رکھتے ہیں، غیور ہیں اور خود دار صاحب حمیت آدمی ہیں یہاں تک کہ قہقہہ مار کر ہنستے بھی نہیں۔ بہت دھیرے دھیرے مہین مہین سی مسکراہٹ لبوں پر نمودار ہوتی ہے اور اکثر خندہ زیر لب تک پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے۔" (ص ۴۴، پراگندہ لوگ۔ آغا سہیل: ایضاً)

یہ تیس سے چالیس سالہ سلیم اختر کا سراپا ہے جسے ملتانی مٹی اور ملتانی دوستوں نے جلا بخشی ہے۔ یہ آٹھ نو برس سلیم اختر نے ان لوگوں کے ہمراہ بسر کیے ہیں جو کسی نہ کسی طرح مہاجرت یا ریاستی دباؤ کا ذائقہ چکھے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ خاندانی وضع داری اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلق نبھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مروت، تواضع، درگزر، محبت کی رومانویت، تخیل پسندی، اخلاقیات کی حد بندی، اندر ہی اندر مزاحمت اور انکار کی دھیمی آنچ پر چڑھی ہنڈیا، تحفظ ذات، مہارت اور ادراک، سراسیمگی اور چراغ سے چراغ جلانے کی نکوکاری، یہ ہیں وہ اوصاف جو ایک محدود معاشرے میں آڑھی ترچھی لکیروں کی طرح بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ اپنی ذات میں بظاہر مگن رہنے والے لیکن اردگرد کے تمام واقعات وحالات وحادثات کی خبر رکھنے والے سلیم اختر نے زندگی کے کاروبار میں کوئی بڑا نقصان نہیں اٹھایا اور اس طرح وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کا ایک معقول حلقہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں گویا فرائیڈ کے نقطہ نظر کے عین مطابق اس نے زندگی کے ہر شعبے میں بنیادی آسودگی کے ساتھ ساتھ متبادل آسودگی Substitute-Gratification کا اہتمام بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اس طرح فنکارانہ سطح پر اس کا اعصابی خلل اپنے الجھاؤ اور ضبط سمیت جس تحفظ کا متقاضی تھا، اس نے اس کا بھی بھرپور انتظام رکھا۔

یاس انگیز طبیعت اور تنہائی کی ہم نشینی کے باوجود، سلیم اختر اپنے اندر گھر اور گھر والی کی مکمل گنجائش رکھتے تھے چنانچہ سعیدہ نے ان دونوں خواہشات کی تکمیل میں سلیم اختر کو خود کفیل رکھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے تینوں بچے ملتان ہی میں پیدا ہوئے۔ نفسیات، تنقید اور تحقیق کے شعبوں میں کامیابی کی طرح تینوں بچوں نے بھی سلیم اختر کے طفیل کامیاب زندگی کے زینے پر قدم رکھا:

''میری شہرت کا آغاز ملتان ہی کے زمانے سے ہوتا ہے۔ اب تک جو کچھ پڑھا یا لکھا اس میں شعوری منصوبہ بندی کا دخل نہ تھا مگر اب میں نے منصوبہ بندی کے تحت مطالعہ شروع کیا اور نفسیات، تنقید اور فکشن پر بہت کچھ پڑھ ڈالا، ساتھ ہی ساتھ اساطیر اور علم الانسان کا مطالعہ بھی کرتا رہا، ان دنوں میں ''ٹائم'' میگزین خریدتا تھا، میں نے ''ٹائم'' کے مندرجات کا موضوعاتی اشاریہ بنا رکھا تھا، مجھے نواں شہر یا ملتان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی میرے سامنے آسماں اور بھی تھے۔ چنانچہ ملتان کا سلیم، سیپ، ادب لطیف، نصرت، نقوش، فنون، اوراق، ماہِ نو، شب خون جیسے پرچوں میں چھپ رہا تھا۔'' (ص ۱۹۰: از نشانِ جگر سوختہ)

یقیناً یہ خودستائی نہیں تھی، مضافات کے اہل قلم کی طرح واویلا کرنے اور مواقع نہ ملنے کی شکایت کرنے کی بجائے مصنف نے محنت کا راستہ چنا۔ ''عورت، جنس اور جذبات''، ''نگاہ اور نقطے''، ''باغ و بہار کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ (مرتبہ) ملتان کے زمانے میں شائع ہوئیں اور ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کا ڈول بھی اسی زمانے میں ڈالا گیا جو نیشنل بک کونسل کے مجلّہ ''کتاب'' میں بالاقساط چھپنی شروع ہوئی۔

دوسری جانب سعیدہ کی رفاقت میں گھریلو زندگی بھی آسودگی کے راستے پر رواں تھی:

''اکیلے گھر میں رہنے کی وجہ سے، اس کی، ان کرداری خصوصیات نے جلا پائی، جو شاید سسرال میں نمایاں نہ ہوسکتیں وہ سکول کی ملازمت سے تھک ہار کر سونہ جاتی بلکہ رات گئے تک کام میں مصروف رہتی۔ احساسِ ذمہ داری، فرض شناسی، بلا جھجک منہ پر کلمہءِ حق کہنے کی جرات، خود اعتمادی، دوسروں کے حقوق کی پاسداری، مہمان نوازی، پہل قدمی کی صلاحیت، بات کو منوانے کا خاص اسلوب، فیاضیءِ طبع، کھلے دل سے دوسروں کی مدد کر کے خوشی حاصل کرنا اور سب پہ مستزاد، حسِ مزاح پر مبنی خوش مزاجی، جس سے بالعموم عورتیں اور بالخصوص بیویوں کی اکثریت عاری ملتی ہے، الغرض انگریزی ضرب المثل کے مطابق ''ہم وزن سونے میں تولے جانے کے قابل'' شادی کے وقت صرف ایف اے سی ٹی تھی۔ اس نے سوچا کہیں میرے ایم اے شوہر کو ایف اے کی وجہ سے کسی طرح

کا احساسِ کمتری نہ ہو، چنانچہ ملازمت، گھر، بچوں اور میری ذمہ داری کے ساتھ ساتھ بی اے، بی ایڈ، ایم اے اُردو اور ایم ایڈ کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے بارے میں اس کے رویے میں تبدیلی پیدا ہوتی چلی گئی۔ آپا جی کے انتقال کے بعد، بیوی کی جگہ ماں سے مشابہہ رویہ نمایاں ہوتا چلا گیا۔ اس کا اظہار چھوٹی چھوٹی اور بظاہر غیر اہم باتوں سے ہوا: مثلاً ہم سڑک کراس کرنے لگتے ہیں تو وہ غیر شعوری طور پر کسی بچے کے مانند میرا ہاتھ تھام کر مجھے سڑک پار کراتی ہے، تحفظ اور عافیت کا احساس پیدا کرنے کو جب مجھے احساس ہوا تو میں نے اس کے خلاف خاصی مزاحمت کی۔ ظاہر ہے یہ مزاحمت شعوری سطح پر نہ ہو سکتی تھی۔ وہ خود کیونکہ یہ دکھاوے کے لیے نہ کر رہی تھی، اس لیے اسے خود بھی بدلتے ہوئے رویے کا احساس نہ تھا، بالآخر میں نے خود کو اس پر چھوڑ دیا۔''

(ص ۱۹۵،۱۹۴،۱۹۳، از نشانِ جگر سوختہ)

ملتان کے قیام کے دوران میں سلیم اختر کو خوابوں کی چھان پھٹک، تجزیہ و تحلیل اور تشریح و تفہیم سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بچپن کی سنی سنائی کہانیوں کی بدروحیں، جانور اور جن بھوت خوفناک خوابوں میں تحلیل ہو کر ان کی نیندوں میں زہر گھولنے لگے، اگرچہ وہ خوابوں کی علامات اور ناآسودہ خواہشات کے تعلق سے بخوبی واقف تھے لیکن ان خوابوں کی عقوبت اور کفارے کی صورت نظر نہ آتی۔ بظاہر وہ سمجھتے کہ ان کا اکلوتا گناہ پسند کی شادی تھا اور انہیں اس کی سزا مل رہی ہے۔ سلیم اختر کی اس خود جوازیت پر کسی اور مقام پر روشنی ڈالی جائے گی تاہم نائٹ میئرز نے ڈاکٹر سلیم اختر کو بیمار کر دیا، وہ چیخ مار کر بیدار ہوتا تو جسم ٹھنڈے پسینے سے بھیگا ہوتا، حلق خشک، آنکھیں پھٹی، سانس سینے میں دبی، کبھی کپکپی، کبھی بخار کی کیفیت اور پھر شب بیداری، بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

''میرے کئی افسانوں میں نائٹ میئرز ملتے ہیں۔ یہ من گھڑت نہیں بلکہ میرے اپنے اور حقیقی نائٹ میئرز ہیں۔ اسی طرح نائٹ میئرز کے ردعمل میں، میں نے کرداروں کی جو نفسی تصویر کشی کی، وہ ذاتی واردات ہیں، یوں میں کہہ سکتا ہوں کہ ان نائٹ میئرز نے تخلیقی ترفع کا کام کیا۔'' (ص ۱۹۸: از نشانِ جگر سوختہ)

''نگاہ اور نکتے'' کے بارہ مقالات میں سے بیشتر اسی تخلیقی ترفع کا نتیجہ ہیں۔ اس تخلیقی ترفع کو سلیم اختر

نے بڑی احتیاط اور منصوبہ بندی کے ساتھ سینت سینت کر رکھا ہے اور اپنے حسابی دماغ کی مدد سے اس مقام پر فائز ہوئے جہاں فسادِ خلق کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جڑوں میں رہنے کی کوشش کرتے ہوئے اندر ہی اندر آکاس بیل کی طرح پھیلتے چلے گئے ہیں۔ الفتِ ذات مریضانہ نہ ہو تو اظہار کے لیے ایسا فنکارانہ اور خلاقانہ انداز اختیار کرتی ہے کہ ذات کی تمام جہتیں نمایاں ہو کر سامنے آنے لگتی ہیں۔ ادبی تخلیق کی وضاحت کرتے ہوئے ہم غور کرتے ہیں کہ کس مخصوص ذہنی کیفیت نے خاص نوع کی تخلیق جنم دی۔ کیا ڈاکٹر سلیم اختر ذہنی اختلال میں مبتلا تھا یا اعصابی الجھنوں کا شکار؟ ادبی روایات اور اساطیر کا پے در پے ایک دوسرے کے تعاقب میں نکلنا، سلیم اختر اور تحریر دونوں کی علیحدہ علیحدہ تحلیل نفسی کا متقاضی ہے۔

فرائیڈ، یونگ، ایڈلر سے متاثر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ، سلیم اختر ترقی پسندوں کے لیے بھی نرم گوشہ رکھنے لگے، بلکہ احتشام حسین، عزیز احمد اور آل احمد سرور کے تنقیدی نظریات سے متاثر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد بھی انہیں پسند ہیں۔ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت اور احمد ندیم قاسمی ان کے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں، تاہم سلیم احمد کے ذاتی نظریات میں مزید ارتقا ملتان سے لاہور واپسی اور لاہور کے طویل قیام کا متقاضی ہے۔

فروری ۱۹۷۰ء میں وہ ملتان سے گورنمنٹ ڈگری کالج وحدت روڈ تبدیل ہو کر آئے۔ ۱۹۶۹ء میں سعیدہ پہلے ہی تبدیل ہو کر لاہور آ چکی تھیں۔ ان دنوں میرزا ادیب کی کوٹھی ''لالہ صحرا'' کی انیکسی زیر تعمیر تھی، میرزا ادیب سے خوشگوار تعلقات کے باعث تینوں بچے اور سعیدہ اسی انیکسی میں منتقل ہوئے۔ ایک سال کے بعد وہ سعیدہ کی خالہ کے ساتھ ٹمپل روڈ پر ان کے فلیٹ (3/22) میں منتقل ہو گئے، جہاں قرب و جوار میں ان کی بیوی کے دیگر رشتہ دار آباد تھے۔ سعیدہ کی کزن لاہور کالج میں پروفیسر تھیں۔ چوہدری بشیر احمد ریڈیو پاکستان کے منیجر تھے اور ان کی اہلیہ سعیدہ کی کزن مسز نور جہان بشیر اپنے زمانے کی مشہور ہیڈ مسٹرس، ٹیلی ویژن کے مشہور پروڈیوسر اور جنرل منیجر فرخ بشیر کی والدہ تھیں۔ سلیم اختر بھی لاہور کی برق رفتاری کی زد میں آئے، سائیکل بیچا اور سکوٹر خرید لیا لیکن یہ سواری زیادہ دیر نہ چل سکی اور پھر سائیکل پر آ گئے۔ بقول سلیم اختر:

> ''اب میں کار پر جا رہا ہوتا ہوں تو حیرت سے سوچتا ہوں کہ میں نے اتنی سائیکلنگ کیسے کر لی؟ یہ لمبے راستے کیوں کر طے کیے؟۔ دراصل میں فاصلوں کی ریاضی سے نہ چلتا بلکہ وقت کے حساب سے سفر کرتا۔ ذہن میں ہر وقت خیالات کی کھچڑی ابلتی رہتی، جس کے نتیجے میں، میں باطن میں گم جبکہ خودکار

طریقے پر سائیکل رواں رہتی۔ چنانچہ یہ بھی ہوتا کہ غائب دماغی کے باعث غلط موڑ مڑ گیا، بغیر ہاتھ دکھائے موڑ کاٹ لیا، سڑک پر اپنی لین سے باہر نکل جاتا۔ جب یہ سب تو پھر گرنا بھی لازم، مگر اطمینان سے اٹھ کر کپڑے جھاڑتا اور پھر بادِ بہاری پر سوار ہو جاتا۔'' (ص ۲۰۶، ۲۰۵: از نشانِ جگر سوختہ)

منو بھائی نے اپنے ایک کالم میں ان کی سائیکل سواری کے گن گائے تو لاہور کے مشہور سائیکل سوار ادیبوں: ڈاکٹر نذیر احمد، مبارک احمد اور سلیم احمد میں سے تیسرے انعام کے طور پر نئی سائیکل کا تحفہ، صدر ضیاء الحق نے سلیم اختر کو دیا۔ ۱۹۷۲ء میں سلیم اختر گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے۔ آفتاب اپنے نصف النہار پر تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی عمر اس وقت اڑتیس برس تھی، وہ اپنی مردانہ اور زنانہ دوستیوں سے ماورا ہو کر اپنی بیوی کے ہاتھ پر بیعت کر چکا تھا۔ بچوں کی موجودگی اور ان کی مالیاتی ذمہ داری اٹھانے میں اس کی بیوی برابر کی شریک تھی، جو اس وقت کوئین میری کالج میں اُردو اور فارسی کی کلاسیں پڑھا رہی تھی۔ گورنمنٹ کالج میں اس کی نفسیاتی تسکین کے لیے ڈاکٹر اجمل موجود تھے، جو تحلیلی نفسیات کے حوالے سے ایک معتبر نام تھے۔ سلیم اختر ایک باعمل، لائق، مستعد اور مقبول اُستاد ثابت ہوئے۔ چالیس سالہ تدریسی زندگی میں بے شمار ایسے طالب علم ملے جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ انہوں نے طالب علموں کی کردار سازی میں بڑا کردار ادا کیا۔ خاص طور پر خواتین طالبات انہیں قابل بھروسہ اُستاد سمجھتی رہیں، ملازمت کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ لاہور میں انھیں دوستوں نے کیسا پایا، اس ضمن میں عطاء الحق قاسمی کے الفاظ دیکھیے:

''پچاس کا سن اور اس کے باوجود سر پر بال موجود، چاہے گن کر پورے کر لیں۔ سانولا رنگ، کتابی چہرہ، چہرے پر عینک جو انھیں متکلف بنانے کی بجائے ان کی شخصیت کو مزید باوقار بناتی ہے۔ دورانِ گفتگو کھلکھلا کر ہنستے ہیں اور اچھے لگتے ہیں، کالج یا تقریبات میں جاتے وقت گرمیوں میں پینٹ بوشرٹ اور سردیوں میں سوٹ میں ملبوس ہوتے ہیں، جبکہ گھر میں اور علامہ اقبال ٹاؤن کے جہاں زیب بلاک میں ہوائی چپل، دھاری دار پاجامہ اور تنگ چولی جیسی ایک قمیض پہن کر پھرتے ہیں۔ نیلے رنگ کا دھاری دار پاجامہ گویا ان کا ''ٹریڈ مارک'' بن گیا ہے۔ قمیض کا رنگ بدلتا رہتا ہے مگر پاجامہ وہی رہتا ہے۔۔ ایسا

لگتا ہے اب سیون اپ والے یہ کپڑا صرف سلیم اختر کی سرپرستی کی وجہ سے بناتے ہیں اور غالباً یہ خاصا قیمتی کپڑا ہے کیونکہ میں نے کئی ماڈرن گھرانوں کے ڈرائنگ روم میں اس ڈیزائن کے کپڑے کو بطور ڈیکوریشن پیس دیواروں پر چسپاں دیکھا ہے۔'' (ص ۶۵،۶۴ پاجامہ، عینک اور قلم از عطاء الحق قاسمی: ہم سفر بگولوں کا مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی)

سلیم اختر کے دوسرے ہمسائے مشکور حسین یاد لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر سلیم اختر سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی، جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اُردو میں آئے۔ پہلی ملاقات میں مجھے ڈاکٹر صاحب کی ذات میں اس عاشق کا دُور دُور نام ونشاں نظر نہ آیا جس کا تذکرہ عام تھا۔ یہ شخص تو ہم ایسا عام انسان نکلا بلکہ ایک اعتبار سے ہم سے بھی گیا گزرا کہ ہم تو روزانہ کی بول چال میں ایک ادھم سا مچائے رکھتے تھے اور ڈاکٹر سلیم اختر ہے کہ خاموشی سے آیا اور خاموشی سے چلا گیا، کسی نے کوئی بات پوچھی تو جواب دے دیا ورنہ بلاوجہ ایک لفظ بھی زبان سے باہر آئے تو قسم ہے۔ بیگم سلیم اختر سے دورانِ گفتگو معلوم ہوا کہ اول تو ڈاکٹر صاحب گھر والوں سے ناراض نہیں ہوتے لیکن جب انھیں غصہ آتا ہے تو پھر بُری طرح آتا ہے۔ اگلی پچھلی رہی سہی سب کسر نکل جاتی ہے۔ دراصل صلح کل اور صلح جُو شخص شریف تو ہوتا ہے لیکن کمزور نہیں ہوتا۔'' (ص ۶۹، ۶۷ مردِ کم گو بسیار توفیق۔ مشکور حسین یاد: ذوقِ سلیم، مرتبہ جاوید اقبال ندیم، لاہور، ۲۰۰۲ء)

اسی دوست نوازی کے بارے میں عطاء الحق قاسمی نے لکھا ہے:

''وہ دوستوں کو ان کی خامیوں سمیت قبول کرتے ہیں، بلکہ میرے جیسے دوستوں کی موجودگی میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ خامیوں کو دوستوں سمیت قبول کرتے ہیں۔ ان کی دوستی کا صرف ایک معیار ہے کہ ''مدِ مقابل'' پُر خلوص ہونا چاہیے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ذاتی دوستی میں نظریات کو بھی آڑے نہیں آنے دیتے اور یوں

احمد ندیم قاسمی سے لے کر ڈاکٹر وحید قریشی تک ان کے دوستوں: یا یوں کہہ لیں کہ بزرگ دوستوں میں شامل ہیں۔ البتہ انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی صورت میں اپنا ایک دشمن ڈھونڈ نکالا اور یہاں بھی ان کے انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے کہ دشمن ایسا ڈھونڈا کہ جس کی مخالفت اور جس سے مخالفت بہر حال معنی رکھتی ہے ورنہ یار لوگ تو اتنے ''ککھ'' قسم کے دشمن پالتے ہیں کہ اس سے بہتر ہے کہ آدمی بغیر دشمن کے زندگی گزار دے۔ سو ڈاکٹر سلیم اختر نے ڈاکٹر وزیر آغا سے دشمنی بھی کیا وضع داری سے نبھائی ہے۔ مجال ہے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش آئی ہو اور یوں ہمارے نزدیک ان کی ادھوری شخصیت مکمل ہو گئی ہے۔''

(ص ۶۳۔۶۲ پاجامہ، عینک اور قلم: ہم سفر بگولوں کا)

ڈاکٹر اجمل نیازی نے سلیم اختر کی شخصیت اور تحریر کی رفتار میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

''ڈاکٹر طاہر تونسوی نے کتاب کا نام ''ہمسفر بگولوں کا'' رکھا ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ سلیم اختر صاحب چمکدار رنرمیلی اور پُرسکون ریت پر چلنے والے لوگوں کے گروہ کا آدمی ہے۔ ریت پر چلنے میں آواز نہیں ہوتی اور قدموں کی چاپ سے بھی کوئی چونکتا نہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اونٹ کی چال چلتا ہے۔ اونٹوں کے قدموں سے تو سڑکوں پر بھی آہٹ نہیں ہوتی۔ ایک اور بات کہ صحراؤں میں اونٹ سے زیادہ تیز رفتار اور صاحب استقامت اور کوئی مخلوق نہیں، یہ بہت صبر شکر سے منزلوں پر منزلیں مارتا چلا جاتا ہے۔ ایک دفعہ پانی پی لیتا ہے تو ہفتوں تک پیاس کا اظہار تک نہیں کرتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو اونٹ کی ان صفات اور خصوصیات کی روشنی میں بہت بامعنی انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔'' (۴۸۸۔۴۸۷: ہم سفر بگولوں کا)

ڈاکٹر سلیم اختر نے جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن کو جب سے اپنا مسکن بنایا، اسے اپنے لیے ''معنا فات'' میں تبدیل کر لیا اور طبعاً غیر سوشل، مردم بیزار آدمی کی طرح گھر کی دوسری منزل میں کتابوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئے اور وہ تمام دائمی بیماریاں، جو عموماً لوگوں کے ساتھ ہوتی ہیں ان کے ساتھ سمجھوتا کر لیا۔

''اگر کچھ عرصہ مزید گزارا گیا تو اس چہرے کی رونق وقت نے چھین لینی ہے۔ تب آنکھوں کے گرد وقت کے پرندے کے پنجوں کے نشانات ثبت ہوجائیں گے۔ گال اندر کو دھنس جائیں گے، ہڈیاں ابھر آئیں گی، تو چہرے پر ناک مزید نمایاں ہوجائے گی۔ ناک؟ ناک بھی نقاد کی؟ یعنی بے حد خطرناک۔ ادب کی خاطر میں نے ذاتی آرام اور شخصی خوشیاں لے کر ایک طرح کا سنیاس لے کر راہبانہ طرز زیست اپنائے رکھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا میں ہندو سادھوؤں کی مانند تن شجر پر جبر کرتا ہوں، لیکن تکلیف کے بجائے اس سے توانائی حاصل ہوتی ہے۔ ایسی توانائی جو کمزور اعصاب کے باوجود قلم کے لیے تحریک کا باعث ہے۔'' (ص ۲۲۰: نشانِ جگر سوختہ)

اس راہبانہ زندگی میں کچھ تکیے ایسے بھی تھے جو سلیم اختر کے لیے زیارت گاہوں میں تبدیل ہوئے۔ لاہور آتے ہی ان کا تعارف نیاز احمد سے ہوا، اجن کی لوہاری کے باہر ایک مختصر دکان تھی لیکن دُور اندیش آدمی تھے ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۱ء میں انہوں نے شائع کیا۔ آہستہ آہستہ نیاز صاحب سے تعلقات پختہ دوستی میں تبدیل ہوئے تیس چالیس برس گزر جانے کے باوجود یہ دوستی اور اشاعتی سلسلہ اب بھی جاری ہے اب نیاز احمد کا انتقال ہو چکا ہے جو سنگ میل پبلی کیشنز، لوئر مال کے نام سے پہچانے جاتے تھے، بقول سلیم اختر:۔

''سنگِ میل کے مصنفین اعتراف کریں یا نہ کریں، مگر میں اس اعتراف میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا ہے کہ جب مجھے پیسوں کی ضرورت پڑی نیاز صاحب سے لے لیتا ہوں جو بعد میں کتابوں کی رائلٹی میں منہا ہو جاتا ہے۔''

(ص ۲۲۶: نشانِ جگر سوختہ)

جناب احمد ندیم قاسمی کا فنون اور اُن کی شخصیت سلیم اختر کے لیے ایک سرمایہ ہے، قاسمی صاحب کی دلنواز شخصیت، محبت اور شخصی وجاہت کے وہ مداح ہیں:

''احمد ندیم قاسمی اس جزیرہ کی مانند ہے کہ جسے جتنا explore کریں، اس میں نئے نئے منطقے، خطے اور مقامات ملتے جاتے ہیں۔ شاعری، افسانہ نگاری، صحافت، کالم نگاری، ادارت، علمی ادارہ کی سربراہی اور ان پر مستزاد شخصی

وجاہت، انسان دوستی اور شگفتگی، فرد میں اتنی خوبیاں ہوں اور اس کا دماغ خراب نہ ہو تو بذات خود یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔" (ص ۲۲۸: نشانِ جگر سوختہ)

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی سوانح میں جن لوگوں سے محبت کا اور دوستی و احترام کا دعویٰ کیا ہے ان کی فہرست میں خاص و عام بہت سے نام ہیں۔ البتہ خصوصی تذکرے میں ڈاکٹر وحید قریشی، یوسف کامران، کشور ناہید، عطاء الحق قاسمی، قتیل شفائی، امجد اسلام امجد، وحید الحسن ہاشمی، شبنم شکیل، ڈاکٹر محمدیہ سلطانہ بخش، شاہین مفتی، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، مستنصر حسین تارڑ، منیر نیازی، مشکور حسین یاد، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، منو بھائی، ناصر کاظمی، شہزاد احمد، نسیم درانی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور مشفق خواجہ کے نام شامل ہیں۔ اپنے شاگردوں میں وہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کو بہت پسند کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر ۱۰ مارچ ۱۹۹۶ء کو بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج سے ریٹائر ہوئے۔ اگست ۲۰۰۵ء تک یہیں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے پڑھاتے رہے اور پھر یونیورسٹی آف ایجوکیشن میں بطور وزیٹنگ پروفیسر تدریس کا آغاز کیا۔ ایم۔ اے اور ایم فل کو تحقیق، تنقید اور لسانیات کی تعلیم دیتے رہے۔ خرابیِ صحت کے باعث ۲۰۰۷ء میں تدریس کو خیر باد کہا، ان دنوں خانہ نشیں ہیں۔ ستر برس کے شخص کا سراپا انھوں نے اپنے لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے:

> "آئینہ جو چہرہ دکھا رہا ہے اس میں سر کی سوکھی کھیتی میں کپاس ہی کپاس نظر آ رہی ہے۔ وہ پتلے پتلے ہونٹ جو کبھی ترشے لگتے تھے اب خشک چشمے کے سوکھے کناروں جیسے ہیں۔ دو شیشوں والی عینک میں نظر آنے والی آنکھیں جو تتلی کی مانند روپ کے پھولوں پر منڈلاتی تھیں اب بے حد چھوٹی اور ادراکِ حسن سے عاری ہونے کی وجہ سے خاصی اجاڑ نظر آتی ہیں۔ کتاب کا رسیا کتابی چہرہ لمبائی کی طرف مائل ہے، گالوں پر دو لکیریں نمودار ہو چکی ہیں، بال پیچھے ہٹے تو مزید نمودار ہونے والے ماتھے پر مزید لکیریں نمایاں ہوئیں، جن کا باعث تفکر نہیں تفکرات ہیں، خارج کی یہ نشانیاں بدن میں بعض دائمی عوارض کا موجب بنیں جیسے: فشارِ خون، گھٹیا اور معدہ کے امراض۔" (ص ۱۹: نشانِ جگر سوختہ)

اپنے ہی آئینے میں اپنے چہرے کو مختلف زاویے سے دیکھنے والے سلیم اختر کی شخصی اور علمی زندگی میں بڑی تبدیلی اگرچہ گورنمنٹ کالج اور اس کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اجمل کی نگاہِ انتخاب لائی تھی۔ "نگاہ اور نقطے" میں شامل سلیم اختر کا پہلا مضمون "زیوس سے امیر حمزہ تک"، جہاں تاریخی اور تصوراتی سفر کی علامتوں کا

احوال تھا، وہیں سلیم اختر کی کرداروں کے اکھاڑ پچھاڑ کی مشق سماجی نفسیات اور ثقافتی عوامل تلاش کرنے کی صلاحیت کو توانائی عطا کرنے میں مددگار ثابت ہوئی تھی۔ تنقید اور اجتماعی لاشعور کے مباحث تک پہنچنے کے لیے ڈاکٹر محمد اجمل، سجاد باقر رضوی اور ابنِ فرید کی صحبت رنگ لائی۔ ژونگ کے وضع کردہ نظریات کی روشنی میں ان کی تحلیل و تفہیم کی آرزو تخلیق، تخلیق کار، تخلیقی عمل، تخلیقی عمل کی تفہیم کی گرہیں کھولتی چلی گئی۔ ۱۹۷۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انھوں نے ''اُردو تنقید کا نفسیاتی دبستان'' کے عنوان کے زیرِ اہتمام اپنا مقالہ تحریر کیا، جس کے نگران ڈاکٹر وحید قریشی تھے اور جسے ازاں بعد نفسیاتی تنقید کے نام سے شائع کیا۔ یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے شخصی اور تخلیقی سفر میں اس مقالے کی خاص اہمیت ہے اور ان کی تحریروں کے بہت سے دائرے انھی تصورات کے مرکز کے گرد گھومتے ہیں۔ لطف کی بات ہے کہ وہ وزیر آغا جن کے گروہی احباب سے سلیم اختر کی ٹھنی رہی ان کے نفسیاتی شعور کے مداح رہے ہیں:

''پروفیسر سلیم اختر نفسیات کے طالب علم ہیں مگر انہوں نے ذہنی عوارض کے محرکات کو نفسیات کے آزاد تلازمہ خیال یا خوابوں کے تجزیے کی مدد سے منظر عام پر لانے کے خالص طبیبانہ رویے کی بجائے تخلیق میں مضمر بعض علامات اور لفظ و خیال کے بعض لطیف پیکروں کے مطالعہ سے، خود تخلیق کار کی شخصیت کے مخفی تار و پود کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے اس اقدام میں سلیم اختر صاحب نے تخلیق کار کی شخصیت کے سماجی رخ سے کہیں زیادہ اس کے باطنی رخ سے سروکار رکھا ہے۔ یوں لگتا ہے ان کے پیشِ نظر یہ کام ہرگز نہیں تھا کہ وہ تخلیق کے حکیمانہ تجزیے سے معلوم کریں کہ تخلیق کار کس قسم کے عوارض میں مبتلا ہے بلکہ انہوں نے تخلیق کے تجزیے سے تخلیق کار کے تخلیقی باطن کو منکشف کرنے کی سعی کی ہے جو ادبی تنقید کے سلسلے میں مستحسن ہے۔''

(دیباچہ ادب اور لاشعور سلیم اختر از ڈاکٹر وزیر آغا مطبوعہ مکتبہء عالیہ لاہور ۱۹۷۶ء)

ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقیدی اور تخلیقی شخصیت میں اسی تلازمہء خیال اور تصوراتی تجزیے سے مدد لیتے ہوئے، مصنف کے نظریہ تحریر تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا تنقیدی نظریہ

سلیم اختر نے زمانہ، طالب علمی سے بچوں کی کہانیاں لکھنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے تنقیدی مضامین لکھنے شروع کیے، انھوں نے چودہ پندرہ برس کی عمر سے جن شخصیات پر مضامین لکھنے شروع کیے وہ کچھ اس طرح ہیں:

۱۔	نازک مزاج شاعر۔۔میر	مطبوعہ سدا بہار لاہور	۱۹۴۸ء
۲۔	اقبال بچوں کے شاعر کی حیثیت سے	تعلیم وتربیت لاہور	۱۹۵۱ء
۳۔	خوشحال خاں خٹک	مطبوعہ کوہسار	۱۹۵۲ء
۴۔	اکبر کی شاعری	روزنامہ تعمیر	۱۹۵۲ء
۵۔	لکھنو کی شاعری	روزنامہ تعمیر	۱۹۵۲ء
۶۔	غزل کی ابتدا	روزنامہ تعمیر	۱۹۵۲ء
۷۔	حالی غزل کے موڑ پر	روزنامہ تعمیر	۱۹۵۲ء
۸۔	نظیر اکبرآبادی عوامی شاعر	روزنامہ تعمیر	۱۹۵۵ء
۹۔	غزل میں تصورِ محبوب	نیرنگِ خیال راولپنڈی	۱۹۵۴ء

''غزل میں تصورِ محبوب''، اپنے زمانے کا مقبول مضمون رہا، جس میں سلیم اختر نے اس پہلو پر روشنی ڈالی کہ کس زمانے میں کون سی چیز شعراء کے زیادہ پیش نظر رہی۔ ایک زمانہ میں فارسی شاعری کا معشوق امرد تھا تو اہلِ اُردو نے بھی امرد پرستی کی روایات کو آگے بڑھایا اور فارسی شاعری کی تقلید میں اس محبوب کا تعلق تصوف اور محبوب حقیقی سے جوڑ دیا۔

۵۵۔۱۹۵۴ء کے دوران ڈاکٹر سلیم اختر نے تین مقالات ''ابن الوقت''، ''اکبر کی شاعری'' اور ''اکبر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی''، ''ہمایوں'' کے لیے قلمبند کیے انھیں ازاں بعد ''نگاہ اور نکتے'' میں شامل کیا گیا۔

ان ابتدائی تحریروں میں وسعت، سادگی اور معصومیت کو روا رکھا گیا ہے۔ سلیم اختر کے تنقیدی نظریات سمجھنے کے لیے ان کے تصورِ تنقید سے آگاہی ضروری ہے، بقول سلیم اختر:

''تنقید کی اہمیت کو ہمیشہ شک وشبے کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور اسے تخلیق سے کم

تر درجے پر رکھا گیا ہے لیکن ہم تنقیدی تحریروں کا مطالعہ کریں تو ہمیں بعض ایسے مشہور تخلیقی فنکار ملتے ہیں جو بہت اچھا تنقیدی شعور رکھتے ہیں۔ انگریزی ادبیات میں ورڈز ورتھ، کالرج، میتھو آرنلڈ اور ٹی ایس ایلیٹ، اُردو میں میر شعری تنقید کی روایت کے بانی ہیں۔ اسی طرح جدید دور میں: فراق، فیض اور احمد ندیم قاسمی۔ کہنے کا مطلب ہے کہ تنقید اور تخلیق ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلتی ہیں۔''

گروہی تنقید اور ذاتی نظریہ تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے سلیم اختر کہتے ہیں:

''تنقید کا معیار کیا ہے؟ اس سوال کا قطعی جواب مشکل ہے۔ تنقید جب معاصرین کے بارے میں ہو تو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ البتہ تنقید کا ایک اور پہلو ہے، جس سے مجھے دلچسپی ہے۔ اور وہ ہے اصولوں کی بحث، میں سمجھتا ہوں کہ اس نقطہء نظر سے اگر ہم تنقید کی گزشتہ تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس کے معیار میں بتدریج بلندی کا احساس ہوگا۔ گروہی تنقید کے بارے میں میرے نظریات واضح ہیں آپ نے جس Phenomana (منظرنامے) کو گروہی تنقید کا نام دیا ہے وہ تنقید کی مسخ صورت ہے۔ اس کی وجہ سے یا تو دوستی میں آنکھیں بند کر کے واہ واہ کی جاتی ہے یا دشمنی میں آنکھیں بند کر کے تخلیق کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے۔ دونوں صورتیں تنقید کے بلند منصب کے منافی ہیں۔ اس کے بعد مجلسی تنقید آتی ہے، جو کتابوں کی تقریبات، مدلل مداحی اور وقتی ہنگامے کا باعث ہے، اسے دوستانہ خوشنودی کہا جا سکتا ہے تاہم اس فیشن نے تنقید اور تنقید نگار کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔ ایسی تنقید فن پارے کی تفہیم میں کردار ادا کر سکتی ہے''

''جہاں تک میرے ذاتی نظریہء تنقید کا تعلق ہے میں بحیثیت نقاد اپنے آپ کو "In the Making" تصور کرتا ہوں۔ ابھی تک میرے مطالعے کی حدود پھیل رہی ہیں اور مختلف علوم سے روشناسی کے مراحل ابھی طے نہیں ہوئے تاہم

میرا جھکاؤ نفسیاتی تنقید کی طرف ہے۔ نفسیاتی تنقید کے آغاز میں، میں نے
فرائیڈ سے اثرات قبول کیے مگر مزید مطالعے کے بعد جب یونگ تک آ پہنچا تو
مجھے احساس ہوا کہ یونگ میں جو گہرائی ہے اس کے اجتماعی لاشعور کے تصور میں
جو قوت ہے وہ فرائیڈ کے مقابلے میں کہیں گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ یونگ
کے ساتھ ساتھ میں نے Anthropology اور Mythology کا بھی
مطالعہ کیا، جن سے مجھے علامات وغیرہ کی تفہیم میں مدد ملی۔'' (ص ۵۷ ہم سفر
بگولوں کا از ڈاکٹر طاہر تونسوی)

اسی طرح تنقیدی شعور کے زاویہ نگاہ کی تشکیل کے لیے ''نگاہ اور نقطے'' کے دیباچے میں لکھا:

''میرے تنقیدی شعور کے مظہر زاویہ ء نگاہ کی تشکیل نفسیاتی مطالعہ کی مرہون
منت ہے۔'' (ص ۸)

''میرا زاویہ ء نگاہ نفسیاتی ہے۔'' (ص ۱۰)

انتظار حسین کو مشرق اخبار کے لیے انٹرویو دیتے ہوئے سلیم اختر نے کہا:

''یہ میں ہوں کہ خصوصیت کے ساتھ نفسیات کو اپنایا ہے، میرے یہاں تو نفسیاتی
نقطہ ء نگاہ مسلسل اور مستقل ہے۔''

سلیم اختر کی تنقیدی اور تخلیقی تحریروں میں فرائیڈ، ایڈلر اور یونگ کا اثر دکھائی دیتا ہے یعنی لاشعور، نرگسیت، تحلیل نفسی، جنسی ارتفاع، ایڈی پس اور الیکٹرا کامپلکس کے ساتھ ساتھ احساس برتری و کمتری کا ادراک، لاشعوری سانچوں کے وجدان کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح سلیم اختر کی تنقید کو تحلیل نفسی، انفرادی نفسیات، عمرانی نفسیات اور تحلیلی نفسیات کے حوالے سے جانچا جا سکتا ہے۔ ''زیوس سے امیر حمزہ تک'' کا مقالہ اسی تحلیلی نفسیات کی اچھی مثال ہے۔

شخصی نظریات کے سلسلے میں: اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، منٹو، غالب، جوش، مجید امجد اور اسی قبیل کے دوسرے لکھنے والوں پر تنقید کرتے ہوئے شخصی مطالعے کو توازن اور بے تعصبی سے برتا گیا ہے۔

۱۹۶۸ء میں شائع ہونے والی پہلی کتاب ''نگاہ اور نقطے'' سلیم اختر کی پہلی تنقیدی کتاب ہے، جس میں بارہ مقالات شامل ہیں۔

۱۔ زیوس سے امیر حمزہ تک، ۲۔ منٹو خطوط کے آئینے میں، ۳۔ مرزا رسوا کا نظریہ ء ناول نگاری، ۴۔ شاعری میں زنانہ پن کی مثال: ریختی، ۵۔ غالب: خطوط کے آئینے میں، ۶۔ غالب کی نرگسیت،

۷۔ مردِ عاشق کی مثال، ۸۔ باغ و بہار کے درویش عاشق، ۹۔ انشائیہ نگاری، ۱۰۔ چند ہم عصر، ۱۱۔ ابن الوقت، ۱۲۔ اکبر: ایک تجزیاتی مطالعہ

سلیم اختر نے پیش لفظ میں اپنے تنقیدی نظریات کو اس طرح بیان کیا:

نگاہ : کائنات کی وسعتوں کے ادراک کا آلہ

نقطے : تفہیم کائنات کی اکائی، بصیرت کا راز، کائنات کے اسرار کی علامات

تنقید : نگاہ اور نقطے میں توازن کے ہردم متغیر انداز کا پیمانہ

اس کتاب کے ایک دو مضامین چھوڑ کر، باقی سب نفسیاتی تنقید ہی کے زمرے میں آتے ہیں، بلکہ ہم ان مضامین کو نصابی ادب سے قربت کے باعث افادی تنقید اور اطلاقی تنقید کی حیثیت سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں:

''ایک دو کو چھوڑ کر سارے مقالات عملی تنقید کے دائرے میں آتے ہیں اور آپ جانتے ہیں عملی تنقید معتبر بننے کے لیے نقاد سے خوش فکری و خوش ذوقی سے کہیں زیادہ تاریخ، ادب، عمرانیات اور نفسیات کے گہرے مطالعے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان کی تحریروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالعہ اس باب میں نہایت وسیع ہے اور اسی وسعتِ مطالعہ نے ان کی طرزِ فکر کو اور طرز بیان کو انفرادی لب و لہجہ سے آشنا کیا ہے۔۔۔ سلیم اختر کا تنقیدی لب ولہجہ دراصل خود اعتمادی، خود پوشی، ادبی دیانت، کشادہ فطری، بے باکی، خوش فکری، خوش ذوقی، طبیعت کی نرمی اور تخلیقی شگفتگی سے عبارت ہے۔ (نگار جون جولائی ۱۹۶۸ء)

اس کتاب کے کئی اقتباسات مصنف کے اس نظریہ تنقید پر روشنی ڈالتے ہیں، جس پر وہ ہمیشہ ثابت قدم رہا اور مشاہدہ کائنات کی اہمیت کے بارے میں لکھا:

''انسانی خود شناسی کی اساس تحیر پر استوار ہے۔ جس کا سائنٹفک پہلو تو حیات، عضویات اور تشریح البدن وغیرہ علوم سے عبارت ہے لیکن تفہیم کا یہ انداز انسان کو تمام کائنات سے علیحدہ ایک اکائی مانتے ہوئے، چند ایسے عمومی اصول اور قواعد وضوابط کی دریافت تک محدود ہے، جن کی تمام نوع پر تطبیق کی جاسکتی ہے۔

''زیوس سے امیر حمزہ تک'' تجزیاتی تعلیل کی مثال دیکھیے

''مرد اور خصوصاً انحطاطی معاشرے کا مرد زندگی میں اعلیٰ نصب العین اور تعمیری مقاصد کے فقدان کی بنا پر اپنی صلاحیتوں کو (بالعموم) جسم سے وابستہ کر کے خوب سے خوب تر کہاں کو شعار بنالے تو پھر وہ گھر کی جاہل بیوی سے آسودگی نہیں پا سکتا۔'' (شاعری میں زنانہ پن کی مثال: ریختی)

ادبی تخلیق کے لیے انفرادیت، تخیل اور خارجی ماحول کی تثلیث کو مرکزی نقطہ قرار دیتے ہوئے سلیم اختر نے لکھا ہے:

''ادبی تخلیق کا عمل پیچیدگیوں کا حامل ہے لیکن وہ اس مثلث سے باہر نہیں اور ان تین عناصر کی کمی بیشی، امتزاج اور ترمیم سے ہی ادب میں رنگا رنگی اور نکھار ہے۔ انفرادیت کے غلبے نے غنائی، حزینہ اور جدید عہد کی نرگسی شاعری کا رُوپ دھارا اور تخیل کی فراوانی نے قدیم داستانوں، یورپی رومانس اور مہماتی اور جاسوسی کہانیوں کا سلسلہ چلا رکھا ہے جب کہ خارجی ماحول پر زور نے حقیقت نگاری، واقعیت نگاری اور فطرت نگاری کی تحریکات کو جنم دے کر ادب اور مقصد، ادب اور افادہ جیسے مباحث کے لیے راہیں کھولیں۔''

(تخلیقی محرکات اور تخلیقی عمل، مضمون)

انھوں نے ادب اور تنقید کی افادیت کے سلسلے میں لکھا:

''اعلیٰ تر تخلیقی صلاحیتوں کا ادیب محض قارئین کا دل نہیں بہلاتا بل کہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت بھی کرتا جاتا ہے۔ یوں ذہین قاری اعلیٰ سے اعلیٰ تر مطالعہ کی بنا پر پختہ ذوق کو پختہ تر کرتا جاتا ہے۔ نیا طرزِ احساس رکھنے والا ادیب پہلے اپنے لیے نئے قارئین کا ایک حلقہ پیدا کرتا ہے اور تب اس کے بعد تنقید کی نئی بنیادیں تلاش کی جاتی ہیں، یوں ایسی ذہنی فضا جنم لیتی ہے، جو بالآخر وسیع پیمانہ پر اعلیٰ ذوق کا باعث بنتی ہے۔

(تخلیقی محرکات اور تخلیقی عمل، مضمون)

سلیم اختر کا خیال ہے کہ تخلیق ادب کاغذ اور قلم کے ملاپ سے جنم لیتا ہے اور اس سلسلے میں ادیب کے ہاتھوں کی جنبش، حروف کے دائرے اور قوسیں بھی اس قابل ہیں کہ ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جا سکے کیونکہ یہ سب کچھ عصبی نظام اور ذہنی ہم آہنگی کے تال میل سے ایک نظام فکر تشکیل دیتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب اور نفسیات، دراصل ادب اور ان اذہان کے معاملات سے متعلق ہیں جو ادیب، قاری، تنقید نگار اور ان کے گرد پھیلی ہوئی دنیا سے وابستہ ہے۔

لاشعور کی دریافت افراد اور تخلیق کاروں کی زندگیوں کے لاشعوری محرکات، ان کی موجود یا پیدا کردہ ذہنی الجھنوں سے بندھی ہوئی ہیں اس طرح نفسیاتی اصطلاحات اور مباحث انسان اور اس کی ازل تا ابد پھیلی ہوئی زندگی کو محیط ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے شعور اور لاشعور کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔

> ''تنقید کے بعض دبستانوں میں جیسے: تاریخی، عمرانی اور کسی حد تک اشترا کی تنقید مادی جدلیات اور طبقاتی کشمکش کو بنیادی حیثیت دیتی ہے: معاشرہ اور اس کی تشکیل کرنے والے عناصر کے تفصیلی تجزیہ کو پس منظر بنا کر تخلیق کاروں کے تخلیقی شعور کی نشو و نما اور تخلیقات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ کلچر کا مطالعہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے کیونکہ معاشرے کے تانے بانے میں جن نقوش اور رنگوں کی وجہ سے انفرادیت پیدا ہوتی ہے، وہ کلچر ہی سے عبارت ہیں۔ یہی نہیں کلچر سے کسی خاص عہد کی ذہنی فضا متاثر ہوتی ہے اور پھر آنے والے تخلیقی اذہان کے لیے فضائے تخلیق کی صورت اختیار کر کے، ان کی تخلیقات کو عصری تقاضوں اور ان سے جنم لینے والے نفسی میلانات سے ہم آہنگ کرتی ہے' بسا اوقات تو کلچر کی خود پسندی اور خود ستائی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ساری تہذیب مریضانہ حساسیت، تعرفیت. املاک پسندی، جارحیت، حسد، نفرت، حقارت کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے ہیجانات پر قابو پانے میں ناکام ہونے لگتی ہے۔''

(ادب۔۔۔ نرگسیت کے آئینے میں، مضمون)

سلیم اختر سمجھتے ہیں کہ انسانی فہم و ادراک کے لیے تنقید سانس لینے کے عمل سے مشابہ ہے۔ اگر ادب انسانی احساسات کی تہذیب کا نام ہے تو ادبی تنقید اس تہذیب کا حسن و قبح اجاگر کرتی ہے۔ تنقید کی تعریف میں تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس کی اہمیت میں نہیں۔ اس لیے تخلیقی عمل، ادبی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ، تخلیق کا نفسیاتی مطالعہ، قارئین کا نفسیاتی مطالعہ تنقید نگار کا، وہ منصب ہے جو، اسے صاحب اعتبار

بناتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ فرائیڈ، یونگ، ایڈلر، آئی اے رچرڈز اور دوسرے نفسیاتی مفکرین سے متاثر ہیں۔

اپنی تنقید نگاری کے سلسلے میں ان کا خیال ہے:

''کسی مصنف، کتاب یا تخلیق کا مطالعہ کرنے سے پیشتر اس کے بارے میں نہ تو کوئی رائے قائم کرتا ہوں اور نہ ہی کوئی تھیسس تیار کر کے اس پر تخلیق کو فٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں جب تنقید کی غرض سے کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں دورانِ مطالعہ جو باتیں، نقاط یا خصوصیات متاثر کرتی ہیں انہیں الگ سے کاغذ پر نوٹ کرتا جاتا ہوں، یوں ان پوائنٹس کی امداد سے میں کتاب کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں، یوں دیکھیں تو میرا طریقہء کار Inductive ہے۔''

''بحیثیت نقاد میں اس بات کا قائل ہوں کہ اپنی بات کو دوٹوک انداز سے قطعی قسم کے اسلوب میں بیان کرنا چاہیے، مجھے الجھے الجھے ہوئے بیانات، غیر ضروری حوالوں اور تکرار سے سخت چڑھ ہے۔ میں سمجھتا ہوں گول مول الفاظ میں Non Commitial قسم کی رائے کا اظہار اس بات کا غماز ہے کہ نقاد میں اعتماد نہیں۔ تنقید اور بالخصوص معاصرین پر تنقید کمزور اصحاب والے نقادوں کا کام نہیں۔ مجھے تنقید کے اصولی پہلوؤں سے نسبتاً زیادہ دلچسپی ہے اور میں نے افراد کے مقابلے میں مسائل اور مباحث کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح تخلیق میں ادیب کی شخصیت کی جھلک ملتی ہے، اسی طرح نقاد بھی خواہ غیر جانبدار یا Objective بننے کی کوشش کیوں نہ کرے اس کی شخصیت کسی نہ کسی طرح اس کی تنقید میں اظہار پا جاتی ہے۔''

(ادب۔۔۔ نرگسیت کے آئینے میں، مضمون)

ڈاکٹر سلیم اختر کی عملی تنقید

فن پارے میں حسن کاری کا عمل نازک اور پیچیدہ معاملہ ہے، اس نزاکت کے حصول کے لیے تکنیک کی ضرورت پڑتی ہے۔ تکنیک تناسب اور آہنگ کے متقاضی ہے اور اس کا نیا پن اظہار و تاثر کی نمود چاہتا ہے۔ اسی تاثریت سے کسی فن پارے کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ اس درجہ بندی کے لیے عموماً سلیم اختر نے تحلیلِ نفسی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ درجہ وار مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

نگاہ اور نقطے

سلیم اختر کے تنقیدی مقالات کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا اس میں بارہ مضمون شامل ہیں۔

زیوس میں سے امیر حمزہ تک، باغ و بہار کے درویش عاشق، شاعری میں زنانہ پن کی مثال: ریختی، تینوں مضامین سماجی مدوجزر، اساطیری محرکات اور لسانی تغیر سے عبارت ہیں۔ اسی طرح اکبر کا تجزیاتی مطالعہ، ابن الوقت، مرد عاشق کی مثال غالب، انفرادی اور کرداری مطالعے کے ساتھ ساتھ تاریخی و تہذیبی اعتبار سے: زوال، کج روی، موقع، پرستی، مجہولیت اور تحقیر ذات کے حوالے ہیں، جنھیں از اں بعد ایڈلر کے کمتری و برتری احساسات سے جوڑا جا سکتا ہے۔

منٹو خطوط کے آئینے میں، غالب خطوط کے آئینے میں، غالب کی نرگسیت تقابلی مطالعے اور شخصی حوالوں کی تلاش کا تجربہ ہے۔ یہاں مصنف نے حتمی رائے دینے سے گریز کیا ہے۔ ''انشائیہ نگاری'' میں تحلیل نفسی کی اس تکنیک کا تذکرہ ہے جو انکشاف ذات کا باعث بنتی ہے۔ ''چند ہم عصر'' مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا مطالعہ ہے جسے سلیم اختر نے ایک میکانکی شخصی مطالعہ قرار دیا ہے۔ بقول مصنف:

> ''ان کی کوشش ہے کہ پس منظر اور پیش منظر دونوں کو یکساں اجاگر کریں لیکن ان کی مصوری کا تاثر یوں بھرپور نہیں ہوتا کہ پس منظر کے ضمن میں ان نفسیاتی رجحانات اور لاشعوری محرکات کو نظر انداز کر جاتے ہیں، جس سے شخصیت کا تار پود تشکیل پذیر ہوتا ہے اس لیے ان کے سوانحی مرقعے اس ''خورد بینی'' تاثر

سے محروم ہیں، جن کی وجہ سے انسان قطرے میں اک جہاں آباد دیکھ لیتا ہے۔"

یہ مضامین جن کی حیثیت نصابی اور افادی ہے۔ سلیم اختر کے وسیع مطالعے، ذہانت اور جرات کا نمونہ ہیں، انھوں نے اشتعال انگیزی کے بجائے متانت اور سلیقے سے کام لیا ہے۔ "نگاہ اور نقطے" کا دیباچہ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا۔ بقول ان کے:

"سلیم اختر نے نفسیاتی تنقید میں توازن اور بے تعصبی اختیار کر کے ہماری تنقید کو ایک راستہ دکھایا ہے۔"

میر امن کی باغ و بہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

۱۹۶۸ء، اگرچہ مرتبہ کتاب ہے لیکن اس کا مقصد بھی تہذیبی اور سماجی حالات کا جائزہ ہے۔

تنقیدی دبستان

۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے آغاز میں تنقید اور دبستان کی حیثیت تعارفی ہے تاکہ تنقیدی دبستانوں پر عمومی روشنی کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت اور حسن و قبح واضح ہو جائیں۔ ہر تنقیدی دبستان کے مطالعے میں مغربی ناقدین کے نظریات و آراء کے علاوہ اُردو میں اسی دبستان کے عمومی اثرات پر توجہ دی گئی ہے۔ کتاب کو تیرہ مباحث میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ تنقید اور دبستان۔ ۲۔ تنقید کی اقسام۔ ۳۔ تشریحی تنقید۔ ۴۔ تاریخی تنقید۔ ۵۔ عمرانی تنقید۔ ۶۔ رومانی تنقید۔ ۷۔ جمالیاتی تنقید۔ ۸۔ تاثراتی تنقید۔ ۹۔ سائنٹفک تنقید۔ ۱۰۔ مارکسی تنقید۔ ۱۱۔ نفسیاتی تنقید۔ ۱۲۔ تقابلی تنقید۔ ۱۳۔ امریکہ میں تنقیدی دبستان

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا:۔

"اُردو میں سرِ دست یہ کتاب آپ اپنا جواب ہے۔ یقین ہے کہ طلبہ سے لے کر ادب کے عام قاری تک بھی اسے پسند کریں گے۔" (دیباچہ تنقیدی دبستان)

سلیم اختر نے تنقید کے دبستان بننے کے محرکات اور عوامل کا سراغ لگاتے ہوئے انفرادی طور پر ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، عابد علی عابد، حسن عسکری، ریاض احمد، احتشام حسین، مجنوں گورکھ پوری، ممتاز حسین، نیاز فتح پوری، فراق گورکھ پوری، آل احمد سرور، ڈاکٹر احسن فاروقی اور کلیم الدین احمد کے تجزیاتی، نفسیاتی، مارکسی، جمالیاتی، تاثراتی نظریات جاننے کی کوشش کی

ہے۔

تنقید کی اقسام کی مزید تشریح کے لیے سلیم اختر نے قانون ساز تنقید، نظریاتی تنقید اور توضیحی تنقید کی وضاحت کرتے ہوئے اُردو میں نظری اور عملی تنقید کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنے تنقیدی ابواب کی مزید تشریح کے لیے ان کے عنوانات میں تفصیلی جملوں کا اضافہ کیا ہے۔

تشریحی تنقید: معیار پرستی کی ایک مثال — تاریخی تنقید: تاریخی عوامل کی نشاندہی
عمرانی تنقید: سماجی محرکات کی تلاش — نفسیاتی تنقید: لاشعوری محرکات کی طلسم کاری
تقابلی تنقید: ادبی تخلیقات کی میزان وغیرہ

اس کتاب کی بڑی خوبی اس کا سادہ اور عام فہم ہونا ہے۔ جولائی ۱۹۷۹ء میں سلیم اختر نے تنقید کے جدید رجحانات کے زمرے میں ''ساختیاتی تنقید'' کے نام سے ایک مقالہ لکھا جو فنون میں شائع ہوا۔

ادب اور لاشعور

یہ کتاب ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی اور اسے سلیم اختر کی ایک نمائندہ کتاب کی حیثیت حاصل ہے اسے داؤد ادبی انعام بھی دیا گیا۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اور فلیپ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا۔ بقول مصنف:

> ''ادب اور لاشعور مجھے ذاتی طور پر پسند ہے۔ اس میں، میں نے ادبی مسائل، ادبی اصناف اور ان سے متعلقہ مباحث پر نفسیات کے مخصوص نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔''

کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: ادب، مسائل، اصناف:

☆ ادب

۱۔ ادب کیا نہیں؟ — ۲۔ ادب: تخلیقی محرکات — ۳۔ ادب اور تخلیقی شعور
۴۔ ادب: نرگسیت کے آئینے میں — ۵۔ ادب اور فحاشی — ۶۔ ادب اور خواتین
۷۔ بچوں کا ادب

☆ مسائل

۱۔ تخلیق کار کی ابنارملٹی — ۲۔ ادب اور بلاغ — ۳۔ مقصد یا افادہ — ۴۔ ادب اور زبان
۵۔ ادب اور اخلاقی اقدار — ۶۔ ادب اور فنونِ لطیفہ

☆ اصناف

۱۔ تنقید اور لاشعور ۲۔ غزل اور تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ ۳۔ مرثیہ اور کیتھارس

۴۔ انشائیہ اور انسانی سائیکی ۵۔ مصوری اور اعصابی خلل

ادب کی اثر پذیری متنوع نفسیاتی عوامل کی مرہونِ منت ہے۔ شناخت اور مماثلت وہ خاص نفسی حالت ہے جس میں قاری اپنا آپ تحریروں کے مطابق پاتا ہے، یہی یک رنگی لاشعوری عمل کا حصہ بنتی ہے۔ اس طرح تخلیقی محرکات اور ادب اور تخلیقی شعور اہم مضامین ہیں، جن میں مصنف نے افلاطون سے یونگ تک لاشعوری نظریات کا جائزہ لیا ہے، بقول مصنف:

''آج ادب میں ہیئت، الفاظ، تراکیب اور ابلاغ کے دیگر ذرائع کے ضمن میں تجربات اور مسلمات سے انحراف کے رجحان میں جو صد رنگی ملتی ہے، دراصل اس میں بھی یک رنگی ہے۔ وہ یوں کہ لاشعور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔''

(ص ۴۷)

ادب اور نرگسیت، غالب کی نرگسیت والے مضمون کی ارتقائی شکل ہے۔ اس میں غزل اور داستان کے مطالعے کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ باقی تین مضامین جزوی مطالعے ہیں۔

تخلیق کار کی ابنارملٹی، ابلاغ، ادب کا مقصد اور ادب کے ساتھ زبان کا رشتہ مصنف اور قاری کے درمیان الفاظ کا رشتہ قائم کرنے کی کوشش ہے۔ کیوں کہ ہر لفظ گنجینۂ معنی ہے اس کا انتخاب ہی اس کا درجہ متعین کرتا ہے۔ ادب اور اخلاق کی بحث سمیٹتے ہوئے مصنف اس نتیجے پر پہنچتا ہے:

''ادبی تخلیقات کے اصول معاشرے اور قانون وغیرہ سے جداگانہ حیثیت و اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ ان کے تابع نہیں بل کہ ماورا اور بے نیاز بھی ہیں۔''

(ص ۲۱۱)

ادب اور فنون لطیفہ کے باہمی رشتے کے سلسلے میں سلیم اختر نے لکھا ہے:

''آج زبان کی پیچیدگی، اسلوب سے وابستہ فنی مباحث اور ابلاغ کی فنی نزاکتیں سیدھے سادھے تصویری رسم الخط کی نہ تو متحمل ہو سکتی ہیں اور نہ ہی جدید دور کے علمی اور فکری تقاضے ان سے پورے ہو سکتے ہیں۔'' (ص ۲۳۹)

تنقید اور لاشعور میں سلیم اختر نے اُردو ادب میں نفسیاتی تنقید کا سراغ لگاتے ہوئے، مرزا رسوا کو اُردو کا پہلا نفسیاتی نقاد کہا ہے۔ اسی طرح غزل کے تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ قافیہ اور ردیف کی نفسیاتی اہمیت اور

شاعر کے مقطع کے ذریعے، اس کی نفسی تسکین اور لاشعوری محرکات کا مظہر قرار پاتا ہے۔ مرثیہ اور کیتھارس میں ہیرو کی موت یا شہادت کا فیصلہ اس کی شجاعت اور بہادری کی اساس بنتا ہے۔ یہ تصور ارسطو کے نظریہ، تطہیر نفس سے ملتا جلتا ہے۔

انشائیہ اور انسانی سائکی میں انشائیے کے متن کے بارے میں سوال اٹھائے گئے ہیں۔ بقول سلیم اختر:

''عام زندگی میں ہم لوگ نقلی چہرے Persona سجائے پھرتے ہیں۔ انشائیہ اس نقلی چہرے کو ہٹانے کی ایک کوششِ لطیف ہے۔'' (ص ۲۹۹)

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے لکھا ہے:

''نفسیاتی تنقید پر زیرِ نظر کتاب سے زیادہ پُر معنی اور ذہین مواد اُردو میں کہیں اور نہ ملے گا۔ سلیم اختر صاحب نفسیاتی تنقید کا پورا حق ہی ادا نہیں کر رہے ہیں بلکہ بل کہ اس مدرسہ، خیال کا جو سب سے اہم جدید مدرسہ ہے، اُردو ادب میں جھنڈا گاڑ رہے ہیں۔'' (سیپ کراچی ۲۸۵)

افسانہ حقیقت سے علامت تک

۱۹۷۶ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب مکمل اور مربوط طریقے سے افسانے کے ارتقا سے بحث کرتی ہے۔ بقول سید وقار عظیم:

''یہ کتاب اُردو فکشن کی تنقید میں تازہ ہوا کا جھونکا ہے''

اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر انور سدید اور فلیپ محمد علی صدیقی نے لکھا۔ اس کے موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ باغ و بہار: تحقیق و تنقید ۲۔ اُردو کا پہلا جنسی افسانہ ۳۔ افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ ۴۔ مختصر افسانہ: اعتراضات و جوابات ۵۔ افسانہ: حقیقت سے علامت تک ۶۔ ناول، ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ ۷۔ نفسیاتی افسانہ ۸۔ روحِ عصر اور افسانہ ۹۔ اُردو افسانے میں عورت ۱۰۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے ۱۱۔ کیا آج سعادت حسن منٹو کی ضرورت ہے؟ ۱۲۔ متھن کا تجزیاتی مطالعہ

ان مضامین میں پہلے نو مضامین: ماخذات، جنس اور تکنیک سے متعلق ہیں اور آخری تین انفرادی

مطالعہ۔

باغ و بہار: تحقیق و تنقید، میں اُردو افسانے کی جڑیں تلاش کی گئی ہیں۔ اُردو کی پہلی جنسی افسانوی کہانی سجاد حیدر یلدرم کی خارستان و گلستان قرار پائی ہے۔ افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ، ادب پارے کو تکمیل سے نہیں بل کہ اس کی تخلیق سے پہلے کے تخلیقی کرب سے جوڑا گیا ہے۔ مختصر افسانہ: اعتراض و جوابات، فن کی مبادیات اور اساسی رجحانات سے متعلق ہے۔ افسانہ: حقیقت سے علامت تک، اُردو افسانے کی ارتقائی کہانی ہے، جسے پریم چند اور یلدرم سے لے کر ترقی پسند تحریک اور پھر منٹو، عصمت چغتائی، حجاب امتیاز علی اور نیاز فتح پوری تک پھیلایا گیا ہے۔ ترقی پسند افسانے کی جارحیت کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف علامت اور تجرید کے دور میں آتا ہے۔ مصنف اسے داخلی خلا میں سفر قرار دیتا ہے۔ سلیم اختر کے خیال میں:

''علامتی اور تجریدی افسانہ دونوں جداگانہ ہیں اور ہر دور کے تکنیکی تقاضے بھی الگ الگ ہیں۔ علامتی افسانہ ماضی پرستی نہیں اور نہ ہی کہنہ روایات کو زندہ کرنا بل کہ ماضی کی روشنی میں حال کی تاریکی اجاگر کی جاتی ہے۔ (ص ۱۱۵)

''تجریدی افسانہ انسان کو متنوع اور بعض اوقات باہم متصادم نفسی کیفیات کے روپ میں دیکھتا ہے اس لیے وہ انسان کو اس کے جسمانی یا Tingible روپ میں پیش کرنے کے بجائے اس کی نفسی تصویر کشی کی سعی کرتا ہے۔'' (ص ۱۱۷)

ناول، ناولٹ اور مختصر طویل افسانہ کے فرق کو واضح کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ ناول کے مقابلے میں ناولٹ نگاری تفصیل سے زیادہ جزئیات نگاری چاہتی ہے۔ اسی طرح طویل مختصر افسانہ وحدتِ تاثر کا متقاضی ہے، نفسیاتی افسانہ میں منٹو، عصمت اور ممتاز مفتی کے افسانوں کو نفسیاتی افسانے قرار دیا گیا ہے۔ روح عصر اور افسانہ کے ضمن میں سلیم اختر معاشرے اور سماج کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے کرشن چندر، عصمت، منٹو، بیدی، ندیم، علی عباس حسینی، بلونت سنگھ، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور کے توسط سے مختلف طبقات کے افسانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اُردو افسانہ میں عورت کے ضمن میں نسوانی کرداروں پر لکھے گئے افسانوں کی جانب اشارہ دیا گیا ہے۔ مصنف نے ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں میں ایک نئی عورت تلاش کی ہے۔ کامیاب افسانوں میں وفا کی دیوی اور پدما (پریم چند) میلہ گھومنی (علی عباسی حسینی) کوکھ جلی (بیدی) حرامجادی (حسن عسکری) لحاف (عصمت چغتائی) ہتک (منٹو)، آپا (ممتاز مفتی) سناٹا (احمد ندیم قاسمی) پت جھڑ کی آواز (قراۃ العین حیدر) مائی پھاتاں (مرزا ادیب) اور راستہ (خدیجہ مستور) کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا۔ گویا سلیم اختر نے اُردو افسانوی ذخیرے کا جائزہ لے

کر انتہائی اہم نتائج نکالے ہیں۔ منٹو کے سلسلے میں مضمون منٹو کے بارے میں ایک نئی تفہیم سامنے لاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے میں پریم چند کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے دیہاتی زندگی کو افسانوی محور بنانے کی کوشش کو سراہا گیا ہے۔ اس حوالے سے احمد ندیم قاسمی منفرد افسانہ نگار ہیں جنھوں نے مغربی پنجاب کے ریگستانی اور سطح مرتفع کے علاقوں اور ان کے لوگوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ متھن کا تجزیاتی مطالعہ راجندر سنگھ بیدی کے فن افسانہ نگاری پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس طرح یہ کتاب افسانے اور اس کی تنقید میں اہمیت اور افادیت کی حامل قرار پاتی ہے۔ بقول سراج منیر:

> ''اس کتاب کو دیکھ کر ایک خوبصورت بات جو ہمیں لگی وہ یہ ہے کہ افسانوں کے تجزیاتی مطالعے اور افسانہ نگاروں کے مطالعے کے علاوہ خود افسانے کے فن پر اس کی مختلف جہات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' (تخلیق لاہور ۹۲)

بقول ڈاکٹر انور سدید:

''مجھے یقین ہے کہ سلیم اختر کی یہ کتاب اُردو افسانے کی نمائندہ تنقیدی کتابوں میں شمار ہوگی۔'' (ص ۱۲)

تخلیق اور لاشعوری محرکات

یہ کتاب ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی یہ کتاب ایک لحاظ سے ''ادب اور لاشعور'' کی توسیع ہے۔ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں تحلیلِ نفسی اور ادب کے باہمی رشتے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسرے میں علامت اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا نفسیاتی مطالعہ ہے اور تیسرے حصے میں کچھ شاعروں کا نفسیاتی جائزہ ہے۔ کتاب کے ابتدائی مقالات ڈاکٹر سلیم اختر کے پی ایچ ڈی تھیسس کا وہ حصہ ہیں جو تھیسس کی کتابی شکل میں اشاعت سے قبل طوالت کم کرنے کے لیے حذف کیے گئے۔

ادب اور کلچر

''ادب اور کلچر'' ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے بنیادی عنوانات پانچ ہیں، یعنی ادب، شخصیات، تخلیقی رویے، مباحث، کلچر۔

ادب کے زیرِ اہتمام یہ مضامین شامل ہیں۔ ۱۔ مسدسِ حالی (عوامل مقاصد، نتائج) ۲۔ اُردو میں نوکلاسیکی تنقید کا احیا ۳۔ انارکلی: ایک جائزہ ۴۔ بچے، بڑے، ادب ۵۔ قومی ادب ۶۔ جنگ اور

ادب شخصیات کے ضمن میں:
ا۔حیات جاوید کا تنقیدی مطالعہ ۲۔کیا اکبرالہ آبادی ضروری ہے ۳۔کچھ امیر مینائی کے بارے میں ۴۔ن م راشد کا متروک کلام ۵۔معتدل گرمئی گفتار کا غزل گو: فیض ۶۔شاد عارفی: خطوط کے آئینے میں ۷۔تلخ پرچھائیاں ۸۔اُردو ادب کا جوگی: ابن انشاء ۹۔سلیم احمد: شخص اور نقاد تخلیقی رویے کے تحت
ا۔غزل اور رومانی طرز احساس ۲۔سفرنامہ اور مسافر ادیب ۳۔موضوع اور تخلیقی رویے ۴۔نثری نظم کیوں؟ ۵۔ناول کیوں نہیں؟ مضامین شامل ہیں۔
مباحث کے سلسلے میں: ا۔ترقی پسندی کیا نہیں ہے؟ ۲۔جدیدیت: ایک مطالعہ ۳۔لفظ کا سومنات ۴۔عصری تقاضے اور ادیب ۵۔گمشدہ استعارہ شامل ہیں۔
کلچر کی بحث میں: ا۔پاکستانی کلچر ۲۔کلچر کی لہریں ۳۔قوم زبان اور کلچر ۴۔ڈگڈگی اور چنگیر جیسے مضامین موجود ہیں۔
بقول سلیم اختر:

''میں نے نفسیات کو کبھی اندھے کی لاٹھی نہیں بنایا، میں صرف نفسیات سے وہیں کام لیتا ہوں، جہاں اس کے جواز کا امکان ہو۔''

اس کتاب کا اہم حصہ کلچر کی مباحث ہی ہیں، جو براہ راست پاکستانی مسائل سے بندھے ہوئے ہیں۔ بقول سلیم اختر:

''ملک ایک گھر ہوتا ہے تو قوم اس میں بسنے والی کنبہ۔ جس طرح بچوں کے لیے آنگن کا دامن ہمیشہ کشادہ رہتا ہے، اسی طرح تعصب، نفرت اور شک وشبہ سے پاک ہو کر اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اگر فرائض بھی ملحوظ رکھیں تو اس ملک میں سب رہ بھی سکتے ہیں اور اپنی اپنی بولی بھی بول سکتے ہیں۔ آخر یہ کوئی ریس تو نہیں کہ تمام گھوڑوں کی ہار میں اپنی جیت مضمر ہو۔'' (ص ۳۲۷۔ادب اور کلچر)

نفسیاتی تنقید

۱۹۸۶ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کی، کتاب کا انتساب، ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی بیوی سعیدہ کے نام کیا ہے۔ فلیپ پر مصنف کی اپنی رائے درج ہے اور پیش لفظ میں اس نے لکھا ہے فرائڈ،

ژونگ اور ایڈلر کے تصورات نے پہلے مغرب میں اور پھر اُردو میں تنقید کو جس طرح نفسیاتی اسلوب سے روشناس کرایا، یہ مقالہ اسی کی داستان ہے۔ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

باب اول۔ نفسیاتی تنقید کے ابتدائی نقوش

ا۔آب حیات کا خصوصی مطالعہ ۲۔اُردو تنقید پر انگریزی اثرات ۳۔اُردو میں تراجم کتاب اور ان کی اہمیت ۴۔اُردو میں نفسیاتی کتب کے تراجم۔۵۔نفسیاتی کتب کے تراجم کا اُردو تنقید پر اثر؟ نفسیات کی اصطلاح کا ارتقاء ۶۔نفسیاتی تنقید کی اولین مثال ۷۔مرزا رسوا؟ ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری ۸۔وحید الدین سلیم۔

باب دوم۔

ا۔فرائیڈ، ادب اور لاشعور، لاشعور، فرائیڈ سے قبل، فرائیڈ کا نظریہ لاشعور اور تحلیل نفسی، فرائیڈ کا نظریہ ادب، فرائیڈ کی ادبی تنقید، مطالعہ ادب میں تحلیل نفسی کے کردار کا تنقیدی جائزہ ۲۔فرائیڈ سے متاثر اُردو ناقدین، نفسیاتی تنقید کے ابتدائی نقوش، مرزا محمد سعید، محمد حسین ادیب، سید شاہ محمد ۳۔جدید شعری تنقید کا مورث: میراجی، میراجی کی نفسیاتی تنقید کے مخصوص رجحانات ۴۔نفسیاتی تنقید: میراجی کے بعد۔ اختر اورینوی، رفیق الزماں، مظہر عزیز، حزب اللہ، وجیہہ الدین، شمشاد عثمانی ۵۔تقسیم ملک کے بعد نفسیاتی تنقید کے اسالیب۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ریاض احمد، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، علی عباس جلال پوری ۶۔بھارت کے نفسیاتی ناقدین۔سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ڈاکٹر سید محمود الحسن رضی، دیوندر اسر

باب سوم۔

ا۔ژونگ کا تصورِ ادب۔ژونگ کی ادبی تنقید۔ ۲۔اُردو میں ژونگ کے متاثر ناقدین، ڈاکٹر محمد اجمل، ابن فرید، سجاد باقر رضوی۔

باب چہارم۔

انفرادی نفسیات کی انتقادی اہمیت ا۔ایڈلر کی انفرادی نفسیات۔احساس کمتری اور ادبی شخصیات پر اس کے اثرات، عضوی خامیوں کا بطور تخلیقی محرک جائزہ، ایڈلر اور ادب، دوستوفسکی پر مقالہ ۲۔اُرو میں ایڈلر سے متاثر ناقدین: حیات اللہ انصاری

باب پنجم

ا۔ادیب کی شخصیت کا نفسیاتی جائزہ: تخلیق سے وابستہ تخلیقی عمل کا مطالعہ، کلچر کے نفسیاتی محرکات کی تخلیق پر اثر آفرینی۔تاریخی حالات کے نفسیاتی اثرات۔سماجی کوائف کا نفسیاتی مطالعہ۔ادب اور

اخلاق کا نفسیاتی جائزہ۔ موضوع اور مواد کی نفسیاتی اہمیت ۲۔ اسلوب کا نفسیاتی مطالعہ۔ علامت کی نفسیاتی اہمیت۔ علامت کا فرائیڈ، ایڈلر اور ژونگ کے نظریات کی روشنی میں مطالعہ۔ ادب اور خوابوں کی علامات کا نفسیاتی رابطہ، تشبیہ اور استعارے کی نفسیاتی اہمیت، امیج اور امیجری کا نفسیاتی جائزہ۔ ۳۔ بعض اہم اصناف کا نفسیاتی مطالعہ۔ غزل کی نفسیاتی اہمیت۔ مرثیے کا نفسیاتی مطالعہ، مثنوی کا نفسیاتی تجزیہ، افسانہ اور نفسیات:۔ ناول، نفسیات کی روشنی میں انشائیہ کا نفسیاتی مطالعہ، اہم ادبی شخصیات کے نفسیاتی مطالعے کی ضرورت۔

باب ششم۔

نفسیاتی تنقید کا طریق کار۔ ۱۔ نفسیاتی تنقید کی حدود، نفسیاتی نقاد کی مشکلات ۲۔ نفسیاتی تنقید کا خام مواد: سوانح عمری، خودنوشت، خطوط، ڈائری۔ ۳۔ نفسیاتی تنقید اور دیگر اسالیب نقد: موازنہ و تقابل، مارکسی تنقید بمقابلہ نفسیاتی تنقید، تاثراتی تنقید اور نفسیات کی میزان رومانی اور نفسیاتی تنقید کے مشترک عناصر، تاریخی محرکات اور لاشعور جمالیاتی تنقید اور نفسیاتی تنقید۔

باب ہفتم۔

نفسیاتی تنقید کی عملی مثالیں، ۱۔ نفسیاتی تنقید کا محبوب موضوع: غالب ۲۔ غالب کے نفسیاتی مطالعے کی اولین مثال ۳۔ فرائیڈ، ژونگ اور غالب ۴۔ غالب شناسی کے تین نفسیاتی زاویے، ڈاکٹر سلام سندیلوی اور غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ، سلیم احمد اور ''غالب کون''؟ محمد موسیٰ کلیم اور ''مقام غالب'' ۵۔ نفسیاتی ناقدین کے طریق کار کا تقابلی مطالعہ ۶۔ نفسیاتی تنقید: موجودہ صورت حال اور مستقبل کے امکانات

ڈاکٹر سلیم اختر مندرجہ بالا مباحث کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

''اُردو میں نفسیاتی تنقید کی قدامت مارکسی اور دیگر اسالیب نقد کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ نفسیاتی تنقید کی ترقی کا اگر گراف بنے تو شاید اس میں اچانک اوپر کو جست لگاتی قوس تو نہ ملے لیکن بتدریج ارتقا کا احساس ضرور ہوتا ہے، خاص طور پر تقسیم ملک کے بعد۔ تنقید کے دیگر دبستانوں کے برعکس نفسیاتی تنقید تخلیق کو تخلیق کار کی شخصیت کی روشنی میں سمجھنے کی مدد دیتی ہے۔ اس لیے اس کے معائیر انسان کی ذات کے بطون سے جنم لیتے ہیں۔ لاشعور، جنس، اجتماعی لاشعور استحصال، احساس کمتری وغیرہ یہ سب انسانی شخصیت کے مختلف ارتقائی

مدارج کی تفہیم اوراس کی متنوع اور رنگ بدلتی صورتوں کی تحلیل وتشریح کے مختلف
انداز ہیں۔ایسے انداز جوانسانوں سے متخرج ہیں اورانسانوں پر منطبق ہیں۔
نفسیاتی تنقید لاشعور کے باعث آفاقی حیثیت اختیار کر کے انسان اوراس کی
تخلیقی کاوشوں کی یوں تحلیل وتشریح کرتی ہے کہ شخصیت تخلیق کا آئینہ بنتی ہے اور
تخلیق کے آئینے میں شخصیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ جب تک انسان رہے گا
اس کی تخلیقی کاوشیں رہیں گی ،نفسیاتی تنقید کی ضرورت رہے گی۔''

(ص ۲۶۷۔۲۶۶ نفسیاتی تنقید)

انشائیہ کی بنیاد

۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔یہ ایک ہی موضوع پر مسلسل اور مربوط کتاب ہے اس کے سترہ ابواب ہیں
جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ایسے :مغرب میں ۲۔انشائیہ کا طلوع ۳۔انشائیہ میں خیال کی نیرنگی ۴۔انشائیہ اور متنوع نثری
اسالیب ۵۔انشائیہ کی اصطلاح ۶۔انشائیہ مبادیات ۷۔انشائیہ کیا نہیں؟ ۸۔انشائیہ :نفسیات کے
آئینے میں ۹۔انشائیہ نگار کی شخصیت ۱۰۔انشائیہ کا اسلوب ۱۱۔انشائیہ اور تازگی فکر ۱۲۔انشائیہ میں
تنوع ۱۳۔انشائیہ اور قاری ۱۴۔انشائیہ کا زوال ۱۵۔انشائیہ کدھر ۱۶۔ناگفتنی ۱۷۔انشائیہ اور اہلِ
قلم۔

پہلا باب جومغربی انشائیے یا مضمون نگاری کی روایت کا احاطہ کرتا ہے،اس میں مونتین کے تصورات
سے احاطہ کیا گیا ہے، Michel de Montaigne جوفرانسیسی انشائیہ نگار ہے اس کے حالاتِ
زندگی درج ہیں۔بقول سلیم اختر:

''مونتین کے اسئیز کا مطالعہ ہمیں ایک سچے اور کھرے انسان سے متعارف
کراتا ہے کہ جی چاہتا ہے کاش وہ ہمارا ہمعصر ہوتا۔'' (ص ۲۱ انشائیہ کی بنیاد)

اس کے ساتھ ہی فرانسس بیکن کا تذکرہ ہے۔بیکن انگریزی کے قادرالکلام انشاپردازوں میں شمار ہوتا
ہے۔بقول ڈاکٹر سلیم اختر

''ہمارے ہاں جو حضرات انشائیہ کو: زندگی، اس کے تنوع، گہری سوچ اور

فلسفیانہ استدلال سے الگ رکھنا چاہتے ہیں وہ اگر بیکن کا مطالعہ کریں تو انھیں
علم ہو جائے گا کہ انگریزی میں ایسے کو متعارف کرانے والا اور مقبول کرانے والا
بیکن فلسفیانہ نگاہ اور فلسفیانہ سوچ کے علاوہ اور کچھ تھا ہی نہیں۔'' (ص ۳۲)

اس کے بعد ابراہم کاؤے کا تذکرہ ہے۔ سترھویں صدی کے آئزک والٹن کے ذکر کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر، جوزف ایڈیسن اور رچرڈ سٹیل کا تذکرہ کرتے ہیں، جن کی مضمون نگاری سے سر سید نے متاثر ہو کر اُردو میں انشائیے کی بنیاد رکھی۔ مغربی تاریخ میں جانسن، گولڈسمتھ چارلیس لیمب بھی مصدقہ انشائیہ نگار ہیں جنھوں نے وزیر آغا کو متاثر کیا۔

انشائیہ ایک وجودی رویے کا آہنگ ہے، جو زندگی کے پیچیدہ معاشی، معاشرتی تضادات اور مفادات کے تصادم میں اپنی طبقاتی کمزوریوں، شکستوں، حرماں نصیبیوں پر فتح پانے کی خواہش کا عکس ہوتا ہے۔ یہ بہت جدید صنف ادب ہے اور بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

''یوں دیکھیں تو انشائیہ کی مقصدیت (دیگر اصناف کی مقصدیت کے مانند)
کمٹمنٹ کا مسئلہ بن جاتی ہے اور بے مقصد انشائیہ نویس حضرات کو یہی منظور نہیں
کیوں کہ ہر نقطہء نظر کسی نہ کسی مرحلے پر کوئی نہ کوئی قربانی ضرور طلب کرتا ہے۔''
(ص ۳۳۸)

جوش کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین

یہ کتاب ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔ جس میں چودہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ جوش کا نفسیاتی مطالعہ ۲۔ انا الحق ۳۔ کیا جنوں کر گیا شعور کے ساتھ ۴۔ مجید امجد کی غزل کا روپ سروپ ۵۔ اپنی لگن اور اپنی جلن اور اپنی چبھن کی مستی میں ۶۔ ادب اور لوک ادب: نفسیاتی تناظر ۷۔ مرثیہ: عہد بہ عہد ۸۔ حالی کی دکان ۹۔ پاکستانی ادیب کی ذمہ داری ۱۰۔ سائنسی معاشرے میں ادب ۱۱۔ کیا آج نیاز فتح پوری کی ضرورت ہے؟ ۱۲۔ مولانا ظفر علی خان بطور مترجم ۱۳۔ تخلیقی تعطل ۱۴۔ عقلی رویے اور مسلمان

جوش کا نفسیاتی مطالعہ، کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ، مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب فلسفہء الٰہیات،

حالی کی دکان، پاکستانی ادیب کی ذمہ داری اور عقلی رویے اور مسلمان، مصنف کے ان تخلیقی محرکات کے آئینہ دار ہیں جو انحراف، ترقی اور ثابت قدمی کے احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کتاب میں جدید شاعروں مجید امجد اور جمیل الدین عالی کی شاعری پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی نظریات کو آگے بڑھاتا ہوا مضمون تخلیقی تعطل ایک مجموعی صورتِ حال ہے:

''تخلیق اور تخلیقی تعطل کے ضمن میں بنیادی اہمیت کا یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ تخلیقی ترقی یا تخلیقی تعطل کی پیمائش کے لیے تخلیق اور محض تحریر میں امتیاز لازم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تخلیق میں تعطل ہوسکتا ہے لیکن لکھنے کے عمل میں نہیں۔ حتیٰ کہ تخلیقی تعطل کے عہد میں بھی تحریریں معرضِ وجود میں آتی رہتی ہیں۔''

(ص ۱۷۹، جوش کا نفسیاتی مطالعہ)

ادب اور لوک ادب، نفسیاتی تناظر میں تخلیق، لمحہ، حال، تاریخی اور ثقافتی ورثے، فنی اقدار، زبان، اساطیر، جادو اور لوک ورثہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید (تنقیدی کلیات)

۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی یہ کتاب ۱۰۰۷ صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب ناشر نے اپنی سہولت سے آٹھ موضوعات میں تقسیم کی ہے اور اس میں بیشتر مضامین وہی ہیں جو پہلی کتب میں شامل رہے، موضوعات کی تفصیل اس طرح ہے۔

باب اول۔

ا۔ ادب اور تخلیقی لاشعور ۲۔ ادب نرگسیت کے آئینے میں ۳۔ ادب اور فحاشی ۴۔ ادب اور ابلاغ ۵۔ ادب اور فنون لطیفہ

باب دوم۔

ا۔ تخلیق، تخلیق کار اور جنون ۲۔ تخلیق، تخلیقی عمل اور وجدان ۳۔ علامت کا جنم ۴۔ دھرتی، برگد، آنچل

باب سوم۔

صنف ا۔ غزل تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ ۲۔ غزل اور رومانی طرزِ احساس ۳۔ شاعری میں زنانہ پن کی مثال: ریختی ۴۔ مرثیہ اور کیتھارسس ۵۔ افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ۔

باب چہارم۔

افسانہ۔ا۔زیوس سے امیر حمزہ تک ۲۔باغ و بہار کے درویش عاشق ۳۔اُردو کا پہلا جنسی افسانہ ۴۔اُردو افسانہ میں عورت ۵۔افسانہ: حقیقت سے علامت تک۔

باب پنجم۔

تنقید۔ ا۔ سماجی محرکات کی تلاش۔ عمرانی تنقید ۲۔ الہامی سرچشموں کی تلاش: رومانی تنقید ۳۔تاثرات کی تخلیق نو: تاثراتی تنقید ۴۔حسن اور حسن کاری کا مطالعہ: جمالیاتی تنقید ۵۔تخلیقات اور جدلیاتی معیار: مارکسی تنقید ۶۔لاشعوری محرکات کی طلم کاری: نفسیاتی تنقید ۷۔تخلیق کے داخلی نظام کا مطالعہ: ساختیاتی تنقید۔

باب ششم۔

شخصیت: ا۔مرزا رسوا کا نظریہء ناول نگاری ۲۔معتدل گرمئی گفتار کا شاعر۔فیض ۳۔شعر مرا ایران گیا ۴۔جسم یار کی خوبی اور گناہ گار صالح۔

باب ہفتم۔

اقبال: ا۔اقبال کا نفسیاتی مطالعہ ۲۔اقبال کا تنقیدی شعور ۳۔اقبال کا لسانی شعور ۴۔تو شب آفریدی، چراغ آفریدم ۵۔حالی اور اقبال کے مقامات۔فغان ۶۔غزل میں نئی جہت ۷۔اقبال کی نثر کا مزاج ۸۔علم الاقتصاد: تجزیاتی مطالعہ ۹۔نقد اقبال کا تجزیاتی مطالعہ ۱۰۔اقبال اور ہمارے فکری رویے ۱۱۔اقبال: ممدوحِ عالم ۱۲۔عظمت اقبال کا معترف: ہربرٹ ریڈ۔

باب ہشتم۔

غالب: ا۔شعور اور لاشعور کا شاعر: غالب ۲۔غالب خطوط کے آئینے میں ۳۔غالب کی نرگسیت ۴۔مرد عاشق کی مثال: غالب ۵۔غالب کی شاعری میں جنس ۶۔غالب: آتش زیر پا

یہ کتاب ماضی کے ادراکی تجربات کا آئینہ ہے۔ نئے موضوعات اور پرانے مباحث نئی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ حسرت کی شاعری پر مضمون ''جسم یار کی خوبی اور گناہ گار صالح'' اس کتاب میں نیا اضافہ ہے۔ بقول سلیم اختر:

> ''حسرت کی طبیعت کے طرزِ تماشہ کو محض ''مشقِ سخن اور چکی کی مشقت'' نے ہی قابو میں نہیں رکھا، بل کہ اور بھی وجوہات ہوں گی کیوں کہ شخصیت کی ان متضاد خصوصیات کے باوجود حسرت نے ایک متوازن اور نارمل انسان کی زندگی

بسر کی۔"

"حسرت تصوف تک پہنچے لیکن عشقیہ جذبات کی صورت میں بہت بڑی قیمت ادا کر کے فاسقانہ شاعری کی لذت خود پر حرام کر کے اور مجازی عشق کی صداقت سے منہ موڑ کر، اگر حسرت نے صرف خود کو عاشقانہ (فاسقانہ) شاعری تک محدود رکھا ہوتا تو اپنے رچے ہوئے مذاق سخن اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر یبوست زدہ اُردو غزل کو جنسی شاعری کی صورت میں ایک نئی جہت سے روشناس کرانے کا سہرا بندھتا اور آج ان کا نام فراق کے نام کے ساتھ لیا جا سکتا۔ لیکن تصوف نے کہیں کا نہیں رکھا۔ شاعری میں وہ درد نہ بن سکے، عملی زندگی میں کیا انھیں روحانی حظ حاصل ہوا یا عرفان؟ میرے خیال میں تو کچھ بھی نہ ملا۔۔۔ گناہگار بننا ہی بہت مشکل ہے چہ جائے کہ گنہگار صالح۔" (۱۰۶ تخلیق، تخلیقی شخصیات)

دھرتی، برگد، آنچل کے عنوان سے انسانی زندگی، معاشرے اور خاندان میں ماں کے رول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بقول سلیم اختر:

"انسانی زندگی میں ماں کی اہمیت واضح کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے اگر شعری تلازمات، امیجز میں اس کے رنگ افروز پیکر ملتے ہیں تو یہ باعث تعجب نہیں، جدید نظم میں ماں کی پیش کش پر مبنی اس جائزہ سے یہ امورِ خاص واضح ہوتے ہیں۔ شعراء نے بچہ بن کر ماں سے جذبات کی جس سطح سے خطاب کیا ہے وہ ذاتی اور نجی ہونے کے باوجود آفاقیت کی حامل ہے۔ یہ نکتہ بالخصوص ان نظموں سے مترشح ہوتا ہے، جہاں ماں کی المناک موت کا نجی حادثہ تخلیقی محرک کا کام دیتا ہے اور برگد یا شجر کی علامت سے اظہار پاتا ہے۔ یہ ذاتی غم کا کیتھارس تو ہے لیکن فن کی اس سطح سے دیگر افراد بھی اسی تجربے کے نفسی فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔" (ص ۲۰۱۔۲۰۰)

معتدل گرمئی گفتار کا غزل گو، فیض، کے عنوان سے مضمون فیض کے لب و لہجے اور جذباتی اعتدال کا

احاطہ کرتا ہے۔ یہ ایک محتاط مضمون ہے۔ بقول سلیم اختر:

''فیض کی غزل کی اساسی صفت ان کا انقلابی نعرہ نہیں بل کہ وہ شاعرانہ لہجہ ہے جس سے وہ انقلابی نعرہ کو کیموفلاج کرتے ہیں اور تغزل کا وہ آہنگ ہے، جس سے وہ تلخ حقائق کی کرختگی کو ملائم کرتے ہیں، عشق کی طرح انقلاب بھی ایک بخار بل کہ بعض صورتوں میں تو ایسا متعدی بخار ہے کہ اظہار نہ پائے تو فرد اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہے۔ یہ احساس زیادہ شدید ہو تو المعیاب کے جنون پر منتج ہوتا ہے، اسی سے عام صلاحیتوں اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں والے فن کاروں میں امتیاز ہوتا ہے۔ فیض کی غزل میں سکون اور بلند سطحی کا ادراک ہے۔'' (۵۵۷)

اس کتاب میں شامل اقبال اور غالب کے موضوع پر علاحدہ بحث کی جائے گی۔

داستان اور ناول: تنقیدی مطالعہ

داستان اور ناول۔ تنقیدی مطالعہ، اسے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا گیا۔ کتاب کے فلیپ پر اشاعتی ادارے کی جانب سے لکھا گیا ہے:

''فکشن کی تنقید کے حوالے سے مقالات کے دو مجموعے اکٹھے شائع کیے جا رہے ہیں۔ یہ ہیں داستان اور ناول۔ تنقیدی مطالعہ اور افسانہ اور افسانہ نگار۔ تنقیدی مطالعہ، ان کتابوں میں معاصر فکشن کا جدید تنقیدی اصولوں کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں فکشن کے فن سے وابستہ بنیادی مسائل کے تجزیاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ بعض معروف ناول نگاروں اور جدید افسانہ کی اہم شخصیات کے فن کا بھی محاکمہ کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ دونوں کتابیں ''کل'' کے تناظر میں ''آج'' کی فکشن کا منظر نامہ اجاگر کرتی ہے۔''

کتاب میں بارہ مضامین شامل ہیں: ۱۔ فکشن کی تنقید: مسائل اور مشکلات ۲۔ زیوس سے امیر حمزہ تک ۳۔ باغ و بہار، تحقیق و تنقید ۴۔ باغ و بہار کے درویش عاشق ۵۔ کچھ نذیر احمد کے بارے میں ۶۔ مرزا رسوا کا نظریہء ناول نگاری ۷۔ ناول: پس منظر اور پیش منظر ۸۔ ناول، ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ ۹۔ بے جڑ لوگوں کی بستی ۱۰۔ جمیلہ ہاشمی رومان سے تصوف تک ۱۱۔ زمین ۱۲۔ خدیجہ مستور

کے انتقال کے بعد شائع ہونے والا ناول۔

زیادہ تر موضوعات اور تخلیقات دیگر مجموعوں میں بھی شامل ہیں البتہ ناولوں کا مطالعہ نیا اضافہ ہے۔

فکشن کی تنقید: مسائل اور مشکلات والا مضمون بھی نیا، جامع اور تجزیاتی ہے۔ مصنف نے فکشن کے نقاد کی جن مشکلات کی جانب اشارہ دیا ہے، وہ کچھ اس طرح ہیں:

الف۔ بدلتے ہوئے موسم، متغیر رجحانات، مسلّمات سے انحراف، تجربات اور بغاوت کے نام پر زندگی اور ادب کی تبدیلی۔

ب۔ فکشن میں تغیر کی وضاحت کے لیے ناقدین کے پاس موزوں الفاظ و اصطلاحات کی کمی

ج۔ اصطلاحات کے علاوہ متبادل اور جامع الفاظ کی عدم موجودگی

د۔ جدید نفسیات کے مباحث کا بلا سوچے سمجھے استعمال، لاشعور، تحت الشعور، شعور کی رو، فنٹیسی، آزاد تلازمہ، احساس کمتری اور احساس برتری جیسی اصطلاحات کا بے دریغ استعمال۔

س۔ کہانی، افسانہ اور کہانی پن کے مباحث۔ بقول سلیم اختر:

> ''آج کے افسانہ نگار نے کہانی سے قطع تعلق کر لینے کے بعد اپنے لیے نئی دنیا کی تشکیل تو کی لیکن علامتوں کی تلاش میں وہ غیر شعوری طور پر داستان کے قریب ہو گیا۔ یوں وہ جدید ہونے کے باوجود بھی (علامت کی حد تک) قدیم ہی کی توسیع ہے۔''

ناول: پس منظر، پیش منظر، میں جدید اُردو ناولوں کا تذکرہ موجود ہے، جن میں: بستی، دیوار کے پیچھے، خوشیوں کا باغ، رات کا سورج کے علاوہ حجاب امتیاز علی تاج کے 'پاگل خانہ' کا بھی تذکرہ ہے۔ سلیم اختر نے لکھا ہے:

> ''پاگل خانہ'' عالمی امن کے لیے ایک اپیل کی حیثیت رکھتا ہے لیکن حجاب امتیاز کا رومانی اسلوب اسے لے ڈوبا اور یوں یہ ناول ایک جاندار تحریر کے برعکس ان کے نصف صدی قبل کے افسانوں کی توسیع بن گیا۔'' (ص ۱۲۳)

سلیم اختر ناول کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ بقول ان کے ''ہرڈل ریس ختم ہو رہی ہے اور اب ناول فن بلندی چھو لینے کو ہے۔'' ''بے جڑ لوگوں کی بستی'' انتظار حسین کے ناول بستی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ بقول مصنف:

> ''بستی اسی زمین کا ناول ہے جس سے ماں کی گود جیسی کشادگی اور محبوبہ کی آغوش

جیسی نرمی کی توقع میں جڑ سے اکھڑے پودے تناور درخت بننے کی تمنا لیے آئے
انھیں عبادت برق کی کرنی پڑی اور یوں افسوس حاصل کا، ان کا مقدر قرار پایا۔
انتظار حسین کے سب کردار اسی صورت حال کا شکار ہیں۔'' (ص ۱۴۰)

جمیلہ ہاشمی کے دشتِ سوس اور خدیجہ مستور کے انتقال کے بعد شائع ہونے والے ناول زمین کا بھی اچھا محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ بقول سلیم اختر:

''زمین'' کا تخلیق محرک خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو بلحاظ موضوع اسے 'آنگن' کی توسیع قرار دیا جاسکتا ہے۔

افسانہ اور افسانہ نگار

تنقیدی مطالعہ کا سن اشاعت بھی ۱۹۹۱ء، کتاب کے پانچ بنیادی موضوعات ہیں اور پھر ان سے نئے مباحث جڑے ہوئے ہیں۔ کچھ مضامین پہلے کے مجموعوں میں بھی شامل ہیں، موضوعات کی تفصیل اس طرح ہے:

ا: مطالعہ

۱۔ افسانوی تکنیک کا نفسیاتی مطالعہ ۲۔ ادب اور عصری آگہی، افسانہ ۳۔ اُردو افسانے کی جہات ۴۔ جدید افسانہ

ب: تجزیہ

۱۔ اُردو افسانہ: نقوش کے آئینہ میں ۲۔ اُردو کا پہلا جنسی افسانہ ۳۔ اُردو افسانے میں عورت

ج: منٹو

۱۔ منفی سے اثبات کی طرف مراجعت ۲۔ بغاوت کا استعارہ

د: جائزہ

۱۔ افسانہ مغرب میں ۲۔ کچھ جدید ایرانی افسانے کے بارے میں

تنوع:

۱۔ نیلا پتھر ۲۔ غلام عباس کے مرد و زن ۳۔ ٹھنڈا میٹھا پانی کی عورتیں ۴۔ خالص ذاتی آج کا افسانہ نگار مسعود اشعر ۵۔ ڈاکٹر آغا سہیل: حقیقت سے علامت تک ۶۔ عرش صدیقی کے افسانے ۷۔ گمشدہ کلمات کی سوغات

افسانہ مغرب میں اور جدید ایرانی افسانے، نئے مطالعاتی آفاق تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔ تنوع کے ضمن میں انفرادی مطالعے جدید اُردو افسانے کا ذاتی اور دوستانہ مطالعہ ہیں۔ عرش صدیقی کی کتاب "باہر کفن سے پاؤں" کے افسانے زندگی کی تفہیم کے افسانے ہیں۔

تین بڑے نفسیات دان

یہ کتاب ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے تین بنیادی ابواب ذیلی مضامین میں منقسم ہیں:

۱۔ سگمنڈ فرائیڈ:

۱۔ فرائیڈ: ایک عظیم انسان ۲۔ فرائیڈ نفسیاتی مطالعہ ۳۔ نظریات ۴۔ جنس کی اہمیت ۵۔ نظریہء خواب ۶۔ تحلیلِ نفسی

۲۔ کارل گستاؤ ژونگ۔

۱۔ کارل گستاؤ ژونگ۔ ایک خاکہ ۲۔ نظریہ لاشعور ۳۔ ثواب ۴۔ نفس

۳۔ الفرائیڈ ایڈلر۔

۱۔ الفریڈ ایڈلر: ایک مطالعہ ۲۔ انفرادی نفسیات: ایک تعارف ۳۔ شخصیت کی تکمیل ۴۔ بچے کی نشو ونما ۵۔ اعصابیت ۶۔ نظریہء جنس ۷۔ خواب

ڈاکٹر سلیم کے نظریہ تنقید کی اساس سمجھنے کے لیے یہ ایک بنیادی کتاب ہے، جس میں کم وبیش وہ تمام اصطلاحات اور اشارے موجود ہیں جو انسانوں کو سمجھنے اور ان کے الجھاؤوں کا حل تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک لحاظ سے اس کتاب کو نفسیاتی تنقید کی بنیاد کہا جاسکتا ہے۔ ناشر نے اسے اپنی سہولت کے لیے سلیم اختر کی جنسیاتی تحریروں کے زمرے میں رکھا ہے۔

فرائیڈ کے زمرے میں: تحلیل نفسی، شعور اور لاشعور کی کشمکش، تعبیر خواب، شعور کی رو، حیات، ایڈ، انا اور فوق الانا، جنس، جذبات، عنیت اور افلاطونی محبت، طفلانہ جنسیت، ایڈی میں الجھاؤ، آبائی الجھاؤ، مثبت اور منفی رویے، جنسی جبلت، خود جنسیت، ہم جنسیت، دباؤ، مراجعت، انتقال کجروی، ارتفاع اور نظریہء خواب کے مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے:

> "فرائیڈ اس نظریے کو مسترد کرتا ہے کہ خواب ایک جسمانی عمل ہے وہ اسے ایک ذہنی وقوعہ قرار دیتے ہوئے خالص نفسیاتی اصولوں پر اس کی تشریح کرتا ہے۔"
>
> (ص ۹۴)

فرائیڈ خواب کی تین انواع بیان کرتا ہے: ۱۔ تمنائی خواب ۲۔ تشویشی خواب ۳۔ تعزیراتی خواب اس کے طریقہء تحلیل نفسی سے تلازمی اور خوابی طریقوں پر روشنی پڑتی ہے۔

کارل گستاوُ ژنگ ابتدا میں فرائیڈ کے نظریات سے متاثر تھا ازاں بعد وہ مذہبی جذبات کی طرف مائل ہوا اس کی تحریروں میں رچی ہوئی گہری علمیت کی وجہ سے بعض اوقات عوام کے لیے اسے سمجھنا مشکل ہے۔ اس لیے اسے عوام میں مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اس کا نظریہ، لاشعور، ذاتی لاشعور، اجتماعی لاشعور، اساسی نقوش، اشاریت، تلازمات، الجھاوٗ ڈاکٹر سلیم اختر کے پسندیدہ موضوعات ہیں، ژنگ نے خوابوں کے مطالعہ، کار پر، بہت محنت کی، موضوع اور معروض کے اعتبار سے ان کے داخلی اور خارجی معنی مرتب کیے، ژنگ انسانی نفس، شخصیت کے نقش و نگار، انیما اور انمیس، یعنی مردانہ اور زنانہ خصوصیات کی مخالف جنس میں موجودگی پر زور دیتا ہے۔ بقول اس کے:

''ذات مقصودِ حیات ہے۔ یہ تو انفرادیت کے مکمل اظہار کا نام ہے۔''

ژنگ کے ہاں حواس خمسہ، سوچ اور فکر، احساس، باطن بینی، ظاہر بینی کے مباحث بھی موجود ہیں۔ الفریڈ ایڈلر نے شخصیت کی تشکیل کے لیے عضوی کمتری، عضوی زبان، احساس کمتری، عقائد و نظریات، سماجی حیثیت، ذہنی تحریک، راہنما مفروضے، اندازِ زیست، احتجاجِ مردانگی، اعصابیت برتری الجھاوٗ، نیوراتیت اور نظریہ جنس کے معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ خوابوں کو ایک پل سمجھتا ہے جو خواب دیکھنے والے اور اس کے مقصد حیات کو ملانے کا کام کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے آسان زبان میں ان خیالات کو پیش کیا ہے اور اپنی تحریروں میں ان سے استفادہ کیا ہے۔

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہ کتاب ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ مواد کے اعتبار سے یہ ایک مبسوط کتاب ہے۔ جس میں کم و بیش ایک سو سولہ مضامین ہیں۔ اس کے لیے مختلف عنوانات کا انتخاب کیا گیا۔ مضامین کی تفصیل اس طرح ہے۔

شاعری:

۱۔ نرگس کا ایک پھول کھلا تھا (ناصر کاظمی کی یاد میں) ۲۔ قتیل شفائی: شخصیت اور فن کا پیراہن ۳۔ اپنی خوشبو میں گم (منیر نیازی) ۴۔ مرقع جمال کا مصور (ڈاکٹر صفدر حسین) ۵۔ منور لکھنوی: غزل کے آئینے میں ۶۔ آئینہ خانہ (اختر حسین جعفری) ۷۔ شیر افضل جعفری ہے منفرد شاعر ۸۔ خوشبو کا سفر (عبیداللہ علیم) ۹۔ سخن (حسن اکبر کمال) ۱۰۔ خزاں میرا موسم (حسن اکبر کمال) ۱۱۔ گریزاں (جمیل یوسف) ۱۲۔ ڈوبتے چاند کا منظر دیکھنے والا شاعر (ناصر زیدی) ۱۳۔ شاعر: سرحد ادراک پر (ذوالفقار احمد تابش) ۱۴۔ ریت پر سویا ہوا طوفان (مختار کریمی) ۱۵۔ کلام بابا فرید (مترجم عبدالمجید بھٹی) ۱۶۔ دیوان (شاہ لکھنوی) ۱۷۔ میں اُردو ہوں (مشکور حسین یاد) ۱۸۔ زنجیر جمال

(سہیل بنارسی) ۱۹۔ آخری نظمیں (راجہ مہدی علی خان)۔
حصہ دوم۔

۲۰۔ دیوانِ نصرتی (نصرتی بے جاپوری) ۲۱۔ دیوان غالب (نسخہء حمید) ۲۲۔ اُردوئے معلی ۲۳۔ مسدسِ حالی ۲۴۔ مرے خدا مرے دل (مجید امجد) ۲۵۔ بدن دریدہ (فہمیدہ ریاض) ۲۶۔ پرانے موسموں کی آواز (کمار پاشی) ۲۷۔ چاندی اساڑھ کی (راج نرائن راز) ۲۸۔ مفہوم زمانہ (مشکور حسین یاد) ۲۹۔ شامِ صحرا (حمید جالندھری) ۳۰۔ جلتے لمحے (اکبر کاظمی) ۳۱۔ شاخِ نہالِ غم (انوار انجم) ۳۲۔ ارمغان عقیدت (منظور حسین منظور) ۳۳۔ کاسہء دل (سہیل اختر) ۳۴۔ انقلابِ نو (عبدالرشید تبسم) ۳۵۔ منظوماتِ رعنا (رعنا اکبرآبادی) ۳۶۔ رنگِ شفق (سرور بانہالی) ۳۷۔ دریچہء سحر (جاوید ہوشیار پوری) ۳۸۔ حرف سپاس (رحمٰن کیانی) ۳۹۔ خونِ رگ جاں (ریاض حسین چودہری) ۴۰۔ ۱۹۶۹ء کی بہترین شاعری (مرتب، حفیظ صدیقی) ۴۱۔ قابل نمبر (محمد حسین قریشی) ۴۲۔ ایوب صابر کی بیاض شعر۔
فکشن:

۴۳۔ خیالستان (سجاد حیدر یلدرم) ۴۴۔ کپاس کا پھول (احمد ندیم قاسمی) ۴۵۔ صحرانورد کے خطوط (میرزا ادیب) ۴۶۔ کھلونے (مسعود مفتی) ۴۷۔ انگلیاں فگار اپنی (اختر جمال) ۴۸۔ بدلتا ہے رنگ آسمان (آغا سہیل) ۴۹۔ خلا اندر خلا (محمد منشا یاد) ۵۰۔ دوغنڈے، دیدہء حیران (مظفر حنفی) ۵۱۔ پھول پتھر (میمونہ انصاری) ۵۲۔ عزیز خان کا قتل (ذوالفقار غوث) ۵۳۔ نشیمن (صادق الخیری) ۵۴۔ پیاس کا دریا (رحیم گل) ۵۵۔ فاختہ (مستنصر حسین تارڑ) ۵۶۔ لہو لہو مٹی (آغا اشرف) ۵۶۔ حقیقت یا فریب (عبدالرشید تبسم) ۵۷۔ تنکے کی ناؤ (سہراب اسلم) ۵۸۔ اجنبی شہر میں (محمد تقی) ۵۹۔ جدید اُردو افسانہ (شہزاد منظر)
تنقید:

۶۰۔ تاریخ ادب اُردو (ڈاکٹر جمیل جالبی) ۶۱۔ غالب: لائف اینڈ لیٹرز (رالف رسل مترجم خورشید الاسلام) ۶۲۔ لفظ و معنی (شمس الرحمان فاروقی) ۶۳۔ اُردو کی منظوم داستانیں (ڈاکٹر فرمان فتح پوری) ۶۴۔ اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری (ڈاکٹر فرمان فتح پوری) ۶۵۔ زبان اور اُردو زبان (ڈاکٹر فرمان فتح پوری) ۶۶۔ تذکرہ مسرت افزا (ابوالحسن امیر الدین) ۶۷۔ مصنفین اُردو (سید زوار حسین زیدی) ۶۸۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (مرتب مشفق خواجہ) ۶۹۔ اُردو کی تین مثنویاں (پروفیسر خان رشید) ۷۰۔ کلیات گارساں دتاسی (اشاعت انجمن ترقی اُردو) ۷۱۔ کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی (انشاءاللہ خان انشا مقدمہ سید قدرت نقوی) ۷۲۔ اقبال کا علم الکلام (سید علی

عباس جلال پوری) ۷۳۔ کارنامہ انیس (ڈاکٹر سید صفدر حسین، مرتب) ۷۴۔ امکانات (عارف عبدالمتین) ۷۵۔ تعصبات (فتح محمد ملک) ۷۶۔ نیا شعری افق (انیس ناگی) ۷۷۔ نیا ادب (رشید امجد) ۷۸۔ ملتان میں اُردو شاعری (ڈاکٹر طاہر تونسوی) ۷۹۔ اُردو گیت (بسم اللہ نیاز احمد) ۸۰۔ متاع لوح و قلم (فیض احمد فیض مرتبہ مرزا ظفر الحسن) ۸۱۔ تذکیر و تانیث (احسان دانش) ۸۲۔ جمالیات۔ قرآن حکیم کی روشنی میں (ڈاکٹر نصیر احمد ناصر) ۸۳۔ نکتہ ءراز (شان الحق حقی) ۸۴۔ غالب اور انقلاب ستاون (ڈاکٹر سید حسین الرحمٰن) ۸۵۔ بلوچستان میں فارسی شاعری (ڈاکٹر انعام الحق کوثر) ۸۶۔ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ (ڈاکٹر محمد صدیق شبلی و ڈاکٹر محمد ریاض) ۸۷۔ سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقا (سید معراج میر) ۸۸۔ اصطلاحات سیاسیات (پنجاب یونیورسٹی) ۸۹۔ آزادی دے مجاہد لکھاری (ڈاکٹر شہباز ملک)

شخصیت:

۹۰۔ خوشحال شناسی (زیتون بانو رتاج سعید) ۹۱۔ رئیس احمد جعفری 'شخصیت وفن' (مرتبہ رئیس احمد جعفری اکیڈمی) ۹۲۔ کرو چے کی سرگزشت (مترجم محمد علی صدیقی) ۹۳۔ روشنیوں کا مسافر (میرزا ادیب خودنوشت مٹی کا دیا) ۹۴۔ مکرم (محمد طفیل) ۹۵۔ محبی (محمد طفیل) ۹۶۔ راہ سراب کے تنہا مسافر (ڈاکٹر احراز نقوی)

ڈرامہ:

۹۷۔ شیشے کی دیوار (میرزا ادیب) ۹۸۔ پس پردہ (میرزا ادیب) ۹۹۔ فیصل شب (میرزا ادیب)

طنز و مزاح:

۱۰۰۔ افکار پریشاں (جسٹس ایم آر کیانی) ۱۰۱۔ دشنام کے آئینے میں (مشکور حسین یاد) ۱۰۲۔ جوہر اندیشہ (مشکور حسین یاد) ۱۰۳۔ بیگم کی ڈائری (بیگم سعیدہ مشکور)

سفرنامہ:

۱۰۴۔ اندلس میں اجنبی (مستنصر حسین تارڑ) ۱۰۵۔ دیس بدیس (جی الانہ)

کلچر:

۱۰۶۔ مسلمان کلچر (انگریزی) (وی وی بارٹولڈ) ۱۰۷۔ پاکستانی کلچر (ڈاکٹر جمیل جالبی)

تاریخ:

۱۰۸۔ ماضی کے مزار (سید سبط حسن) ۱۰۹۔ شاہجہاں نامہ (محمد صالح کنبوہ ترجمہ ڈاکٹر ناظر) ۱۱۰۔ تاریخ پنجاب (اقبال صلاح الدین) ۱۱۱۔ راول دیس (عزیز ملک)

نصاب:

۱۱۲۔ مرقع ادب پر ایک نظر ۱۱۳۔ اقبال اور عطیہ (عبدالعزیز خالد) ۱۱۴۔ ارمغانِ آزاد (ابوسلمان شاہ جہان پوری)

''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے''

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی نے کتابیات ادب اُردو کے سلسلے میں چوتھے نمبر پر شائع کی، جس کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ اس کتاب کے مضامین مختصر ہیں اور زیادہ تر کتابوں کی رونمائی، مصنفین کی فرمائش یا تنقیدی جائزے کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ ان ایک سو سولہ مضامین میں ایسی کئی کتابیں ہیں جو آنے والے ادوار میں خود ایک سنگِ میل ثابت ہوئیں، تاہم مختصر نویسی کے باوجود مصنف نے اپنے نظریات اور رائے کو مدلل طریقے سے بیان کیا ہے:

''مجید امجد تمام عمر ادیبوں کے گڑھ لاہور سے دور رہا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ وہ پبلک ریلیشنگ کے فن سے ناواقف ہوگا یا پھر سرے سے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا ہوگا۔ میری دانست میں موخرالذکر وجہ قرین قیاس ہے تمام عمر وہ ''انجمن انجمن رہا تنہا'' کی تفسیر بنا رہا ہے لیکن مرا تو ہر انجمن میں اپنا تذکرہ چھوڑ گیا۔'' (مرے خدا مرے دل ص ۱۳۹)

''شخصیات اور بالخصوص معاصرین کے بارے میں اظہار رائے سے جو امر مانع رکھتا ہے وہ فسادِ خلق کا خوف ہے۔۔ اب تک ڈاکٹر جمیل جالبی نے دنیائے نقد میں اک مردِ شریف کے طور پر زندگی بسر کی ہے اور تاریخ ادب اُردو کی مطبوعہ دو جلدوں سے ابھی کسی کا پیمانہ انا ٹکرایا نہیں، لیکن چوتھی جلد میں جب وہ پاکستان میں ادب اور ادیبوں پر قلم اٹھائیں گے تو پھر ان سے حالِ دل دریافت کروں گا۔'' (ص ۲۶۱ تاریخ ادب اُردو)

''مستنصر حسین تارڑ سفرنامہ کو محض خوبصورت اسلوب اور خوب صورت لڑکیوں تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ وہ ہوم ورک کا بھی قائل ہے، چنانچہ اندلس کے مختلف

شہروں، تاریخی عمارات اور مسلم کلچر کے سلسلے میں اس نے قدم قدم پر مستند تاریخی حوالے اور شہادتیں بھی بہم پہنچائی ہیں جس کے نتیجے میں پیغمبر نامہ ایک ملک کا نہیں تاریخ کے دو دوروں کا سفرنامہ بن جاتا ہے۔''

(اندلس میں اجنبی ص ۴۵۳)

یہ کتاب ڈاکٹر سلیم کے دوستوں کی تعداد اور پڑھنے کی رفتار کا پیمانہ ہے اور ان کے ادبی و تاریخی و شخصی شعور کا آئینہ کتاب کمیاب ہے۔

مغرب میں نفسیاتی تنقید

یہ کتاب ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے تین ابواب ہیں جنھیں ذیلی موضوعات سے سجایا گیا ہے:

۱۔ لاشعور:

۱۔ فرائیڈ اور ادب ۲۔ تخلیق کی تحلیل نفسی ۳۔ مغرب کے نفسیاتی ناقدین ۴۔ ہملٹ کی تحلیل نفسی اور ارنسٹ جونز ۵۔ تخلیقی لاشعور اور ہانس شاس ۶۔ تخلیق کار کی مریضانہ شخصیت اور ایڈمنڈ ولسن ۷۔ معتدل مزاج نفسیاتی نقاد: لائنل ٹرلنگ ۸۔ نفسیات اور فلسفہ کی آمیزش: کینتھ برک۔

۲۔ اجتماعی لاشعور:

ژونگ اور تحلیلی نفسیات۔ اجتماعی لاشعور، لاشعور کے بنیادی سانچے، علامات کی نفسی اہمیت

۳۔ نختمثالی تنقید:

نفسیاتی تنقید میں توازن کی مثال۔ ہربرٹ ایڈ، شاعری میں نختمثال کا سراغ۔ ماڈ باڈکن

۴۔ اثر پذیری:

علوم و نفسیات: جمالیات اور نفسیات، اخلاقیات اور نفسیات، لسانیات اور نفسیات، وجودیت اور نفسیات۔

۵۔ گیسٹالٹ نفسیات اور تخلیق

۶۔ تراجم اصطلاحات

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

''جب ۱۹۷۸ء میں ''اردو تنقید کا نفسیاتی دبستان'' کے موضوع پر مجھے پنجاب

یونیورسٹی سے ڈگری مل گئی تو یہ تحقیقی مقالہ مجلس ترقی ادب کو بغرض اشاعت پیش کر دیا گیا۔ مجلس نے اسے اشاعت کے لیے منظور تو کر لیا مگر محدود فنڈز کی بنا پر مجلس کے لیے مکمل صورت میں مقالہ کی اشاعت ممکن نہیں تھی۔ لہٰذا مقالہ سے سو ڈیڑھ سو صفحات کا مواد نکال دیا گیا۔ میرے لیے مقالے کی ایڈیٹنگ آسان نہ تھی۔ اس لیے عبارت کی کانٹ چھانٹ کے برعکس بعض شخصیات، موضوعات اور مسائل پر ایسے مکمل اجزا چن لیے جو اپنی مکمل صورت میں جداگانہ مضمون کا انداز رکھتے تھے، اس ضمن میں البتہ یہ کوشش ضرور کی کہ یہ اجزا یورپ کے حوالے سے ہوں تاکہ اُردو میں نفسیاتی تنقید کی روایت کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔''

(ص ۷، مغرب میں نفسیاتی تنقید)

چناں چہ نفسیاتی تنقید اور مغرب میں نفسیاتی تنقید ایک ہی تصویر کا تسلسل ہیں کتاب کے مضامین دلچسپ اور معلومات افزا ہیں جو مصنف کے بنیادی نظریہ تنقید کو اعتبار بخشتے ہیں۔ علوم اور نفسیات کے ابواب خیال انگیز ہیں خاص طور پر لسانیات اور نفسیات:

''لفظ اصوات کا مجموعہ ہے اور ان اصوات کی ادائیگی پیچیدہ نظام عصبی کی کارکردگی کی مرہون منت ہے۔ لفظ کے نفسیاتی مفہوم کے ضمن میں یہ واضح رہے کہ اگر ایک طرف یہ مخصوص نوع کی بعض اصوات سے ترکیب پاتا ہے تو دوسری طرف یہ مادی اشیاء اور مجرد تصورات کے لیے بھی ایک علامت ہے، لفظ کی ادائیگی میں دونوں امور بیک وقت کارفرما ہوتے ہیں۔''

مجموعہ تحقیق وتنقید

یہ کتاب ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی اور تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید کی طرح اسے بھی سلیم اختر کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے کلیات کی حیثیت حاصل ہے۔

اقبال کی فکری میراث اور ڈاکٹر سلیم اختر

اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کے بارے میں اقبال شناسوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں اقبال کے مطالعے پر مبنی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں، جن میں موصوف کی زندگی اور شاعری کی ہمہ رنگی پر روشنی ڈالی گئی، اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر کی پہلی کتاب ''اقبال کا نفسیاتی مطالعہ'' تھی۔

اقبال کا نفسیاتی مطالعہ

یہ کتاب مکتبہء عالیہ نے ۱۹۷۷ء میں شائع کی، اب تک اس کے تین ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ڈاکٹر سلیم اختر کی اس کتاب سے متعلق لکھا:

> ''سلیم اختر نے اقبال شناسی کی وادی میں قدم رکھا ہے اور اقبال کا نفسیاتی مطالعہ کے نام سے ہمیں علمی و ادبی تحفہ دے رہے ہیں۔ اس کتاب میں اقبالیات کے قارئین کے لیے مطالعے کا اتنا سامان ہے۔ جس کے لیے اب تک اقبال شناس ہفت خوانِ رستم طے کیا کرتے تھے۔ شخصیتِ اقبال کا نفسیاتی تجزیہ سلیم اختر کی انسان شناسی اور اعترافِ عظمت کے ساتھ ساتھ بہ حیثیت انسان ان کے خصائصِ ذہنی و ذوقی کا سراغ لگایا گیا ہے اور جلوت کے ساتھ خلوت کے احوال سے بھی روشناس کرایا ہے۔'' (حاشیہ، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ)

اس طویل مقالے کی بنیاد، عطیہ اور اقبال کے خطوط پر رکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''اقبال کو ایک مفکر، معلم اور فلسفی کے رُوپ میں پیش کرنے والے یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ کبھی وہ بھی جوان رہا ہوگا اور اس کے قلب و نظر اور ذہن متنوع اثرات کی آماجگاہ بھی بنے ہوں گے، چناں چہ اگر غلطی سے کوئی چونکا دینے والی بات سامنے آجائے تو ذہن کو گویا چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا لگتا ہے، مثلاً

اقبال کی یادداشتوں پر مشتمل نوٹ بک Stary Reflection (مرتبہ جاوید اقبال) میں ایک موقع پر، یہ بتاتے ہوئے کہ اس کی زندگی میں ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل اور ورڈز ورتھ کے افکار و نظریات اور شاعری نے کیا کردار ادا کیا، اس امر کا بھی اعتراف کیا کہ ورڈز ورتھ نے زمانہء طالب علمی میں مجھے دہریت سے بچالیا:

''یہ اعتراف اتنا خطرناک نہیں، جتنا بظاہر لفظ دہریت سے معلوم ہوتا ہے۔۔
اس سے اقبال کے ذہن کے ایک خاص رخ کا اندازہ یقیناً لگایا جا سکتا ہے۔''
(ص ۲۳،۲۴)

اقبال کی شخصیت و شاعری پر یہ معرکتہ الآرا کتاب، متنازعہ فی بھی ہے۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شخصیت اور فکر و فن۔

شخصیت کے ذیل میں یہ مضامین موجود ہیں: اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، کیا اقبال نرگسی تھے، اقبال کی پہلی شادی اور خانگی زندگی۔

فکر و فن کے ذیل یہ مضامین شامل ہیں۔ اقبال کا تنقیدی شعور، تو شب آفریدی چراغ آفریدم، حالی اور اقبال کے مقاماتِ آہ و فغاں، غزل کی نئی جہت، اقبال، اقبال کی نثر کا مزاج، علم الاقتصاد، نقدِ اقبال کا تجزیاتی مطالعہ، ملی نشاۃ الثانیہ کا نقیب، اقبال اور نظریہء پاکستان کی اساس، کیا آج اقبال کی ضرورت ہے۔؟

اقبال کی ذہنی کشمکش اور نا آسودگی میں ڈاکٹر سلیم اختر کو ان کی تخلیقی جینئس کا راز مضمر ملتا ہے اگر اقبال بھی اکثریت کی طرح اپنی نجی اور ازدواجی زندگی میں مطمئن ہوتے تو وہ کوئی تخلیقی کام نہ کر پاتے۔ کیا اقبال نرگسی تھے؟ والے مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے بعض ناقدین کے غلط تصورات اور غلط اطلاعات کی نہ صرف نشاندہی کی بل کہ اصلاح بھی کی ہے۔ اسی طرح: غزل کی نئی جہت، اقبال کی نثر، علم الاقتصاد اور کیا آج اقبال کی ضرورت ہے، بڑے فکر انگیز مضمون ہیں۔

اقبال کے بارے میں لکھی گئی، یہ کتاب ایک سطح پر ارمغانِ فکر ہے اور ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

فکرِ اقبال کے منور گوشے

یہ کتاب بھی ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی، جس کے مرتب ڈاکٹر سلیم اختر ہیں۔ کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

فکرِ نو کی ضیا افکار کی حنابندی، مطالعہ اقبال کی جہات، اقبال مفکر اسلام۔

کتاب میں بائیس مقالات ہیں۔ ان کے لکھنے والوں میں فیض، احمد ندیم قاسمی، سلیم احمد، محمد علی صدیقی، پروفیسر محمد منور، بشیر احمد ڈار، سحر انصاری، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر محمد عثمان، جیلانی کامران اور عمیق حنفی شامل ہیں۔ اس انتخاب کی بڑی خوبی کئی طرز کے نقطہ ہائے نظر کو یکجا کرنا ہے، جس سے اقبال کی تفہیم میں مدد ملتی ہیں۔

اقبال کا ادبی نصب العین

یہ کتاب بھی ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی اور جشنِ اقبال کی تقریبات کی ایک کڑی ہے۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے، اس کتاب کو بھی چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

تخلیق فن، فنونِ لطیفہ، خونِ جگر، شعور نقد

کتاب مرتبہ ہے، جس میں بائیس مقالہ جات شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر محمد عثمان، ممتاز حسین، خواجہ عبدالحمید، اسد ملتانی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، سید محی الدین قادری زور، سید وقار عظیم، عبدالرحمٰن چغتائی، شیخ اکبر علی، عندلیب شادانی، عزیز احمد اور یحییٰ امجد قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون اقبال کا تنقیدی شعور کتاب میں شامل ہے۔

مصنف کا اپنا مضمون اقبال کے بارے میں نئے مباحث کے دروازے کھولتا ہے۔

اقبالیات کے نقوش

ڈاکٹر سلیم اختر کی مرتب کردہ یہ کتاب اقبال اکیڈمی نے ۱۹۷۷ء میں ہی شائع کی، جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔

اس کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

تصوراتِ اقبال، حکمتِ اقبال، شعرِ اقبال، شاعرِ اقبال، معترضینِ اقبال

کتاب میں چوالیس مضامین ہیں۔ یہ انتخاب ۱۹۳۸ء تک لکھے گئے مقالات سے کیا گیا ہے۔ بقول

ڈاکٹر سلیم اختر:

''مقالات کی رعایت سے اقبال کے دورِ اول کا جائزہ لینے پر یہ ششدر کردینے والی حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ آج یعنی اقبالیات کے تیسرے دور میں جو موضوعات مرغوبِ عام ہیں وہی دورِ اول میں بھی پسندیدہ تھے۔'' اس حوالے سے اس انتخاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ یہ مقالہ جات اقبال کی نظر سے بھی گزرے۔

مصنف نے اپنے دیباچے میں ان مقالات کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ بقول میرزا ادیب:

''اقبالیات کے نقوش کے حوالے سے یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنا فریضہ بڑی کاوش و محنت اور خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔'' (نوائے وقت ۱۸/اپریل ۱۹۸۰ء)

اقبال شعاعِ صد رنگ

ڈاکٹر سلیم اختر کی مرتب کردہ یہ کتاب ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کو ان حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

شخصیت کی پہلوداری، فکر کے زاویے، شاعرِ بے مثال، شاعرِ اسلام، بچوں کا اقبال اور فلسفیانہ مباحث۔

کتاب میں چونتیس مقالہ جات شامل ہیں۔ ان مقالات کے انتخاب کا صرف ایک جواز ہے کہ یہ اقبال کے دورِ اول کے فراموش کردہ مقالات ہیں۔ مقالہ نویسوں میں دیا نرائن نگم، پروفیسر عبدالحمید، مہاراجہ کشن پرشاد، شاہ محمد احمد سبزواری، ایس ایم الٰہی، ظفر قریشی دہلوی، ح۔ انصاری، جوہر میرٹھی اور سید الطاف حسین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تحقیقی کام اقبالیات کی کڑیاں جوڑنے میں مددگار ہے اور حوالے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اقبال ممدوحِ عالم

یہ کتاب بھی مرتبہ ہے اور اسے بزم اقبال نے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا، یہ مشرق اور مغرب میں مسلم و غیر مسلم دانشوروں کے اقبال کے بارے میں لکھے گئے، مضامین اور مضامین کے تراجم ہیں، جن کی تعداد اڑتیس ہے، کتاب کا ابتدائیہ بزم اقبال کے بنیادی نقطۂ نظر کی عکاسی کرتا ہے۔

”علامہ اقبال کی مقبولیت اور شہرت عالمگیر ہے۔۔مشرق اور مغرب کے مسلم اور غیر مسلم اہلِ قلم کی تحریروں کا انتخاب ہی اس ہمہ گیر ہر دل عزیزی کا ایک عکس پیش کرنے کا واحد ذریعہ ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر نے عالمی اقبالیات کو کھنگال کر اس سمندر میں سے جو گراں مایہ گوہر چنے ہیں، وہ ’اقبال۔ممدوحِ عالم‘ کی صورت میں نذرِ قارئین ہیں“۔

یہ کتاب کڑا انتخاب ہے اور اقبال کے بارے میں نئے موضوعات اور افکار کا احاطہ کرتا ہے۔ مضامین کی تفصیل نہایت اہم ہے:

اقبال کے غیر مسلم مداح اور نقاد از ڈاکٹر سید عبداللہ، روس میں اقبال شناسی کی روایت از ڈاکٹر مخوچوف، اقبال بدیشی زمینوں میں از سید عبدالواحد، ازبکستان میں اقبال از پروفیسر سعداللہ یلداشیف، اقبال ممدوحِ عالم از ڈاکٹر سلیم اختر، اسرارِ خودی از ڈاکٹر آر۔اے نکلسن، اقبال کے سماجی نظریات از ایل آر گورڈن، پیامِ مشرق از ڈاکٹر آر۔اے نکلسن، فلسفہء اقبال میں اخلاقیات کے مسائل از ایم ٹی ستے پیسن، عظمتِ اقبال از ہربرٹ ایڈ، اقبال کی روحانی وراثت اور سوویت علما از نکولائی گلیوف، رموزِ بے خودی از پروفیسر اے جے آربری، کلام اقبال بُلبلِ ہندوستان، ای ایم فارسٹر، افغانستان اور ایران میں اقبال پر مقالات و کتب از ڈاکٹر محمد ریاض، محمد اقبال از ای ایم فارسٹر، دانتے اور اقبال السندرو بوزانی، عصرِ جدید کا عظیم مفکر اور فلسفی اقبال از ڈاکٹر ضیاء الدین سجاوی، اقبال اور انسانی اخوت کا پیغام از پروفیسر جی توچی، اقبال کا ایک شعر از ڈاکٹر احمد علی رجائی، منصورِ حلاج اقبال کی نظر میں از ڈاکٹر اینا میری شمل، مصر میں فکرِ اقبال از عباداللہ فاروقی، فکرِ اقبال کی جہات از لوس کلوڈ تیخ، اقبال کا پہلا عرب مترجم، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، مسجد قرطبہ کشف یا فنا از ڈاکٹر شیلا میکڈونف، اقبال عظیم شاعر اور فلسفی از ڈاکٹر ایل آر ایلسن، پیام مشرق از ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، اقبال روس میں از خالد احمد، اقبال از ڈاکٹر طٰہٰ حسین، سوویت یونین میں اقبال شناسی از فتح محمد ملک، ترکی میں مطالعہء اقبال از ڈاکٹر حنیف فوق، علامہ اقبال از شہزادہ احمد علی خان درانی، اقبال آفاقی شاعر اور نابغہ از ڈاکٹر علی نہاد تارلانی، اقبال کا انقلابی فلسفہ از پروفیسر ایس آئی فہد، اقبال کا سیاسی فلسفہ از محمد ناصر، اقبال بنگلہ دیش میں از محمد عبداللہ، بنگلہ ادب اور اقبال از وفا راشدی، اقبال اور بنگالی ادیب از وحید قیصر ندوی، اقبال: اسلامی احیاء کا داعی از ستیاوجے رتن، اس کتاب کے منفرد مضامین اقبالیات کے تذکرے میں اچھا اضافہ ہیں۔

فکرِ اقبال کا تعارف

یہ کتاب ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں اور تیسرا ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ بنیادی طور پر یہ کتاب فرانسیسی دانشور لوس کلوڈ تیخ کی لکھی ہوئی ہے، جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی، انگریزی ترجمہ عبدالحمید ڈار نے ۱۹۶۲ء میں کیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اسی انگریزی ترجمے سے استفادہ کیا ہے، کتاب کے آٹھ ابواب ہیں۔ اقبال: حیات و تصانیف، اقبال کا فلسفۂ شخصیت، انسانِ کامل اور مثالی معاشرہ، اقبال کی مابعد الطبعیات اور فلسفۂ مذہب، اقبال اور مشرقی فکر، اقبال اور مغربی فکر، اقبال بحیثیت شاعر، منتخب غزلیات۔

لوس کلوڈ تیخ نے اقبال کو قرآن اور اسلام کی روشنی میں دیکھا ہے۔ لوس کا کہنا ہے کہ اقبال نے مغربی فکر سے برائے نام ہی استفادہ کیا ہے، ان کی تعلیمات اسلام ہی سے ماخوذ ہیں۔ سلیم اختر نے خاتون دانشور کے تصورات کو احسن طریقے سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔

اقبال اور ہمارے فکری رویے

کتاب کا سنِ اشاعت ۱۹۸۲ء ہے دوسری مرتبہ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ اقبال صدی میں تحقیق و تنقیدی کام کا کوئی بھی درجہ متعین کیا جائے اتنا ضرور ہوا ہے کہ اقبال کے بارے میں گمشدہ مواد اور پھیلا ہوا کام ایک جگہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ اس کی شیرازہ بندی ذاتی صوابدید پر ہے، اس کتاب میں گیارہ مقالات شامل ہیں، جنھیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: پہلا مفکرِ عالم اور دوسرا ممدوحِ عالم۔

پہلے حصے میں علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں، اقبال کا لسانی شعور، جز و کل اور اقبال، اقبال اور ہمارے فکری رویے، اقبال کے اساتذہ، علامہ اقبال اور نیرنگِ خیال جیسے مضامین ہیں۔ دوسرے حصے میں عظمتِ اقبال کا معترف ہربرٹ ریڈ، اقبال ممدوحِ عالم، ایران میں اقبال شناسی کی روایت، ایک فرانسیسی اقبال شناس اور اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت، شامل ہیں۔ اقبال کا لسانی شعور ان کی شعری لسانیات اور اس کے تشکیلی نظام سے متعلق ہے جب کہ علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں فراق گورکھپوری کے لکھے گئے ایک مضمون، مطبوعہ افکار کراچی، کا جواب ہے۔

جز و اور کُل میں، اقبال کے نظریۂ وطنیت، تصورِ ملت اور تقدیر و تدبیر کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ اقبال اور ہمارے فکری رویے میں، مصنف نے اس بات پر مایوسی کا اظہار کیا ہے کہ ہماری فکر کسی طور پر بھی اقبال کی فکر سے ہم آہنگ نہیں۔ اقبال کے اساتذہ میں مولوی میر حسین سے لے کر مولانا روم تک کا تذکرہ ہے۔

ہربرٹ ریڈ والا مضمون اقبال، ممدوحِ عالم میں بھی موجود ہے۔ کتاب کا آخری مضمون اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت ایک تحقیقی مضمون ہے، جس میں ڈاکٹر نکلسن سے لے کر ایران کے وزیراعظم ڈاکٹر احمد علی رجائی تک کی تحریروں کا تذکرہ ہے۔

کتاب طبع زاد ہے اور اقبال کی تفہیم میں اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کے باوجود شاندار اضافہ کرتی ہے، کتاب کا دیباچہ جگن ناتھ کا تحریر کردہ ہے۔ اس کتاب کو ۱۹۸۲ء میں داؤد ادبی انعام سے بھی نوازا گیا۔

ایران میں اقبال شناسی

اس کتاب کا سن اشاعت ۱۹۸۳ء ہے اور مرتبہ ہے۔ کتاب میں ایرانی اقبال شناسوں کے بکھرے ہوئے مضامین یکجا کیے گئے ہیں اور فارسی مضامین کا اُردو متن شامل کیا گیا ہے۔ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے:

خاصہ اقبال، خراجِ عقیدت، سکہء اقبال

پہلے حصے میں ملک الشعرا بہار، نظم طباطبائی، سید عبدالواحد، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی، ڈاکٹر محمد صدیق شبلی، ممتاز حسن اور ڈاکٹر محمد ریاض کی تحریریں شامل ہیں۔

دوسرے حصے میں، سید محمد محیط طباطبائی، ڈاکٹر غلام حسین یوسفی، ڈاکٹر جلال میتنی، فریدوں، زندمر اور ڈاکٹر علی شریعتی کے مضامین شامل ہیں، جنھیں ڈاکٹر محمد ریاض، گوہر نوشاہی، ڈاکٹر عطا اللہ اور خواجہ عبدالحمید یزدانی نے ترجمہ کیا ہے۔

تیسرے حصے میں ایرانی شعراء کا منظوم خراجِ عقیدت شامل ہے، جس میں صادق سرمد، ڈاکٹر رضا زادہ شفیق، ڈاکٹر احمد علی رجائی، علی اصغر حکمت، کاظم رجوی ایزد، علی خدائی اور قاسم رسا شامل ہیں۔

یہ کتاب برادر اسلامی ملک سے خوشگوار تعلق اور فارسی زبان کی اہمیت کو تسلیم کرنے کی علامت ہے۔

اقبال شناسی کے زاویے

یہ کتاب بزم اقبال کی جانب سے ۱۹۸۸ء میں شائع کی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی مرتبہ ہے اور ان مضامین پر مشتمل ہے، جو اُردو رسالہ ''اقبال'' میں ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۴ء تک شائع ہوتے رہے۔ کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

طلوع، تنوع، فن، نایاب

''طلوع'' کے عنوان کے تحت، جو مقالے منتخب کیے گئے ہیں وہ انقلابی خیالات رکھنے والے ادیبوں کے مقالات ہیں۔ تنوع کے زیرِ عنوان وہ مقالات درج ہیں، جو اقبال کے افکار کی نمو اور ارتقا کے بارے میں نئے نکتے سامنے لاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ ''گلشنِ راز جدید خطبات کے آئینے میں'' اور پروفیسر وقار عظیم کا مقالہ ''تلاش عزلت اور احساسِ تنہائی'' ایسے ہی مضامین ہیں۔

''فن'' کے عنوان کے تحت مضامین میں اقبال کے فنی محاسن اور اصطلاحات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ انتخاب کا یہ حصہ اُردو زبان کے قواعد وضوابط کے لحاظ سے اہم ہے۔ عبداللہ فاروقی کا مضمون کلامِ اقبال میں تلمیحاتِ قرآنی، چودھری نذیر احمد کا مقالہ تشبیہاتِ اقبال اور ڈاکٹر ریاض مجید کا مضمون اقبال کے چند تراجم وماخوذات بہت اہم مضامین ہیں۔

''نایاب'' کے عنوان کے تحت اقبال اور دوسرے فلسفیوں کے افکار اور جہانِ دیگر کی تلاش فکر وفن کی نئی راہیں استوار کرتی ہے۔

اقبال کی فکری میراث

ڈاکٹر سلیم اختر کی مرتب کردہ یہ کتاب ۱۹۹۲ء میں بزم اقبال لاہور نے شائع کی۔ اقبال کی فکری میراث کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ یہ وسیع بھی ہے، پُرتنوع بھی، بسیط بھی، عمیق بھی، اس کی اساس اسلام اور قرآن مجید پر استوار ہے۔ انھوں نے جملہ علوم اور فلسفیانہ مباحث کے انفرادی اظہار کے بجائے اسلامی تشخص کی اجتماعیت کو مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ افکارِ اقبال کے پیچیدہ نظام میں خودی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کی فکری میراث کو محض جغرافیائی حدود، اپنی تہذیب اور ثقافت تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تصورِ پاکستان کے خالق تھے، ان کی تخلیقی شخصیت اپنی جگہ ایک مثال ہے، افسوس ہمارا عمومی چلن اقبال کے فکر وخیال کے منافی ہے۔

اقبال: شخصیت، افکار وتصورات

مطالعہ کا نیا تناظر، یہ کتاب بسلسلہ اقبال ۲۰۰۲ء کی کتاب ہے اسے ۲۰۰۳ء میں سنگ میل لاہور نے شائع کی ہے۔ اس کا دیباچہ جگن ناتھ آزاد کا لکھا ہوا ہے۔ بقول جگن ناتھ آزاد:

> ''اقبالیات پر سلیم اختر کا کام ہر اعتبار سے ایک نئے اندازِ فکر کا حامل ہے۔ یہ کام سلیم اختر کے اپنے شعوری تجربے کا نتیجہ ہے، دوسروں کی صدائے بازگشت نہیں۔ سلیم اختر کو اس بات کا احساس ہے کہ آج اقبال کے نقادوں کے سامنے

سب سے بڑا کام اقبال کی از سرِ نو دریافت ہے۔" (ص ۸)

کتاب کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

تخلیقی شعور، دانشِ نورانی، قبائے صفات، ممدوحِ عالم، حریرِ دورنگ، ذات۔

کتاب میں اڑتیس مضامین شامل ہیں، جو زیادہ تر وہی ہیں، جو اس سے پہلے کی کتب میں شامل کیے گئے، لیکن یہ کتاب ان سب مضامین کا ایک ضخیم مجموعہ بن گئی ہے اور مصنف کے ذاتی نظریے کی پیامبر۔

"تخلیقی شعور" کے ذیلی مضامین: اقبال کا تنقیدی شعور، تو شب آفریدی، چراغ آفریدم، اقبال کا لسانی شعور، اقبال کی نظری و عملی شعریات ہیں۔

"دانشِ نورانی" کے عنوان کے تحت جن مضامین کو شامل کیا گیا ہے ان کی تفصیل اس طرح ہے:

الہامی و متصوفانہ واردات، فکرِ اقبال کے تناظر میں، ملی نشاۃ الثانیہ کا نقیب، اقبال، اقبال اور نظریہء پاکستان کی اساس، جزو کل اور اقبال، ٹوٹا ہوا تارہ، اقبال کا مثالی انسان۔ نفسیاتی تناظر، حکمتِ قرآن اور علامہ اقبال، کشتِ ویران، حالی اور اقبال کے مقامات آہ و فغاں۔

"قبائے صفات" کے ذیلی عنوات اس طرح ہیں: غزل میں نئی جہت، اقبال، ضربِ کلیم کا تنقیدی مطالعہ، علامہ اقبال کی رباعیات، اقبال کی نثر کا مزاج، علم الاقتصاد (تجزیاتی مطالعہ)، نقدِ اقبال کا تجزیاتی مطالعہ، علامہ اقبال اور نیرنگِ خیال، علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں۔

"ممدوحِ عالم" کے ذیلی عنوانات یہ ہیں: اقبال، ممدوحِ عالم، اقبال کی آفاقیت، پیامِ اقبال کی عالمگیر مقبولیت، اقبال شناسی کی روایت، عظمتِ اقبال کا معترف: ہربرٹ ریڈ، ایک فرانسیسی اقبال شناس، اقبال شناسی کی روایت اور فنون۔

"حریرِ دورنگ" کے زیرِ اہتمام یہ مضامین موجود ہیں: کیا آج اقبال کی ضرورت ہے؟ سیاسی بحران اور اقبال، اقبال اور ہمارے فکری رویے، اقبال کی فکری میراث، علامہ اقبال: نیا تناظر۔

آخری باب "ذات" کے سلسلے میں ان مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے: اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، کیا اقبال نرگسی تھے؟ اقبال کی پہلی شادی اور خانگی زندگی، اقبال کے اساتذہ، غور کیا جائے تو فکرِ اقبال اور فکرِ سلیم اختر کو پرکھنے کے لیے یہی بنیادی کتاب ہے جس کے بارہ مضامین سلیم اختر کی تحریروں کے مجموعے تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید میں شامل ہیں اور اس کتاب کا سن اشاعت ۲۰۰۶ء ہے۔

شرح ارمغانِ حجاز

سلسلہء اقبال کی یہ آخری کتاب ہے، جسے سنگ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا ہے۔ کتاب ۲۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اقبال کے نظریات کی تشریح اور وضاحت کرتی ہے۔

غالب کا شعور اور ڈاکٹر سلیم اختر

غالب کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کے اولین تین مضامین ۱۹۶۸ء میں شائع ہونے والی پہلی تنقیدی کتاب، ''نگاہ اور نکتے'' میں ملتے ہیں۔ غالب: خطوط کے آئینے میں، غالب کی نرگسیت، مردِ عاشق کی مثال: غالب، غالب کے خطوط کا منٹو کے خطوط سے موازنہ کرتے ہوئے، سلیم اختر غالب کے شخصی تضادات کو ابھارتے ہیں۔ ان خطوں میں انھیں زندگی سے بھرپور شوخ و چنچل شخص کے بجائے ایک عاجز اور منکسر شخص نظر آتا ہے، جو خوف، بے بسی اور احساسِ مرگ کا شعور رکھتا ہے۔ غالب کی نرگسیت میں غالب کی آزار پسندی، مساکیت اور احساسِ برتری کا سراغ لگاتے ہوئے، مصنف اس کے شعری رویوں تک پہنچتا ہے جو نرگسی میلانات رکھتے ہیں۔ مرد عاشق کی مثال فرد اور ماحول کے ٹکراؤ کی نفسیات بیان کرتی ہے بقول مصنف'' جسمانی ترغیب اور جسمانی گریز کے درمیان نقطہء توازن ہی مردانہ انفرادیت کا درجہ متعین کرتی ہے۔''

شعور اور لاشعور کا شاعر: غالب

یہ کتاب فیروز سنز نے ۱۹۸۴ء میں شائع کی۔ اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، کتاب دس مقالات پر مشتمل ہے۔

شعور اور لاشعور کا شاعر: غالب، غالب: خطوط کے آئینے میں، غالب کی نرگسیت، مرد عاشق کی مثال: غالب، غالب کی شاعری میں جنس، غالب: آتش زیرپا، غالب مکتب، غمِ دل میں، بیاضِ غالب کا تجزیاتی مطالعہ، غالب و چغتائی کے ذہنی رابطے، غالب اور رشک، پہلے چھ مضامین ڈاکٹر سلیم اختر کے نثری کلیات ''تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید'' میں بھی شامل ہیں۔

شعور اور لاشعور کا عنوان قاری کو کتاب پڑھنے پر اکساتا ہے۔ غالب کے رشک کو اکثر نے خاص مضمون قرار دیا ہے۔ دراصل یہ کتاب ایک پوری تہذیب کے شعور اور لاشعور اور اس کے تخلیقی ربط کو ظاہر کرتی ہے۔

بقول احمد ندیم قاسمی:

''اس کتاب میں اگر ''غالب کے تضادات کا مطالعہ'' کے عنوان سے بھی ایک مضمون شامل ہو جاتا تو کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا۔''

(ص ۲۲۴)

ڈاکٹر سلیم اختر نے کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''غالب کی تخلیقی صلاحیت کتنی توانا تھی، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ فکر و نظر کے بدلتے زاویوں، جدید علوم اور تصوراتِ نو کی بوقلمونی کے مقابلے میں، اس کا کلام 'کم عیار' ثابت نہیں ہوا بل کہ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غالب نے کئی امور میں انہیں Anticipate کیا ہے؟ کچھ یہی حال نفسیات کا ہے غالب کے اشعار اور خطوط کا نفسیات کی روشنی میں مطالعہ کرنے سے ایسے کئی نکات ملتے ہیں، جو غالب کی شخصیت کی نفسی اساس کی تفہیم میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔''

غالب مکتبِ غمِ دل میں، بیاضِ غالب کا تجزیاتی مطالعہ اور غالب و چغتائی کے ذہنی رابطے، بھی نفسیاتی رجحانات رکھنے والے مضمون ہیں۔ مردِ عاشق کی مثال، باغ و بہار کے درویشوں کا جواب ہے اور غالب کے توانا لب و لہجے اور ارادے کی مظہر ہے۔ غالب کے بارے میں سلیم اختر کا مضمون غالب: آتش زیرپا خاص مطالعے کی چیز ہے۔ بقول مصنف:

''آتش زیرپا سے ایک ایسے شخص کا تصور ابھرتا ہے، کہ بے چینی جس کا مقصد بن چکی ہے، اس بے چینی کو اس بے چینی سے ممیز سمجھا جائے، جس کی سیمابیت سے وضاحت کی جاتی ہے، سیمابیت کی پیدا کردہ بے چینی بطون سے جنم لیتی ہے اور انسان کی نفسی ترکیب میں آمیز ہوتی ہے جب کہ اس کے برعکس، آتش زیرپا کی صورت میں، آتش ایک خارجی عمل ہے، جو پاؤں کو زمین پر سکون سے ٹکنے نہیں دیتا۔ خواہش تو آرام کرنے کی ہے، اطمینان سے کھڑا ہونے کی، لیکن بربنائے آتش، بے چارگی اور اندوہ کی علامت، زیرپا آتش سرد نہیں کی جا سکتی۔''

(ص ۹۸۴)

غالب کے بارے میں، کثیر التشریحی اور نزاعی مضامین نے، غالب کی نو دریافت کا دریچہ کھولا ہے، سلیم اختر بھی اپنے تخلیقی ابال اور سوزشِ باطن کو اسی طرح اپنی تحریروں میں لائے ہیں اور اس آگ کو معاشرتی آگ سے ملا کر تحریر کے آتش فشانی پیدا کی ہے۔

غالب شناسی اور نیاز و نگار

یہ کتاب الوقار پبلی کیشنز نے ۱۹۹۸ء میں لاہور سے شائع کی، کتاب کے مرتب ڈاکٹر سلیم اختر ہیں، لیکن ان کی اپنی کوئی تحریر اس کتاب میں شامل نہیں، البتہ پیش لفظ ان کا لکھا ہوا ہے جس میں کتاب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سلیم اختر کا خیال ہے کہ دیوانِ غالب عصری شعور کا استعارہ ہے اسی لیے شعورِ زیست کے ساتھ ساتھ شعارِ زیست سے آگہی بخشتا ہے۔

کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

نگاہِ نیاز، قدر و معیار کی جستجو، غالب اور روسی متشرقین، شخصیت

''نگاہِ نیاز'' کے ذیلی عنوانات یہ ہیں: غالب کا طرز شاعری اور شاعرانہ خصوصیات، کلام غالب کا خوردبینی مطالعہ، غالب کا آہنگ ولب ولہجہ، غالب اور الہامی شاعری، غالب اور شاعری کا معیارِ حقیقی، غالب اور بیدل، مومن و غالب کی فارسی ترکیبیں، سب مضامین نیاز فتح پوری کے لکھے ہوئے ہیں۔

''قدر و معیار کی جستجو'' کے زیرِ عنوان مشاہیر کے لکھے گئے مضامین میں ہر قسم کا عنوان شامل ہے، لکھنے والوں میں مالک رام، امتیاز علی عرشی، غلام رسول مہر، مجنوں گورکھ پوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شمس الرحمن فاروقی اور دوسرے شامل ہیں۔ یہ مضامین نگار میں چھپنے والے مضامین کا کڑا انتخاب ہے اور غالبیات کے ضمن میں اہم اضافہ۔

''غالب اور روسی مستشرقین والا حصہ کافی اہم ہے، اس میں، جی وائی علی اوف، بابا جان غفاروف ای چیلی شیف، ایل آر گورڈن اور این پریگرنیا، کے مضامین شامل ہیں۔

''شخصیت'' کے ضمن میں شوکت سبزواری، عبدالقادر سروری، فراق گورکھ پوری اور پروفیسر حمید احمد خان کی تحریریں شامل ہیں۔ ایک مضمون نسخہ حمیدیہ اور اس کی اہمیت پر ہے، جس کے مصنف ڈاکٹر ابو محمد سحر ہیں۔ کتاب کے آخر میں ڈاکٹر سلیم اختر کا تیار کردہ اشاریہ اور نگار میں مطبوعہ مقالات کی تفصیل ہے۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۹۳ء تک تقریباً ۱۵۶ مضامین، غالب سے متعلق نگار نے شائع کیے، جن میں سے ۶۸ مضامین علامہ نیاز فتح پوری کے لکھے ہوئے ہیں۔

۱۹۸۷ء کا سالنامہ نگار اور ۱۹۹۲ء کا خصوصی شمارہ نگار، غالب کے خاص نمبر ہیں جو سارے کے سارے نیاز فتح پوری کے لکھے ہوئے ہیں۔ نگار اور نیاز کو خراج تحسین پیش کرنا اعتراف محبت بھی ہے اور اعتراف عقیدت بھی، ایسی کتابیں یادگار ہوا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ سازی

اُردو میں دو طرح کی تاریخیں ملتی ہیں، ایک وہ جن کی حیثیت تصنیف کی نہیں، تالیف کی ہے اور جنہیں فردِ واحد نے نہیں بلکہ مختلف افراد نے یکجا کر کے ترتیب دیا ہے۔ اس قسم کی ایک تاریخ علی گڑھ یونیورسٹی اور دوسری پنجاب یونیورسٹی سے شائع کی گئی کئی جلدوں میں لکھی گئی۔ یہ تاریخیں تضادات و اغلاط سے مزین ہیں۔ دوسری قسم کی ادبی تاریخیں وہ ہیں جو فردِ واحد کی مرتب کردہ ہیں۔ ان میں سب سے معروف و مقبول رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اُردو" ہے جسے ابتداً ۱۹۲۴ء میں انگریزی میں لکھا گیا اور ازاں بعد مرزا محمد عسکری نے اُردو میں منتقل کیا، یہی اُردو ترجمہ مستعمل ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی "مختصر تاریخ ادب اُردو ۱۹۳۴ء میں پہلے ہندوستان سے اور ازاں بعد پاکستان سے شائع کی گئی۔ یہ کتاب فی الواقع اُردو نثر و نظم کے مشاہیر کا تذکرہ ہے اور اُردو زبان و ادب کی معنوی ترقی پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ اسی طرح ایک کتاب نظیر حسین نظیر لدھیانوی کی "مختصر تاریخ ادب اُردو" ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ شماری اور ادبی تاریخ سازی کے میدان ذرا مختلف ہیں، یہاں اُن کی طرف اشارہ دیا جاتا ہے۔

اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

یہ کتاب ایک دلکش منی ایچر ہے۔ اُردو ادب کے تمام اہم ناموں سے مزین آغاز میں اڑھائی سو صفحات کا انسائیکلو پیڈیا ہے، جسے سلیم اختر کی تخلیقی قوتوں نے اپنی جدت پسند طبیعت کے مطابق چٹخارے دار اور قابلِ توجہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کا اشہب قلم اس میدان میں اس قدر رواں اور برق رفتار ہے کہ اب تک اس کتاب کے بائیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں سنگ میل لاہور سے شائع ہوئی تھی اور امید کی جاسکتی ہے کہ اُردو کی موجودگی کے ساتھ ساتھ اس کے ایڈیشنوں اور مواد میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ ۱۹۶۸ء میں مصنف نے اس کے لکھنے کا آغاز ملتان شہر میں کیا تھا۔ اسے ۱۹۷۱ء میں سب سے پہلے رسالہ "کتاب" نے اقساط میں شائع کرنا شروع کیا ازاں بعد اسے کتابی شکل دی گئی، بقول انتظار حسین "اُردو ادب کی تاریخ کیا لکھی ہے چاول پر قل ہو اللہ تحریر کی ہے۔"

یہ کتاب میدانِ اشاعت میں آتے ہی نزاعی حیثیت اختیار کر گئی، کیونکہ زندہ اور ہم عصر ادیبوں کے بارے میں اظہارِ خیال کانٹوں میں الجھنے کے مترادف تھا۔ تاہم احمد ندیم قاسمی نے "اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"، کو سراہتے ہوئے لکھا:

''کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ دورِ حاضر کے ادب کی تاریخ
لکھتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر کو بڑی آزمائش کا سامنا رہا ہے۔ معاصر ادب اور
ادیبوں کے بارے میں کھری باتیں کہنے کا حوصلہ بڑے بڑے جغادری نقادوں
کو بھی نہیں ہو پاتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر بھی تاریخ کے اس مرحلے تک پہنچ کر ٹھٹکے ہیں
مگر ہر بار ان کی دیانت ان کا سہارا بنتی ہے اور وہ دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ
سنا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مستقبل کا ادبی مورخ تسلیم کرے گا کہ ڈاکٹر سلیم
اختر ایک جری محقق و ناقد تھا، کیوں کہ اس نے کذب و منافقت کی تاریکی میں
بھی صداقت و دیانت کی مشعل بلند کی۔'' (الفاظ مارچ ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے اس آئینۂ سخن فہمی کو طرح طرح کے عنوانات سے سجایا ہے جو ہمیں یاد دلاتے رہتے ہیں کہ مصنف بنیادی طور پر افسانہ نگار ہے، جس کے افکار کی بنیاد ان نفسیاتی محرابوں پر رکھی گئی ہے جو اکثر اوقات نادیدہ رہتی ہیں۔ کتاب کے کچھ عنوانات دیکھیے۔

اُردو اور اُردو کا بازار، برج بھاشا کی بیٹی، نازو ادا کا اسلحہ خانہ، افکار نو کے پرچم، نئی اصناف کی کونپلیں، ادبی کھاد، کون سا گیت سنو گی، فلسفہ اور تنقید کی مکھیاں، انشائیے کا سیاپا، علامت سے گھر تک، لفظ کی دھار، شاعری کا جاپانی پھل، جل بجھے انگارے، اینگری ینگ مین، مشاعرہ یا شاعر پروری، ۱۹۹۹ء الوداع وغیرہ وغیرہ۔

کتاب اپنا ارتقائی سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ ہر ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح یہ مختصر ترین تاریخ اب ''مفصل ترین تاریخ'' بنتی چلی جا رہی ہے۔

اس کتاب کا وہ حصہ جو خالصتاً پاکستانی ادب پر مشتمل ہے اور جس کے اُفق پر نئے چاند سورج ستارے ابھرتے اور غروب ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے لیے دوستی اور دشمنی کا پیمانہ بھرتا اور خالی کرتا رہتا ہے۔ اس اثنا میں تین قابل ذکر تواریخ اور بھی شائع ہوئی ہیں، جن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ اُردو ادب'' ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''تاریخ اُردو ادب'' اور ڈاکٹر انیس ناگی کی ''پاکستانی ادب کی تاریخ'' شامل ہے لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب کا رنگ جداگانہ اور سدا بہار ہے۔ اس کی حیثیت ایک رہنما کتاب کی سی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی اس کتاب پر ایک الزام اٹھایا جاتا ہے کہ انھوں نے کتاب میں کئی مقامات پر تعصب برتا ہے حالاں کہ یہ تعصب ہی تاریخ نگار کی بالغ نظری کا ثبوت ہے۔ مصنف نہ تو کسی سے

مرعوب ہے اور نہ ہی خوف زدہ اس طرح وہ سوچے سمجھے توازن اور اعتدال کو بھی اہمیت نہیں دیتا۔ یہ کتاب اسی لیے دلچسپی اور مطالعے کا باعث ہے کہ اس میں مصنف کے اپنے تعصبات، پسندیدگیاں، نظریات اور میلانات عکس کشی کرتے ہیں اور اس طرح تاریخ نویسی کا خشک، دقیق اور مشکل عمل ایک ایسی فن کاری میں ڈھل جاتا ہے جس میں جدید محاورہ، اصلاحات اور معنی خیزیاں گھل مل گئی ہیں:

''گزشتہ چند برس سے ہمارے اہل علم اور اہل قلم اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی اس انداز اور اسلوب میں باتیں کررہے ہیں، گویا اکیسویں صدی کسی بھید بھرے غار کا طلسمی دروازہ ہے ''کھل جا سم سم'' کہیں گے اور اس میں ''داخل'' ہوجائیں گے۔ یہ امر فراموش کر کے کہ یہ محض عیسوی کیلنڈر کے مطابق، سورج کے گرد، زمین کی گردش کی گنتی ہے، قمری تقویم کے حساب سے اکیسویں صدی ہنوز کئی صدیاں دوراست، جب کہ بکری سن کے لحاظ سے تو اکیسویں صدی بھی گزرچکی ہے۔ ماضی کے زندہ ورثے کی بات کرتے ہیں تو اس میں کتاب بھی شامل ہوتی ہے۔ زندہ تخلیقات کی حامل زندہ کتابیں جو ماورائے زماں ہوکر ہم سے مکالمہ کرتی ہیں، حیات آمیز مکالمہ، جوحیات آموز بھی ہوتا ہے۔۔ چلیں تمام کتابوں کی بات نہ کریں صرف دیوانِ غالب ہی ہم سے اگر چھین لیا جائے تو ہم کتنے فرومایہ ہوجائیں گے۔''

(ص ۶۷۰،۶۷۰، ۱۹۹۹ء الوداع)

عجب اتفاق ہے اکیسویں صدی کے آغاز میں شائع ہونے والا ایڈیشن اُردو ادب کی چار سو سالہ تاریخ پر محیط ہے۔ مصنف نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اہل قلم کی اکثریت بڑے اور تناور اشجار کے لیے ادبی کھاد کا کام کرتی اور گلشنِ ادب میں محض سبزہ ء بیگانہ ثابت ہوتی ہے۔ قدآور اور زندہ تخلیقی شخصیات وہ ہیں جو حلقہء شام وسحر سے ماورا ہوکر آنے والے زمانوں سے بھی مکالمہ کرسکتی ہیں اور ان کا انتخاب آخرکار حسن انتخاب ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کے پہلے ایڈیشن پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے ان تاثرات کا اظہار کیا تھا:

۱۔ کتاب کے مطالعے سے پہلا تاثر ہی یہ مرتب ہوتا ہے کہ اس میں اختصار کا دامن بہت وسیع ہے۔

۲۔ اس میں مولف نے جذباتیت سے محفوظ رہ کر اُردو ادب کا احاطہ کیا ہے۔

۳۔ اس میں اُردو زبان اور اُردو ادب کے فروغ کے سلسلے میں پہلی بار ایک ایسے خطہء زمین یعنی مغربی

پاکستان کی کارکردگی کا کھل کر اعتراف کیا گیا ہے، جس کے بارے میں اکثر تاریخ نویسوں نے بخل سے کام لیا ہے۔

۴۔ بحیثیت مجموعی اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ایک نہایت دلچسپ اور مفید کتاب ہے، بالخصوص طلبا کے لیے، اس کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے کتاب میں ادبی تعبیر و تشریح اور تجزیے کے عمل سے گزرتے ہوئے مواد کی چھان پھٹک اور قاری تک درست مطالب کی ترسیل کو بھی آسان بنادیا ہے وہ اپنے قاری کو کسی مقام پر مایوس نہیں کرتے۔ کتاب سے ان رجحانات و تحریکات کا بھی بھید کھلتا ہے جو سماجی، تہذیبی، سیاسی اور عمرانی سطح پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ مصنف کا وسیع مطالعہ اور مصنف کی معاملہ فہمی نے کتاب کو حکیمانہ افادیت عطا کی ہے:

> ''قدیم زمانہ میں اصناف کی مقبولیت ،لسانی سانچوں میں تبدیلی اور شعری رویوں میں مدوجزر، سیاسی حالات (جن کی علامت بادشاہ کی ذات اور مرکز دریا ہوتا تھا) سے مشروط ہوتی تھی۔ اب سیاست کی جگہ معیشت اور کلچر نے لے لی ہے، اس نکتہ کی صراحت ہائیکو سے ہوجاتی ہے، ہماری سڑکوں پر جاپانی گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں رواں ہیں۔ ہمارے گھروں میں جاپانی ٹیلی ویژن، فریج، وی سی آر، کیسٹیں، ٹیپ ریکارڈر، کچن گیجٹس سب جاپانی، لباس جاپانی کپڑے کا، کیمرے اور ان کی فلمیں جاپانی، پھلوں کی دکانوں پر جاپانی پھل (جس کا اصل نام ''کی'' ہے) یہ تو شراب کی بندش ہے ورنہ جاپانی شراب ''ساکی'' کے خم بھی لنڈھائے جا رہے ہوتے۔ جب ہم جاپانی اشیا کے اتنے رسیا ہیں تو پھر جاپانی صنف سخن ''ہائیکو'' کو بھی متعارف ہونا چاہیے تھا۔ تین سطریں گھڑ کر سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کے مصداق۔۔ ہر کوئی شاعر بن سکتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ امر کہ جاپانی سفارت خانہ ہائیکو مشاعرہ کے تین سطری شاعروں کو جو معاوضہ دیتا ہے اس کے حساب سے ہائیکو کے ایک ایک لفظ کا کئی سو روپے معاوضہ بن جاتا ہے، سو تین سطری شاعری کی تین سطری شاعروں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔۔ ماشا اللہ۔'' (ص ۱۱۵،

شاعری کا جاپانی پھل)

ڈاکٹر سلیم اختر کی اس مقبول اور زندہ کتاب کا حتمی تعارف اور احاطہ ناممکن ہے، ڈاکٹر صاحب کی یہی ایک تصنیف، تالیف، تاریخ اور تحریر انھیں ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے بل کہ باقی سب کچھ اضافی ہے۔

پاکستان میں اُردو ادب سال بہ سال

۱۹۸۷ء۔۱۹۷۷ء، کتاب کی اشاعت ۱۹۸۸ء میں ہوئی۔ کتاب گیارہ ابواب میں مشتمل ہے۔

ادبی جرائد کے اقبال نمبر۔۔ایک جائزہ، ۱۹۷۸ء میں تنقید، نثر کی بیلنس شیٹ ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۰ء، نثری ادب کا کامیاب سال، ۱۹۸۱ء، اُردو فکشن کا سال، ادب میں تخلیقی تنوع کا سال، ۱۹۸۲ء تخلیقی مدوجزر کا سال ۱۹۸۳ء، پاکستان کا تخلیقی منظرنامہ ۱۹۸۴ء، لوڈشیڈنگ۔تخلیقات اور ۱۹۸۵ء، جمہوریت میں ادب کے ۳۶۵ دن (۱۹۸۶ء کا تخلیقی میزانیہ) اور ادب کا بارہ ماسہ ۱۹۸۷ء

مصنف نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ گزشتہ گیارہ برس کے دوران میں تحریر کردہ سالانہ ادبی جائزے کتابی صورت میں مرتب کرتے وقت اس کے ذہن میں ان تمام سوالات کی گونج تھی، جو سالانہ ادبی جائزوں کی ضرورت، افادیت اور اہمیت کے بارے میں اس سے کیے جاتے رہے ہیں کہ ان جائزوں کی ضرورت، افادیت اور اہمیت کیا ہے؟ تنقید کے میدان میں ان کی قیمت کیا ہے؟ ان جائزوں سے مصنفین کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور کیا قاری کا اس کارِ خیر سے کچھ بھلا ہوتا ہے؟

ان سوالات کا جواب تلاش کرتے ہوئے مصنف نے خود ہی اس کے معیارات مقرر کردیے ہیں کہ جائزہ نگار کو اپنے جائزے کو جامع بنانے کے لیے ادب کے مختلف شعبوں اور اصناف سے وابستہ زیادہ سے زیادہ کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جائزے کی اساس تنقید پر استوار ہونی چاہیے، تنقیدی اساس کو مستحکم ہونا چاہیے، تخلیق اور تخلیقی عمل، جائزہ لینے کی ضرورت ہے، صاحبِ کتاب کے تخلیقی تعطل کا بھی جائزہ لینا چاہیے بقول مصنف:

> ''غیر تخلیقی اور بے معنی کتاب، جس برس بھی چھپے گی وہ غیر تخلیقی اور بے معنی ہی ثابت ہوگی۔ جب کہ خوبصورت تخلیق کی خوشبو کو کسی خاص برس کے مرتبان میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔ زندہ تخلیقات کی داخلی توانائی انھیں وقت کے جبر سے آزاد کرادیتی ہے اور وہ ہر عصر کے لیے زندہ معانی کی حامل ثابت ہوتی ہیں۔''

(ص ۱۲)

دراصل سالانہ ادبی جائزہ معاصر ادب کا ریکارڈ ہے، اس لیے یہ مستقبل کے ادبی مورخ کے لیے بھی سود مند ثابت ہوتا ہے۔ تخلیق مسلسل عمل کا نام ہے، جس میں تخلیق کار اپنی ساری عمر بسر کر دیتا ہے۔ اس طرح سالانہ ادبی جائزے بھی حوالہ جات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''بطور نقاد مجھے ہمیشہ احساس رہا ہے کہ سالانہ ادبی جائزوں میں اختصار اور کتابیاتی کوائف پر زور دینے کی بنا پر اہم ادبی رجحانات کا تجزیہ اور تخلیقی میلانات میں تغیرات کا مفصل مطالعہ ممکن نہیں، زیادہ سے زیادہ چند اشارات دیے جا سکتے ہیں جو مجمل، نامکمل اور خام بھی ہو سکتے ہیں۔'' (ص ۱۵)

اپنی اساسی صورت میں تخلیقی تغیرات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے کوشش کی ہے کہ یہ جائزے مختصر لیکن جامع ہوں اور ان میں تخلیق کاروں کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے ادبی موسموں کا بھی احاطہ کیا جا سکے۔ اس میکانکی عمل میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

۱۹۷۷ء سے ڈاکٹر سلیم اختر نے سالانہ جائزے لکھنے کا آغاز کیا تھا جو لمحہ موجود تک قائم ہے۔ لوگ سال بھر، ان کی اس تحریری رائے کا انتظار کرتے ہیں۔ ان جائزوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ یہ محض صحافتی رپورٹ بننے کے بجائے بہترین کتابوں کے انتخاب کی کسوٹی شمار کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے متعدد انٹرویوز میں دیباچوں اور فلیپوں سے اظہار بےزاری کیا ہے لیکن اس تنقیدی اور بزرگانہ اشیرباد پر کتابوں کے اعتبار کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ سلیم اختر کے سالانہ جائزوں کا تنقیدی رنگ ایک کارآمد تنقیدی اشارہ ہے جو کتاب کی تعریف و توصیف کے لیے اسی بزرگانہ اشیرباد کا کام دیتا ہے۔

اُردو زبان کی مختصر ترین تاریخ

اسے ۱۹۹۵ء میں مقتدرہ قومی زبان نے شائع کیا، کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، جن کی تفصیل اس طرح ہے: زبان کیا ہے؟ اُردو زبان کے نام، اُردو زبان کا آغاز، اصلاحِ زبان کی تحریکیں، اُردو رسم الخط، اُردو میں لغت نویسی، اُردو میں قواعد نگاری، اُردو میں تراجم اور وضع اصطلاحات۔

لسانیات پر معیاری کام کی ضرورت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، چناں چہ یہ کتاب ماہرین کے بجائے ان قارئین کے لیے لکھی گئی ہے جو لسانیات کے بنیادی مباحث سے آشنائی کے خواہش مند

ہیں۔زبان کا مطالعہ حرف ونحو سے بڑھ کر اساطیر، آثار قدیمہ، علم الانسان اور علم تاریخ کے مراحل لے کر رہا ہے اس طرح زبان کی تشکیل کسی بھی قوم کی تہذیبی و ثقافتی اقدار اور افراد کی شخصی رجحانات کی تصویر پیش کرتی ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی اس کتاب میں ان تمام مباحث کو پیش نظر رکھا ہے۔ کتاب میں مواد کی پیش کش کا انداز اگر چہ ''مختصر ترین تاریخ'' ادب والا ہی ہے اور اس میں بھی سنسنی خیز عنوانات، تنوع اور رنگینی پیدا کرتے ہیں لیکن موضوع کا پھیلاؤ مختلف ہے۔ خاص طور پر اُردو میں قواعد نگاری اور اُردو تراجم و اصطلاحات کے ابواب بہت محنت سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے کہ پاکستان میں اصطلاح سازی کے ضمن میں ہمیں اپنے مخصوص حالات کی روشنی میں ایک اور لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ اُردو کے اہلِ علم وفکر، محققین، مترجمین اور ماہرین لسانیات نے ایک صدی ان تراجم میں صرف کردی مگر اصطلاحات کے تراجم کا تنوع ابھی تک عدم معیار کا مظہر ہے۔

گزشتہ چالیس پچاس سالوں میں پاکستانی علاقائی اور دوسری قومی زبانوں کے متعدد الفاظ اُردو زبان میں شامل ہو چکے ہیں اور اس عمل میں مزید تیز رفتاری کا امکان ہے۔ اسی طرح انگریزی کے بیشتر الفاظ اُردو لغت میں اضافہ کر چکے ہیں۔ دیکھا جائے تو اُردو کا یہ مسئلہ ہی نہیں کہ کون سے الفاظ کو اپنائے اور کون سا لفظ ترک کرے، اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ کسی بھی لفظ کو اپنی ادائیگی اور املا میں جگہ دے سکتی ہے۔ مصنف اس بات سے متفق ہے کہ زبان کو مفرس اور معرب بنانے کے بجائے اس کی جدید ساخت پر توجہ دی جانی چاہیے۔

اُردو زبان کیا ہے

۲۰۰۳ء میں شائع ہونے والی اس کتاب کا بنیادی مواد وہی ہے، جو''اُردو زبان کی تاریخ'' میں استعمال کیا گیا تھا، البتہ اس میں ایک اور باب کا اضافہ کیا گیا ہے جس کا نام ''اُردو لسانیات، نگاہِ بازگشت اور مستقبل'' رکھا گیا ہے، مصنف کا خیال ہے کہ عالمی لسانی تناظر میں اُردو لسانیات خاصی کم عمر نظر آتی ہے، پاکستان میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے، جو زبان میں خالصیت اور تہذیبی و ثقافتی طہارت پسندی کا قائل ہے گویا زبان کے عمل کو روکنا چاہتا ہے، حالاں کہ کسی بھی زندہ زبان کے فروغ کو روکا نہیں جاسکتا۔
اصطلاح سازی کے ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ۱۹۹۳ء میں ایک کتاب اصطلاح سازی، تاریخ، مباحث کے نام سے مرتب کی، جسے مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور نے شائع کیا۔
تاریخ سازی کے عمل میں ڈاکٹر سلیم اختر کے مرتب کردہ پاکستانی ادب کے وہ شمارے بھی قابل ذکر

ہیں جن کا نثری انتخاب ۱۹۹۲ء، ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۴ء، ۲۰۰۰ء اور ۲۰۰۴ء میں اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کیا اور پاکستان میں اُردو نثر کے مختلف رجحانات کے علاوہ انفرادی طور پر لکھنے والوں کی تحریروں کو سند کی حیثیت عطا کی۔ میر امن سے میرا جی تک۔ یہ کتاب ۲۰۱۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز نے شائع کی ہے اور اس میں مرحلہ وار کتابوں پر ڈاکٹر سلیم اختر کے مقدمات شامل ہیں۔

عمومی نفسیات اور ڈاکٹر سلیم اختر

انبالہ کے منڈی بازار میں سانپ اور نیولے کی لڑائی دیکھتے دیکھتے شعوری طور پر بالغ ہونے والے سلیم اختر کو ایک دن لفظوں کی دنیا میں قدم رکھنا تھا۔ یہ بات اسے مجمع باز داستان نگاروں اور ان کی عیارانہ دردیشی نے بہت پہلے سمجھادی تھی۔ وہ ہر روز یہ کہانی اور لڑائی کے عملی نمونے دیکھنے بازار تک جاتا ہر بار کہانی اور لڑائی ادھوری رہتی چناں چہ اس تجسس کے عذاب سے بچنے کے لیے اس نے کتابوں کے صفحات پر یہ بازار سجالیا۔ کالج پہنچا تو فلسفے کے مضمون میں داخلہ لے لیا۔ نفسیات کے موضوع پر انگریزی کتابوں سے استفادہ شروع کیا اور نفسیات کے تین اژدھے اپنے دماغ میں لیے گھومنے لگا، فرائیڈ، یونگ، ایڈلر۔ چھوٹے موٹے سانپ اور چھوٹے موٹے نیولے ہمیشہ سلیم اختر کی زنبیل میں رہے بل کہ کہنا یہ چاہیے کہ مٹھی بھر سانپ اور ان کا زہر خود مصنف کی تحریروں میں گھل گیا۔ اس علم انسانی نے سلیم اختر کو حکمت کے اس درجے پر فائز کیا جہاں قریبی احباب مشورہ بندی کے لیے ہمیشہ اکٹھے رہے۔ کنوارپن کے باوجود سلیم اختر اپنے شادی شدہ دوستوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے رہے، اس کے ساتھ ساتھ خودشناسی کا عمل شروع ہوا، شخصی تحلیل نفسی کے لیے انھوں نے اپنی ذات کا انتخاب کیا اور اپنی شخصیت کے کئی مخفی پہلو کھوجنے میں کامیاب رہے۔ اس ذاتی تحلیل نفسی کا عنوان ہے ''میں'' جسے مارچ ۱۹۸۴ء میں رسالہ الفاظ نے کراچی سے شائع کیا اور اب وہ ان کی سرنوشت میں شامل ہے۔ خواب میں دکھائی دینے والی عورت آخر کار ژونگ کی نظریاتی تربیت کے مطابق تکمیل وجود کی علامت بنتی ہے اور یہیں سلیم اختر کا خیالی پیکر اور حقیقی دنیا کی عورتیں، ایک دوسرے کی نفی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

''خواب کی وہ عورت زندگی بھر مجھے ہانٹ کرتی رہی۔ چناں چہ زندگی میں ملنے والی مونثوں کا میں اسے موازنہ کرتا رہا اور اس کے مقابلے میں وہ مجھے بدصورت اور بہت 'ولگر' نظر آئیں۔ چناں چہ مارے کراہت کے میں پیچھے ہٹ جاتا، ان کی آوازوں کی کرختگی، ہاتھوں کا کھردراپن، پاؤں کا ضرورت سے زیادہ بڑا ہونا اور سب سے بڑھ کر ان کی نیتوں کا نیک نہ ہونا، یہ سب مجھے ان سے بے زار کردیتا تھا۔ اب اگرچہ وہ بات تو نہیں مگر اب بھی میں مونث سے محض مونث

کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہوں۔ ایسی سرشاری جو محض اعصاب سے مشروط نہ ہو اور ایسی دلبری جو محض دل لینے دینے کی سوداگری نہ ہو۔ ظاہر ہے یہ سب ناممکن ہے۔ اس سے لاتعلقی پر مبنی جس رویے نے جنم لیا، اس نے مجھے نفسیاتی مضامین اور افسانے لکھنے میں بہت مدد دی۔ جنس پر لکھنے میں دو بڑے خطرات مضمر ہیں ایک یہ کہ مصلح اخلاق نہ بنا جائے، دوسرے سنسنی خیز نہ بنا جائے۔''

سلیم اختر نے اعتراف کیا ہے کہ بی۔ اے کے بعد ان کے پاس ڈگری کے علاوہ فرائیڈ کے فلسفے کی تربیت یافتہ اعصابیت بھی تھی، جس میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا اور انھوں نے خودشناسی یا خود تشخیصی کے لیے نفسیات کا سنجیدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ وہ خود نیوراتی ہونے سے بچے دوسرے اوروں کے نفسیاتی مسائل اور ذہنی الجھنوں کے بھی دروازے کھلنے لگے۔ ان موضوعات پر قارئین کی خطوط نویسی اور خواتین سے رسمی و رومانی ملاقاتیں بھی تحلیل نفسی کے عمل پر ہی منتج ہوئیں۔ ایک عمر گزرنے پر مصنف کو احساس ہوا کہ خواب کی عورت دراصل اس کے اپنے وجود ہی کا حصہ ہے۔ یہ اینما Anima ژونگ کی نفسیاتی اصطلاح میں مرد میں موجود نسوانی روح کا علامتی نام ہے۔ مصنف کی پہلی کتاب اسی علامتی تصور کی جستجو ہے۔ یہ کتاب ''عورت، جنس اور جذبات'' ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ اب تک اس کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

شرم اک ادائے ناز ہے، زیورات، چار گرہ کپڑے کی قیمت، بلبل کے کاروبار، ایک صورت یہ بھی ہے اظہار کی، چھیڑ خوباں سے چلی جائے، عورتوں میں اذیت پرستی، غمزہ سے شترِ غمزہ تک، جنت پر پاؤں، شیشے میں بال، بیوی! بیوی!!، اصطلاحات۔ کتاب سعیدہ کے نام ہے، جو بقول مصنف محبوبہ بھی ہے، دوست بھی اور بیوی بھی، اس تثلیثی انتساب کے بعد قارئین کو سمجھ جانا چاہیے کہ کتاب کے اندرونی صفحات میں وہ سنسنی خیزی اور ہیجان نہیں، جو کتاب کے نام میں رکھا گیا ہے۔ مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے:

''میرے نزدیک ان مضامین کی سب سے بڑی خامی (یا خوبی) یہ ہے کہ یہاں عورت کو تبرک کی چیز سمجھتے ہوئے اس کا مطالعہ نہیں کیا گیا اور نہ ہی اسے ''بھولے بھالے مردوں'' کو ورغلانے والی ساحرہ کے رُوپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان میں پیش کردہ خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے

میرے خلوص پر حرف نہیں آسکتا۔ ان مضامین سے اگر بعض خوش آئند تصورات کو ٹھیس پہنچے یا عورتوں کے بارے میں کچھ عقائد انڈے کے چھلکے کی طرح ٹوٹتے محسوس ہوں تو معذرت نہ چاہوں گا، کیوں کہ میں نے تعصبات کے جالے سے اپنے ذہن کو صاف کر کے یہ مضامین تحریر کرنے کی کوشش کی ہے۔"

(ص ۱۰)

جیسا کہ مضامین کے عنوانات سے ظاہر ہے سلیم اختر نے شرم، نرگسیت، نمائش، تزئین جمال، آرائش حسن، زیورات، لباس، جامہ زیبی، فیشن، محبت، احساس جرم، مثالی مرد، گھبراہٹ، جذباتی ناآسودگی، مامتا، ناز نخرے، چھیڑ خانی، اذیت پسندی، جسمانی ہیجانات، ماں اور جنت کا علامتی تصور، خانگی ذمہ داریاں، عفت و عصمت کے عمومی تصورات، شادی، بیوی کے اصطلاحی تصور، نیم شریفانہ اور نیم طوائفانہ زندگی کے امکانات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک کارآمد کتاب ہے اور مصنف کے افادی طرز تحریر کے امکانات کو بڑھاوا دیتی ہے۔

شادی جنس اور جذبات، مرد جنس کے آئینے میں، عورت جنس کے آئینے میں، ہماری جنسی اور جذباتی زندگی پہلی کتاب کی طرح انسانوں کی روزمرہ زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔

ہماری جنسی اور جذباتی زندگی

۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ کتاب چھبیس ابواب پر مشتمل ہے۔ خوب سے ہے خوب تر کہاں، محبت: نفسیات کی روشنی میں، مامتا کی نفسیات، اف میری ساس! ہائے میری بہو، سوت رے سوت تری کونسی کل سیدھی، عورت اور فلم، دھی بھلے، ناول اور جذبات، یہ روتے منہ بسورتے بچے، کھلونے اور بچوں کی نفسیات، شادی، جنس اور بچہ، خاندانی منصوبہ بندی (ایک نفسیاتی جائزہ) گھونگھٹ اور مونچھیں، ڈائری: ایک نفسیاتی سہارا، تعلیم اور نفسیاتی تقاضے، قارئین کی نفسیات، توحید پرستوں کی بت پرستی، دوستی ایک نفسیاتی تجزیہ، کامیابی کی نفسیات، گالی کے نفسیاتی معنی، خوف کے نفسیاتی معانی، خواہشات اور تعمیر شخصیت، غم۔۔ جو بے کراں ہے، آنسو اور نفسیات، خودکشی: نفسیاتی مطالعہ، چائے یا چارۂ غم دل، بڑھاپے کا استقبال۔

بقول مصنف:

"جدید انسان کا المیہ یہ ہے کہ اسے تینوں جہنموں کی آگ میں جلنا پڑ رہا ہے اور

اسی لیے ذہنی عوارض میں مبتلا مریضوں اور خودکشی کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ منشیات کا استعمال اور جنسی واخلاقی جرائم میں اضافہ اس پر مستزاد ہیں، امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کے برعکس ہمارے ہاں نہ تو جدید ترین ذہنی شفاخانے، ماہرین نفسیات اور نفسی معالجین ہیں اور نہ ہی اس نوع کے اعداد و شمار مدون کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ اس لیے بظاہر تو ہمارا معاشرہ بڑا صحت منداور پاک وصاف ہے، لیکن حقیقت ہمارے گلی کوچوں میں عریاں ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی ہم جس اعصابی خلل میں مبتلا ہیں اس کی معمولی سی جھلک ہمارے اخبارات کے صفحات پر جلوہ گر ہوتی ہے۔" (ص ۸)

زیرنظر کتاب میں موضوعات کا تنوع ہے اور جن ذہنی مسائل سے بحث کی گئی ہے، وہ ذہنی زندگی کے بیشتر امور اور انسانی شخصیت کے بہت سے پوشیدہ گوشوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ مصنف نے تلون پسندی، شکست خوردگی، احساس کمتری، جسمانی عیوب کی شرمندگی، محبت کی کشمکش، مامتا کی نفسیات، ساس بہو کی نفسیاتی آویزش، سوت کی موجودگی اور زنانہ تصرفیت، عورتوں کے ہیجانات اور المیہ فلموں کا تزکیہء نفس، فلمی مجرمانہ حملے کی دہشت اور عورتوں کی لاشعوری تسکین، بچوں کے جذباتی الجھاؤوں، کھلونے اور بچوں کے درمیان جذباتی آسودگی، محبوبہ اور بیوی کا فرق، بچوں کی پیدائش اور مصنوعی بارآوری کے معاملات، جائز اور ناجائز بچے کے مباحث، آدمیوں کا عورتوں کی طرح بننا سنورنا اور رنگین پوشاکیں پہننا، ڈائری، خودکلامی اور تطہیر جذبات کے منفی اور مثبت طریقے، تعلیم کے نفسیاتی تقاضے اور بچوں کی ذہنی کیفیات جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا ایک مضمون توحید پرستوں کی بت پرستی تصوف کے نازک موضوع سے ہوتے ہوتے پیروں کی کرامات اور شوہروں کی خوشنودی پر آ کر رکتا ہے۔ بقول سلیم اختر:

"بت آرزوؤں اور دعاؤں کے لیے جو کھونٹیاں مہیا کرتے تھے، اب یہ کھونٹیاں پیروں کی شکل اختیار کرگئی ہیں، خدا سے لوگوں کو پہلے بھی امید نہ تھی اب بھی نہیں۔ بتوں سے لوگ ہمیشہ امیدیں پاتے رہے ہیں، اب بھی پاتے ہیں اس لیے کہ خدا تو صرف جائز امیدیں پوری کرسکتا ہے اور بتوں کے یہاں چوردروازے بہت ہیں۔" (ص ۱۳۳)

عورت جنس کے آئینے میں

اس کتاب کا سن اشاعت ۱۹۷۶ء ہے۔ کتاب میں دس مضامین شامل کیے گئے ہیں، جو مختلف اصحاب کے لکھے گئے، مضامین کا ترجمہ ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے:

عورت شباب کی دہلیز پر، ہیلن ڈوئچ، جنسی ابال، دباؤ اور ارتفاع، ہیولاک ایلس، مرد اور عورت ترازو کے دو پلڑے، مارگریٹ میڈ فطری وضع حمل، فریڈاک ڈبلیو گڈریچ، شاید اسی کا نام محبت ہے، آسولڈشوار، مامتا، تھریسے بینڈک، عورت جنس اور محبت، ہیولاک ایلس، طوائف کی نفسیات، ایڈورڈ گلوور، سہیلیوں سے جنسی لگاؤ، کلارا تھا مپسن، عورت زندگی کے موڑ پر، ایمل نووک۔

اس کتاب کے زیادہ مضامین عورت کی پیدائش سے ماں بننے کے عمل اور پھر بڑھاپے کی لاتعلقی سے متعلق ہیں۔ کتاب میں استعمال کی گئی اصطلاحات کا اُردو ترجمہ بھی کتاب کے آخر میں درج ہے۔

مرد جنس کے آئینے میں

۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مختلف موضوعات پر ترجمہ شدہ مضامین شامل ہیں، جو مردانہ مسائل اور معاملات کے علاوہ سماجی زندگی کے شعور پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ترجمہ سلیس اور رواں ہے۔ مضامین کی تفصیل اس طرح ہے:۔

بچہ اور جنس، ہیولاک ایلس، جنسی اعضاء کی کہانی، ایف ایچ مارشل، مرد کا جنسی سفر، سگمنڈ فرائیڈ، جنسی کارکردگی میں مہارت، کینتھ واکر، جنسی خوف کی علامت۔ نامردی، کارل اے مینجر جنسی انحطاط، گریگور لرمارنن، کنواروں کی جنسی زندگی، ارنسٹ آر گریور، طوائف کے خریدار، آسوالڈ شوار، باپ کی نفسیات، تھریسے بینڈک، ہم جنس یا ہم جنس پرواز، ایڈورڈ ویسٹر مارک۔

اس وقت جب دنیا میں جینڈرازم کا فیشن عام ہے اور مرد وزن کی ساخت اور ان کے جسمانی و روحانی مسائل کی گفتگو روزمرہ کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ شاید سلیم اختر کے یہ تراجم اس سنسنی خیزی کے عکاس نہ ہوں جو آج سے چالیس سالہ پہلے کی دنیا میں محسوس کیے گئے، مترجم نے موضوعات کے ساتھ انصاف کیا ہے اور بہت سے جسمانی مغالطوں کو زیر بحث لا کر عوام الناس کو اپنے مسائل خود سمجھنے کی ترغیب دی ہے، سلیم اختر کی تحریروں کے افادی پہلو سے انکار مشکل ہوگا۔

شادی، جنس اور جذبات

یہ کتاب بھی ۱۹۷۶ء میں ہی شائع ہوئی۔ شادی ایک سماجی سمجھوتے کے طور پر انسانی زندگی کے کامیاب یا ناکام ہونے کی کسوٹی سمجھی جاتی ہے۔ ازدواجی زندگی کی الجھنیں، کامیابیاں اور ناکامیاں مرد و زن کو اعتماد، حوصلہ مندی، روشن خیالی، عزم اور فتح مندی کے ساتھ ساتھ معاشرتی مقام دلانے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جسمانی خواہشات کی تکمیل اور آسودگی، مرد کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں وہ بھی ترجمہ ہیں اور ان کی تفصیل اس طرح ہے:

میری شادی میں کیا خامی ہے (سو شوہروں کا فیصلہ)

میری شادی کیوں ناکام ہوئی :بی وی ہملٹن رکینتھ میک گوون

سو بیویوں کا اعتراف

انسانی زندگی اور جنس کی بدلتی اقدار: مارگریٹ میڈ

جنسی کارگزاری اور جنس کی بدلتی اقدار: جوفرے گوربر

عورت کی جنسی زندگی: مارگریٹ میڈ

یہ کنوارے یہ کنواریاں: لارا ایٹن

ہمارے تنگ اور جنس زدہ ماحول میں اس قسم کے موضوعات پر بات چیت کرنا اتنا آسان نہیں۔ زبانِ غیر ہی سے سہی، سلیم اختر نے معاشرتی مسائل کے لیے اپنا حصہ ضرور بٹایا ہے۔ شادی، جنس اور جذبات کے الفاظ سے افراد نے از خود جو تصوراتی اور افلاطونی تصورات اخذ کر رکھے ہیں ان کی افسانویت سے عہدہ برآ ہو کر زندگی کو عملی شاہراہ پر چلانے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی کتابیں بڑے پیمانے پر ذہنی اور سماجی عوارض سے چھٹکارے کا باعث ہیں۔ ان مضامین میں تجسس اور ڈرامائیت بھی ہے اور منظر نگاری بھی۔

صبح کرنا شام کا، روزانہ چوبیس گھنٹے کیونکر رہا جائے، آرنلڈ بینٹ کی کتاب کا ترجمہ How to live Twenty four hours جسے ۱۹۶۱ء میں ناشرین نے شائع کیا۔ اس کتاب کا معترف ڈیل کارنیگی بھی ہے کتاب کے ابواب اس طرح ہیں:

روزمرہ کا معجزہ، خوب سے خوب تر کہاں، بس چھلانگ لگا دیجئے، ڈبے میں ڈبہ، قلم کا شو اور غیر فانی روح، آرام کا حسن، وحشی گھوڑے کے منہ میں لگام، خود شناسی، ایک لحہ فکریہ، فنون لطیفہ سے دلچسپی، علت اور معلول کی آنکھ مچولی، سنجیدہ مطالعہ، بعض خطرات۔

جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہے، کم و بیش سب مضامین عمومی زندگی کو بہتر طریق سے بسر کرنے کے

لیے راہنمائی مہیا کرر ہے ہیں۔ اس کتاب کے اثبات کا ایک نمونہ خود مصنف کی کامیاب زندگی بھی ہے۔

ایک لحاظ سے اسے سلیم اختر کی پہلی تالیف کا درجہ دیا جاسکتا ہے جو آنے والے دنوں میں مفید ادب کے لیے ان کی فکر کا راستہ متعین کر رہی ہے۔

ستائیے اور زندگی بڑھائیے

یہ کتاب جوزف کینیڈی کی کتاب Relax and live کا ترجمہ ہے۔ جس میں مصنف نے جسمانی تربیت اور فزیوتھراپی کے زیر اہتمام ستانے کے سیدھے سادھے اصول بیان کیے ہیں۔ تناؤ کی مختلف علامات مثلاً سردرد، بدہضمی، بے خوابی، تھکان کو جسمانی تربیت سے دور کر کے بہتر کارکردگی اور مسرت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ مصنف نے کتاب کو ان عنوانات سے سجایا ہے:

ستانے کا عمل، غیر متحرک ستاہٹ کا فارمولا، تناؤ اس کی پہچان اور خاتمہ، دورانِ تنفس میں کمی، ذہنی تصورات، ستانے کے لیے اہم ہدایات، جلد بازی سے بچیے، پرسکون نیند کے طریقے، ستانا، تسخیرِ عالم، کام بلا تکان، خوف اور اس سے نجات، خراب عادات کا ترک کرنا، تناؤ اور انسانی تعلقات، جوانی کا راز ستانا، ستانا: ایک طرزِ حیات۔

یہ پندرہ نکات سکون اور مسرت کی کنجی ہیں، اسلوب ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ کہیں بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا۔ مترجم نے بھی نفسیاتی موضوع کی اس کتاب کے ساتھ انصاف کیا ہے:

> ''یہ تجویز میری ذاتی اور اپنی نہیں ہے بل کہ یہ سب سے زیادہ باہوش، باعمل اور باہمت لوگوں کی تجویز ہے۔ میں تو آپ کی خدمت میں اسے ''سیکنڈ ہینڈ مال'' کی طرح پیش کر رہا ہوں۔ آپ اپنے ذہن کو اپنے بس میں کر لیں، اس پارہ کو اپنی مٹھی میں بند کر لیں، آپ خود ہی محسوس کریں گے کہ اس عمل کے دوران ہی زندگی کی نصف مشکلات پر آپ حاوی ہو چکے ہیں، جن میں سب سے اہم اور نمایاں ترین کا نام ہے۔ پریشانی۔ پریشانی تارِ عنکبوت کے مانند غیر محسوس کن انداز سے آپ پر قابو پالیتی ہے اور دھیرے دھیرے آپ کی صلاحیتوں کو سلب کر کے رکھ دیتی ہے مگر آپ مندرجہ بالا عمل کے دوران ہی میں اس جال کے طلسم ہوشربا کو شکست دے کر عروسِ کامرانی سے ہمکنار ہوں گے۔''

(روزانہ چوبیس گھنٹے کیوں کر رہا جائے ص ۷۲۔۷۱)
یہ تخلیق نما تراجم ڈاکٹر سلیم کے ایک مخصوص رجحان اور موضوع سے سنجیدہ محبت کے غماز ہیں۔

تین بڑے نفسیات دان

۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں، تیسرا ۱۹۹۴ء میں اور چوتھا ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آیا۔ بظاہر یہ عمومی مطالعے کی کتاب نہیں لیکن تین بڑے نفسیات دان فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر ایک عرصے سے نفسیاتی تنقید و تحقیق کے آسمان پر اس طرح سے چھائے ہوئے ہیں کہ عمومی گفتگو میں بھی لوگ ان کے حوالے دیتے رہتے ہیں۔ سلیم اختر نے اسی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے تینوں کی زندگیوں اور بنیادی معلومات پر قلم اٹھایا ہے۔ فرائیڈ کی ذاتی زندگی، اس کے نفسیاتی مطالعے، اس کے نظریہ جنس، نظریہ خواب اور تحلیل نفسی کے طریقوں پر بات چیت کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر ژونگ کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے نظریہ لاشعور، خواب اور نفس کی پیچیدگیوں کا احاطہ کرتے ہوئے وہ ایڈلر کی طرف لوٹتے ہیں۔ ایڈلر کے حالاتِ زندگی، نظریات، شخصیت کی تشکیل، بچوں کی نشوونما، عصابیت، نظریہ جنس وخواب کا تذکرہ کرتے ہوئے سلیم اختر ایک تقابلی مطالعے کا منظر پیش کرتے ہیں۔

فرائیڈ کی ذاتی زندگی کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے، یہی حال یونگ اور ایڈلر کا ہے۔ یہ کتاب دلچسپی کے اعتبار سے ڈاکٹر سلیم اختر کی کامیاب ترین کوشش ہے۔

بنیاد پرستی

یہ کتاب ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی، کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے، جن کی تفصیل اس طرح ہے:
صحیفہ افلاک کے قاری، جہالت کی کشتی خوف کے بادبان، منطق کے گھاؤ، مگروہ علم کے موتی، اک صورت خرابی کی، بنیاد پرستی، فساد۔۔ فی سبیل اللہ، ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا، فحاشی اور عریانی کا سیلاب، عورت چھوٹے فریم میں بڑی تصویر۔ کتاب کے ذیلی موضوعات مزید چونکا دینے والے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب چھوٹی چھوٹی تصویروں سے ایک بڑا منظر نامہ بناتی ہے۔

کتاب کا پیش لفظ اپنے اندر ڈرامائی اور مکالماتی شان رکھتا ہے۔ مصنف نے کتاب کے عنوان پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''بنیاد پرستی' ایسے سوالات کے بارے میں ہے، جو علم و عمل میں مذہبی شخصیات کے طرزِ عمل سے جنم لیتے ہیں۔ ایسے سوالات جو تاریخی، تہذیبی، تمدنی اور عمرانی نوعیت کے حامل ہیں، ایسے سوالات جنھیں عقل جنم دیتی ہے اور ایسے سوالات جو سائنس، فلسفہ اور منطق کی تکذیب سے معرض وجود میں آتے ہیں اور عقل کا عدم فروغ جن کی شدت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں اگرچہ ایسے سوالات کرنا معیوب ہے کیوں کہ یہاں آبادی کا کثیر حصہ اعمال میں عملاً مذہب کی نفی کے باوجود اقوال میں مذہب مذہب کرتا ہے۔ ہاں! پاکستانی مسلمان سور نہ کھانے کے معاملے میں واقعی سچے مسلمان ثابت ہوتے رہے ہیں۔ یہ ہماری اجتماعی نفسیات کا عجب پُر تضاد مظہر ہے کہ سور سے اجتناب کے بعد باقی سب کچھ روا ہے۔'' (ص ۹)

مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ ''ہمارے ہاں بیشتر امر میں شماریاتی مواد مدون کرنے کی روایت نہیں، جس کے باعث حقائق کے بجائے ظن و تخمین سے زیادہ کام لیا جاتا ہے حالاں کہ شماریاتی مواد اپنا ثبوت خود مہیا کرتا ہے۔ سو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اخبارات کی خبروں پر زیادہ تر انحصار کیا گیا ہے۔ شاید بعض اصحاب کو یہ ''صحافتی'' محسوس ہو مگر یہ میرے طریق کار کی مجبوری تھی۔ میں نے ادبی تنقید کی، نفسیاتی مضامین لکھے، جنسی افسانے رقم کیے، تخلیق سے وابستہ مسائل و مباحث پر لکھا، تخلیقی شخصیات کو موضوع بنایا اور سالانہ ادبی جائزے قلم بند کیے۔ یہ دنیا کے کام تھے مگر ''بنیاد پرستی'' عاقبت کے لیے ہے۔'' (ص ۱۰)

کتاب میں قدیم یونانی علمی تصورات، جمال پرستی کی سائنس، آسمان اور زمین کے گردشی موضوعات، فلکیات، کلیساؤں کی نیابت، چرچ کے غیر محدود اختیارات، منطق، اسلامی فلسفہ کے مباحث سے گزرتے ہوئے، مصنف اپنے اصل موضوع بنیاد پرستی کی طرف آیا ہے۔ بقول اس کے

''عالمی سطح پر بنیاد پرستی کی اصطلاح کا آٹھویں دہائی میں زیادہ چرچا تھا، تاہم جہاں تک بنیاد پرستی کا تعلق ہے تو موجودہ صدی کے آغاز میں شمالی امریکہ میں اس کا باضابطہ آغاز Bapitists,Disciplers of christ, Methodists,Presbytrains جیسے مسالک کی مساعی کی صورت میں ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد ان امور پر ہے:

الف۔ بائبل الہامی ہے، ب۔ ہر عہد کے لیے ابدی صداقت کی حامل ہے ج۔ عقیدہ تثلیث د۔ حضرت عیسیٰ کی بن باپ پیدائش ر۔ تخلیق کائنات کا تصور بائبل درست ہے ص۔ ہبوط آدم ش۔ مصلوب ہو کر مسیح نے تمام انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ ص۔ مصلوب ہو جانے کے بعد حضرت عیسیٰ کی جسمانی حیات نو اور پھر آسمان کو پرواز، ک۔ مسیح کی آسمان سے زمین پر واپسی اور پھر ہزار برس تک دنیا میں حکمرانی، گ۔ موت کے بعد سچے عیسائیوں کی حیات نو اور پھر جسمانی وجود کے ساتھ آسمان پر جزا اور سزا حاصل کرنا۔''

برصغیر میں بنیاد پرستی کا آغاز صحیفہ نعتِ محمدی کے مولف کے بموجب، شمس الدین التمش کے زمانے میں ہوا کہ ہندوؤں کے ساتھ ''اما القتل واما الاسلام'' یعنی یا اسلام قبول کر و یا قتل ہو جاؤ کا طریقہ اختیار کیا جائے، لیکن بادشاہ نے علما کے مشورے پر عمل نہ کیا۔ معقول و منقول کی بحث اکبر کے دین الٰہی تک پہنچی۔ فرنگیوں کے عہد میں دلوں کی نفرتیں مزید بڑھیں اور آخر روحانی زوال نئی زندگی کی ہر شے کو دھتکارنے پر فائز ہوا۔ بنیاد پرستی ملائیت کا لباس پہن بیٹھی۔ روشن خیالی اور عقلیت کے سفر میں منبر اور لاوڈ اسپیکر کی مشقت بھی جاری رہی اور آخر کار بنیاد پرستی سیاسی مفہوم کی حامل ہوئی، جب درویشاں کو کلید جنت قرار دیا گیا اور انسانی جرائم میں اضافہ ہونے لگا۔ آج بنیاد پرست معاشرے کے متعصب مصلح دندناتے پھرتے ہیں۔

مصنف کے مضمون میں جذباتیت کا عمل دخل نہیں ورنہ ابھی تک وہ شہید ہو چکا ہوتا، اس نے اس کے تریاق کے لیے فلسفے، منطق، عقل، تصوف، سائنس، اجتہاد، تحقیق، جمہوریت، آزادیٔ عقیدہ و مسلک کی دوا تجویز کی ہے۔

اسی موضوع سے جڑا ہوا دوسرا مضمون ''فساد فی سبیل اللہ'' ہے۔ یہاں اقبال کی تعلیمات سے استفادہ کیا گیا ہے، سلیم اختر ان مذہبی پیشواؤں کی بہت سی تعلیمات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

عورت: چھوٹے فریم میں بڑی تصویر، عورت کی آزادی اور مرد کے ساختہ معاشرے کی منافقانہ روش کا مضمون ہے جہاں عورت ناگن ہے، دیوی ہے، پاؤں کی جوتی ہے، نیک پروین ہے لیکن انسان نہیں، عورتوں کے ضمن میں مردوں کے اتنے فرمودات ہیں کہ یہ ٹیڑھی پسلی اور پیچیدہ ہو کر رہ گئی ہے۔ سلیم اختر نے سوال اٹھایا ہے:

''حکومت اور قانون تو اپنی سی کرتا ہے لیکن کیا کبھی کسی لاوڈ اسپیکر سے بھی عورت
کے خلاف جنسی اور دیگر جرائم کی مذمت کی گئی ہے؟'' (ص ۲۲۵)

گروہ اور اس کی شدت پسندی کس طرح افراد کی زندگی اجیرن کرتی ہے اس کتاب کے صفحات اسی جبر سے نجات کی دہائی دے رہے ہیں۔

خودشناسی

فرد اور معاشرے کے تعلقات کا نفسیاتی مطالعہ ۲۰۰۱ء میں شائع ہونے والی آخری کتاب ہے، توقع کی جاتی ہے کہ مصنف انھی موضوعات کو آگے بڑھائے گا اور انسانی مطالعے کا سلسلہ جاری رہے گا، یہ کتاب تیس مختصر ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے:

تختہء مشق، ریت کا بھنور، خالی بوتل کا المیہ، چاہِ ذات، حصار بے در و دیوار، آئینہ خانہ، شیشوں کی مسیحائی، آتش فشاں، طوفانِ بادوباراں، معزول حکمران، نمک دان، قصہ نو من تیل کا، راہِ فرار، دو+ دو= پانچ، چاند، پھول، خوشبو، دست طمع دراز، بنجر دھرتی، خشک جو ہڑ، مختصر ترین !طویل ترین، بن پتوار نیا، باز نہیں آتے، کیدو: پاکستانی سٹائل، گل افشانیِ گفتار، پالتو حرکات، گرگٹ کے کزن، ذخیرہ اندوزی، ۔۔ تو یہ احساں ہوتا، شخصیت، چھ زاویے، سفید جہنم، بڑھاپے کا استقبال، جب لاد چلے گا بنجارہ۔

خودشناسی کے عمومی عنوان کے تحت مضامین کا یہ سلسلہ کراچی کے رسالہ ''رابطہ'' کے لیے تحریر کیا گیا تھا، جسے ازاں بعد کتاب کی شکل دی گئی۔ کتاب کے دیباچے میں مصنف نے ان مضامین کے بارے میں لکھا ہے:

''یہ مضامین نفسیاتی تناظر میں فرد کی ان الجھنوں، پریشانیوں، ناکامیوں، نامرادیوں کے مطالعے کی سعی ہیں، جن کے ردِعمل میں لاشعوری طور پر وہ دوسروں کے لیے باعثِ آزار بن جاتا ہے، ان مضامین میں بہت بڑے، گھمبیر، پیچیدہ اور بے حد الجھے نفسی عوارض کا مطالعہ نہیں بل کہ روزمرہ زندگی، عمومی رویوں، عام معاملات و معمولات اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو لیا گیا ہے کہ کیسے یہ ہم میں بھی، کبھی اپنے لیے، کبھی دوسروں کے لیے معاندانہ احساسات کی آبیاری کرتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ کبھی کبھی معمولی سی بات کسی بڑے نفسی

ردِعمل کا باعث بن جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے چیونٹی بعض اوقات ہاتھی کو
زِچ کر دیتی ہے۔'' (ص ۸)

سلیم اختر کے یہ مختصر مضامین انسانی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں اور ہر مضمون انفرادی حیثیت میں مکمل ہونے کے باوجود مرکزی خیال ''خودشناسی'' کے تابع دکھائی دیتا ہے۔ ان مضامین کا موضوع فرد ہے، اعصابیت کے بھنور میں، اعصابی تناؤ، ذہنی خلفشار، ناآسودگی، پژمردگی، بے حسی، عدم مطابقت کے کسیلے ذائقے چکھتا ہوا بے خواب راتوں کی بے ثمر مشقت کا اسیر جوازاں بعد اپنے ہی جیسے مایوس لوگوں کے لیے کیکٹس کی شکل اختیار کرتا ہے اور تکلیف وہی اس کا ٹریڈ مارک بن جاتی ہے۔

اس کتاب میں خودفریبی، فریب خوردگی، دل گرفتگی، احساس کمتری و برتری، مثبت اور منفی طرزِ فکر ڈپریشن جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ڈپریشن کو ''اعصابی اندوہ'' قرار دیا ہے۔ بقول ان کے:

''فرد کیوں کہ خارجی ماحول سے شکست خوردہ ہوتا ہے، اس لیے وہ باہر کی دنیا سے منہ موڑ کر اندر کی دنیا (گھر جس کی علامت بنتا ہے) میں پناہ لیتا ہے۔ وہ خود کو (مفروضہ) دشمنوں میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا وہ گھر کو قلعہ جان کر اپنی جان اور آبرو بچا کر، وہاں گویا پناہ گزین ہو جاتا ہے، جو انتہائی مثالوں میں، معاشرہ سے خودساختہ جلاوطنی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یوں وہ گھر جو پہلے پناہ گاہ تھا اب ایک طرح کے قید خانے میں تبدیل ہو جاتا ہے بل کہ بعض استثنائی مثالوں میں تو ''گزرترسی'' (ایگورافوبیا'' یعنی عام مقامات پر جانے سے خوفزدہ رہنا) کا باعث بن سکتا ہے، یہ وہ نفسیاتی خوف ہے جس کی بنا پر گھر سے نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ تنہائی جب کنوئیں کی صورت اختیار کر کے فرد کو صرف اپنی ذات کا اسیر بنا دیتی ہے تو پھر اس کے لیے اس ''چاہِ ذات'' سے باہر نکلنا دوبھر ہو جاتا ہے۔'' (ص ۳۳، ۳۴)

کتاب میں خوف اور خوف زدگی کی نفسیات کے ساتھ ساتھ الفتِ ذات، نرگسیت، خواب اور ان کے تشکیلی عناصر، غصہ اور حیوانی ہیجانات، ریٹائرمنٹ اور بڑھاپے کی عدیم المثال فرصت، حسد، بغض،

افواہ سازی، الزام تراشی، آئیڈیل کی تلاش، نمائش پسندی، تقدیر تدبیر کے مفروضے، شارٹ کٹ مواقعوں کی ارزانی، جنریشن گیپ، الفاظ کے انتخاب، تکیہ کلام، کیموفلاج سوسائٹی، تصرف اور ذخیرہ اندوزی۔ ہمدری اور احسان مندی کے سماجی عمل کی ترجیحات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر انسانی شخصیت کے چھ زاویوں تک پہنچتے ہیں، جن میں لذتِ انکار، بام بلند، انوکھا لاڈلا، اسلحہ خانہ، کلیرنس سیل اور خوب سے خوب تر، کے ذیلی عنوانات کے تحت انسانی نفسیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے سوال اٹھایا ہے کہ زندگی گزارنے کا بہتر رویہ کیا ہے اور پھر اس کے جواب میں لکھا ہے

> ''جس طرح روپے پیسے کے خرچ میں کفایت شعاری پسندیدہ ہے اسی طرح الفاظ کے خرچ میں بھی بے جا خرچ اور اسراف سے بچیں، کلمہء خیر میں کنجوسی نہ کریں، ہاں کنجوسی ضرور کیجیے مگر کلماتِ شر میں۔۔۔ آپ انسان ہیں ڈیپارٹمنٹل سٹور نہیں۔۔۔ تو پھر کردار وعمل اور لفظ ومعنی کی کلیرنس سیل کس لیے؟ کردار وعمل نہ خریدا جا سکتا ہے اور نہ ہی لفظ ومعنی بکاؤ مال! یہ تو خلوص، یگانگت اور محبت کے اظہار کے لیے مخصوص ہونے چاہیں نہ کہ ان کی قدر میں تخفیف کر کے معاشرے میں ان کی کلیئرنس سیل لگا دی جائے۔'' (ص ۱۹۵)

موت کے خوف / احساس / دھڑ کے بارے میں بھی مصنف کا نفسیاتی جائزہ حقیقت پر مبنی ہے۔ انسان نے ہر حال میں زندگی کی بازی موت سے ہارنی ہے لیکن موت سے پہلے اس کے خوف سے مرجانا کوئی مثبت بات نہیں۔ مصنف زندگی کی امید، عمل اور ثمر مندی پر زور دیتا ہے اور اس طرح اپنی تحریروں کی افادیت کو مزید مستحکم کرنے کا خواہش مند ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت تنقید نگار

ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقیدی خدمات نصف صدی کا قصہ ہے، مصنف کی اپنی شخصیت کے مدارج اور ماحول کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس تنقید کی شعوری صورتِ حال بھی تبدیل ہوتی رہی ہے، عمومی تجربوں کی طرح آغاز میں وہ بھی الہامی سرچشموں کی تلاش میں رہے جنہیں عرفِ عام میں اساطیر، جڑوں کی تلاش، تاریخیت وغیرہ کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ پُراسرایت اور تحیر پذیری اس تنقید کا خاصا ہے، انفرادیت، انتہا پسندی اور شخصِ واحد، گروہِ واحد یا دیوتائے یکتا کی حکومت، اس کلاسیکت کی روح کے پیچھے ہمیشہ انسانوں کے نیک جذبات، ماورائی خیالات، بڑے بڑے عقائد اور معجزات چھپے ہوتے ہیں، مصنف یہ چاہتا ہے کہ آغازِ جوانی ہی میں وہ اعتمادِ ذات کا غیر فانی حوالہ بن جائے اور اس کی عام ڈگر سے ہٹی ہوئی فکر قبولِ عام کا عمومی درجہ اختیار کر جائے، تاریخ کے صفحے الٹتے ہوئے، دیوی دیوتاؤں کی زبان بولتے ہوئے، اظہار و افکار کی راہ گزر سے وہ ایسے گزرے کہ لوگ اس کے علم اور بزرگی سے خوف کھائیں، ڈاکٹر سلیم اختر کے اولین مقالات، زیوس سے امیر حمزہ تک، اساطیری محرکات اور لسانی تغیر، باغ و بہار کے درویش عاشق ایسے ہی مضامین ہیں، اس لیے تنقید نگار چاہتا ہے کہ اس کا قاری اس مسرت کا حصہ بنے جو اس نے اپنے علم سے کشید کی ہے، اساطیری ادب اور اس کی تنقید کی بنیاد جنس کے اسم اعظم پر رکھی گئی ہے، داستانوی ادب کی سب شاخیں اسی اسم اعظم سے جڑی ہیں، اسی شکتی سے دانائی کے سب راستے پھوٹتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کا ابتدائی علمی اثاثہ انہی کہانیوں، ان کے کرداروں اور ان کی بجی سجائی زبان سے ترتیب پاتا ہے۔ آگے چل کر لاشعور میں دبی ہوئی جنسی خواہشات کا ارتفاع پذیر تصور اور تحلیل نفسی کی افادیت کا چرچا انہی اساسی تحریروں سے ہی پروان چڑھا ہے۔

دوسرا قدم سماجی محرکات کی شاہراہ پر رکھا گیا ہے، نسل، ماحول اور لمحہ تخلیق گویا تاریخیت کی درجہ وار تبدیلیاں، عقائد، رسوم و رواج، توہمات، تعصبات بلکہ خیر و شر کے پیمانوں کا تعین ناموافق زمینوں پر اپنی پسند کی کاشتکاری کرتا چلا جاتا ہے، بحیثیت عمرانی نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے مخصوص سماج اور معاشرے کے رجحانات کا تجزیہ اس عہد کے خاص ذہنی پس منظر میں کیا ہے، اس لحاظ سے ان کی سب تحریریں کم و بیش عمرانی رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ تاریخ کی استثنائی مثالوں سے قطع نظر یہ طریقہ تحریر تقابلی مطالعے کے امکانات روشن کرتا ہے۔ عصریت اور تاریخیت مرحلہ وار دبستان طرازی کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس ضمن

میں افسانہ۔ حقیقت سے علامت تک، تخلیق اور لاشعوری محرکات کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے عمرانی تنقید اپنے معنوی اختلافات کو اجاگر کرنے کے لیے تمدن اور زبان کے اختلاف اور ارتباط کو پیش نظر رکھتی ہے، بہت سے مقامات پر گروہی تنقید نگار معاشرے پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کا مطالعہ تہذیبی اعتبار سے دور رس نتائج سامنے لاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک ایک ایسا ہی گروہی ادب ہے جس نے معاشرے پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور افادی قدروں کو فروغ عطا کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کیے ہوئے ہیں اور انہوں نے ہر مقام پر اپنی تنقید اور دیگر تحریروں کے افادی پہلو کو بڑھاوا دینے کی کوشش کی ہے ایک عصر کا الہام دوسرے عصر کے لیے عبرت ہے، کیونکہ وقت گزرنے کے بعد وہ صرف اک تاثر ہے۔ قدیم روایتی تنقید زمانہ تخلیق سے جدا ہو کر اپنے نظامِ فکر کی صرف ایک روشنی ہے جس کے سائے سائے تنقید نگار اپنے راستے پر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، یہ تجربہ آپ اپنا انعام ہے۔ اخلاقی، تاریخی، سماجی، سیاسی اور مذہبی امور کی نشان زدہ موجودگی میں نئی اشیاء کے لیے ایک سند کا کام لینا امورِ زیست کو سلیقے سے آگے بڑھانا ہے۔ تاثرات قلمبند کرتے ہوئے محاکمہ کرنے والا خیالات، احساسات اور موجودات کی صحت پر زیادہ وقت صرف نہیں کرتا، وہ صرف تخلیقی تنقید کے حسن پر توجہ دیتا ہے، اپنے تصورات کی ہمنوائی کے لیے اسے پہلے سے موجود تصورات سے ایک تقابلی مطالعے اور تقابلی تاثر کی عادت پڑتی ہے۔

''انسانی خودشناسی کی اساس تحیر پر استوار ہے، جس کا سائنٹفک پہلو تو حیاتیات، عضویات اور تشریح البدن وغیرہ علوم سے عبارت ہے لیکن تفہیم کا یہ انداز انسان کو تمام کائنات سے علیحدہ ایک اکائی مانتے ہوئے، چند ایسے اصول اور عمومی قواعد و ضوابط کی دریافت تک محدود ہے جن کی تمام نوع پر تطبیق کی جاسکتی ہے۔''

معاشرے کی نامیاتی اور عضویاتی ساخت اور ارتقاء پر نظر رکھتے ہوئے وہ ایک عہد کو دوسرے عہد سے جوڑتے چلے جاتی ہیں۔

''اس موقع پر عہدِ عتیق کے یونانی معاشرے سے قدیم لکھنوی معاشرے کا موازنہ بہت دلچسپ ہوگا، دونوں میں گھر کی عورتیں مردوں کی ذہنی یا جسمانی ضروریات کے لیے ناکافی تسکین مہیا کرتی ہیں، دونوں معاشروں میں مردوں نے گھر سے باہر کی زندگی کو اصل زندگی سمجھا تھا اور دونوں کی عورتوں نے مردوں کے سلوک سے دل برداشتہ ہو کر ہم جنسیت کو شعار بنالیا، وہاں سیفو اور اس کی

شاعری نے نام پیدا کیا اور یہاں بھی ریختی سے لسانی ہم جنس پرستانہ تعلقات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔''

(شاعری میں زنانہ پن کی مثال ۔۔ ریختی)

تنقید کا ایک پہلو جمالیاتی تصورات کا اعادہ بھی ہے، موجودات اور مظاہر کائنات کے حسنِ مستور سے آگاہی ایک سطح کی مثالیت پسندی کو جنم دیتی ہے۔ حسن انسان کو کیوں کر متاثر کرتا ہے اور اس کے داخلی اور خارجی مظاہر اپنی مجرد کیفیات سے ذہنی اور نفسی ردِ عمل کے کیا کیا سامان پیدا کرتے ہیں اس کی بڑی مثال تو اس مسرت میں آشکارا ہے جو زندہ، گہرے اور پر جوش جذبات اور آرزوؤں کی کثرت کو ایک وحدت میں تبدیل کرتی ہے۔ تخیل کی لطافت اور پیکر تراشی کا عمل احساسِ جمال کی ارتقائی اشکال ظاہر کرتا چلا جاتا ہے، جمالیات کی وضع کردہ اصطلاح کی بنیاد، حسن، ہم آہنگی اور تناسب پر رکھی گئی ہے، جو آخر کار ابدی اور ازلی نور اور صداقت کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں جسم یار کی خوبی اور گناہ گار صالح ایک وحدت میں ڈھلتے ہیں۔ جس کلام میں عشق مجازی سے برتر درجہ پر عشق ہے وہاں عشق اور حسن کلامِ عارفانہ میں ڈھل جائیں گے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

''جمالیاتی تنقید کا کل سرمایہ تاثرات، احساسات، وجدان اور جمالیاتی حس ایسی اصطلاحات ہیں، جن کے مفاہیم میں کسی طرح کی قطعیت نہیں، اس پر مستزاد ان سے وابستہ ابہام ایسی شاعرانہ پُراسراریت۔''

نیاز فتح پوری کو سراہتے ہوئے، اسی جمالیت پسندی کو سراہا گیا ہے بل کہ جمالیاتی نظریات میں نرگسیت کی محویت، کسی اور ہستی میں اپنی ذات کی جھلک اور اس سے اپنی ذات ہی کی تطبیق کر لینا گویا تاثریت کے اثرات کی یاد آوری ہے:

''غالب کیوں کہ اعلیٰ تخلیقی قوتوں کا حامل تھے، اس لیے شاعری کی صورت میں جذبے کا ترفع کر لیا۔ اور یوں ''زخم مرگِ دوست'' تخلیقی تسبیح بن گیا۔۔ نظارہ پرستی سے لے کر جنسی نظارہ پرستی (Yoyerism) تک دیکھنے کے جو مراحل ہیں غالب کے ہاں ان کے نشانات ملتے ہیں، کچھ تو اس روایت کے باعث کہ اس عہد کی معاشرت میں عورت سے سماجی سطح پر میل ملاپ کے مواقع کا فقدان تھا، اس لیے جو کچھ بھی تھا، 'عید نظارہ' ہی تھا۔ شاید اسی لیے ہمارے ہاں لمس پر مبنی اشعار کی کمی ہے اور حواسِ خمسہ میں سے بھی زیادہ تر آنکھوں سے کام لیا گیا

ہے۔‘‘ (مردِ عاشق کی مثال غالب)

اساطیری، تاریخی اور عمرانی دائروں سے گزرتے ہوئے تنقید نگار جب طبقاتی کشمکش کی مالیاتی میزان کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں سوچتا ہے تو ہم اسے معاشرتی تشکیل کے رہنما کے بجائے طبقاتی اکساہٹ کا مجرم گردانتے ہیں، انسانی فکر و شعور اور عقل و وجدان کے سب فلسفوں کے باوجود کائنات مادی اسباب کے سہارے ہی چل رہی ہے۔ مادہ جو تغیر پذیر ہے اور جس میں حرکت اور ارتقا پوشیدہ ہے خارجی حالات کی بہتری اور صحت مند معاشرے کا خواب کہیں مثبت تو کہیں منفی طریقے سے اظہار پاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی کم و بیش سب تحریروں میں اس طبقاتی تضاد کی طرف صرف اشارے دیئے گئے ہیں بل کہ معاشرے کے سدھار کے لیے انہوں نے عملی تنقید اور مباحث کا راستہ اپنایا ہے۔ فیض، منٹو، احمد ندیم قاسمی، غالب، میرامن اور حسرت کی تحریروں سے وہ اسی طبقاتی تضاد کے نمونے ہمارے سامنے لائے ہیں اور پھر اس کا جدلیاتی حل اقبال کی تحریروں سے اخذ کیا ہے۔ مارکسی تنقید کے بارے میں ان کا خیال ہے:

> ‘‘مارکسی تنقید میں ادب، زندگی اور معاشرہ کے مادی ارتقا۔ میں شریک کار ہونے کے ساتھ ساتھ اس ارتقا کے مختلف مدارج کا عکس بھی پیش کرتا ہے، اس کے ساتھ ہی ادب کو امیر و غریب، حکمران و محکوم، سرمایہ دار و مزدور، کسان و زمیندار وغیرہ کی صورت میں پائی جانے والی طبقاتی کشمکش میں غریب اور پسے ہوئے پرولتاری طبقے کا ساتھ دینا چاہیے۔‘‘ (مارکسی تنقید)

انسان سے ماورا کچھ نہیں وہی ہے اشیاء، خیالات اور تصورات کا خالق اور تمام معجزہ ہائے ہنر اس کے مرہونِ منت ہیں اس دنیا کی حسین ترین تخلیقات نے انسان کی محنت سے ہی جنم لیا ہے مادی احتیاجات اور اقتصادی عوامل کو تخلیق نگار معجزہ ہائے ہنر قرار دیتے ہیں۔ اس ہنر کو ہمیشہ افادیت پسند ہونا چاہیے۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک اسی افادی ادب کی ترسیل چاہتی تھی، ڈاکٹر سلیم اختر کی تحریریں عمومی درجے کے لوگوں کے مسائل اور الجھنوں کا احاطہ کرتی ہیں ان کی تخلیقی تحریروں میں یہ وصف بدرجہ اتم موجود ہے خاص طور پر ان کے افسانوں میں جہاں ہر سطح کے پریشر گروپس کی سرزنش کی گئی ہے، سیاسی یا مذہبی جذبات کے زیرِ اثر مارکس کے نظریے کو شک سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ‘‘سیاسی لحاظ سے اشتراکیت سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ مارکسی نقادوں نے ادبی مسائل، تنقیدی معائیر اور فنی ضوابط

کے مباحث میں اپنی تنقیدی بصیرت سے قابلِ قدر اضافہ ہی نہیں بل کہ بحیثیت
اُردو تنقید کو محض بحثوں اور شخصیت پرستی کے گورکھ دھندے سے نکال کر سائنٹفک
رویہ دیا۔'' (مارکسی تنقید)

یہی سائنٹفک رویہ ہمیں خود مصنف کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے:

''بحیثیت نقاد میں اس بات کا قائل ہوں کہ اپنی بات کو دوٹوک انداز سے قطعی قسم
کے اسلوب میں بیان کرنا چاہیے، مجھے الجھے الجھے ہوئے بیانات، غیر ضروری
حوالوں اور تکرار سے سخت چڑھ ہے اور ایسے نقاد کو میں نہیں پڑھ سکتا اگر آپ اس
نقطۂ نظر سے میرے اسلوب کا مطالعہ کریں تو اس میں آپ کو نہ تو تکرار ملے گی
نہ غیر ضروری تفصیلات۔''

(میری تنقید نگاری ص ۷۷۔ ڈاکٹر سلیم اختر رڈاکٹر جلیل اشرف)

تنقیدی اصولوں سے دلچسپی نے ان کے ہاں مباحث کو جنم دیا ہے۔ تنقید نظریاتی ہو یا عملی، اس میں وہ نازک مقامات ضرور موجود ہوتے ہیں، جہاں اختلاف کی گنجائش نکلتی ہے۔ ایسے موقع پر ڈاکٹر سلیم اختر دلائل آفرینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شائستگی سے آگے گزرتے ہیں۔

ہماری تنقید کے بیشتر معروف نظریات، اصطلاحات، مباحث، تصورات مغربی بل کہ انگریزی ادب سے متاثر ہیں۔ گزشتہ بیس برس سے ایک اصطلاح ساختیات بھی اپنا مقام بناتی چلی جارہی ہے۔ فن پارے کی داخلی اور خارجی بناوٹ یا تعمیر و تشکیل کا عمل بہت سے مباحثوں کی وجہ بنا ہے: کچھ تحریر نگار ''متن'' یعنی عبارت کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور کچھ لفظ پس لفظ کی الجھنوں کے اسیر۔ ادب پارے کے متن کا مخصوص ڈھانچہ کیا ہے اور اسے کن لفظوں کے تال میل سے آگے بڑھایا گیا ہے، اس کی مربوط، غیر مربوط اور غیر مشروط شکل کیا ہے، اسی کھوج نے ساختیات کے تصور کو جنم دیا ہے۔ تحریر سے نظام کی ساخت کی تفہیم اور تشریح کے تصور کی باہم آمیزش ایک نامیاتی وحدت اختیار کر لیتی ہیں اور پھر زبان، استعارہ، علامت ہر طرح کے معنی کی وضاحت کرتے جاتے ہیں، اس ساختیاتی نظام کی جڑیں انسانی نفسیات کے داخلی اور لاشعوری نظام سے جڑی ہیں اور یہی نفسیاتی موضوعات ڈاکٹر سلیم اختر کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ''تخلیق اور لاشعوری محرکات'' ان کی کتاب ''ادب اور لاشعور'' کی توسیع ہے۔ جہاں تحلیل نفسی اور ادب کے باہمی رشتے اجاگر کرنے کے لیے علامت، نفسیاتی تجزیے اور دیگر موضوعات پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ اگرچہ ان کا کہنا ہے''

> ''میں نے نفسیات کو کبھی اندھے کی لاٹھی نہیں بنایا میں صرف نفسیات سے وہیں کام لیتا ہوں جہاں اس کا جواز ممکن ہو۔''

نفسیات اور ادب کے باہمی رشتے کے لیے انھوں نے فرائیڈ اور اس کے نظریات سے بڑا کام لیا ہے۔ بقول مصنف:

> ''میری بعض کتابوں کے دیباچے سے بھی میرے خیالات کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ فرائیڈ نے تحلیل نفیسی کا تصور ذہنی مریضوں کے علاج کے لیے پیش کیا تھا، لیکن یہ تصور اتنا ہمہ گیر ثابت ہوا کہ پون صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود بھی اس کی اہمیت برقرار ہے۔ جس نے کبھی نفسیات کے علم کو سنسنی خیزی یا چونکانے کے لیے استعمال نہیں کیا۔۔۔ میں نے نفسیات کو بیلنس کرنے کے لیے تصوف اور مارکسیت کا مطالعہ کیا، تصوف نے مجھے زندگی کی مابعد الطبعیاتی حقیقتوں کو تسلیم کرنا سکھایا۔۔۔ جہاں تک مارکسیت کا تعلق ہے تو اسے بھی میں نے احتشام حسین کے مانند اپنی تنقید کی بنیاد تو نہیں بنایا لیکن اتنا یقینی ہے کہ 'ادب اور زندگی' ادب اور معاشرہ اور طبقاتی کشمکش میں ادیب کے کردار جیسے مسائل کو میں نے اسی سے سمجھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نفسیات جاننے والے کے لیے میتھالوجی اور انتھروپالوجی کا جاننا بھی ضروری ہے۔۔ میں نے نفسیات کو وسیع علم کے طور پر لیا ہے۔۔۔ عورت جنس اور جذبات، تین بڑے نفسیات دان، ادب اور لاشعور، شعور یا لاشعور کا شاعر: غالب، میرے لیے سب ایک ہی ذہنی عمل کے ثمرات ہیں۔''

ادبی تخلیق کی وضاحت کے لیے عموماً نقاد نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہوئے یہ بحث چھیڑتا ہے کہ خاص سطح کی تحریر تخلیق کرتے وقت مصنف کی مخصوص ذہنی کیفیت کیا تھی؟ اس مقام پر نفسیاتی تنقید دو طرح سے کارآمد ثابت ہوتی ہے، ایک تو تخلیقی عمل کے مطالعے سے خیال آفرینی کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں دوسرے مصنف اور اس کے زمانے کی نفسیات اور ذہنی رویے ایک بہتر زندگی کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ نفسیاتی تنقید اپنے اندر جمالیاتی تنقید کے رجحانات رکھتی ہے۔ ذرا دیر کو سوچ بھی لیا جائے کہ نفسیات کا تعلق اعصابی خلل سے ہے اور تخلیق کار بھی ثمر باری کے لمحات میں اعصابی ہیجانات سے ہی

گزر رہا ہے تو اس کے معنی پاگل پن یا دیوانگی کے نظریات عام کرنا نہیں ہیجانات کے وفور سے چھٹکارا پانا ہیں، بل کہ انہی اعصابی ہیجانات میں ہم تنقید نگار کے اپنے اعصابی خلل کو بھی شامل کر لیں تو نشہ دو آتشہ ہو جاتا ہے، دریافت کی دو دھاری تلوار ہر طرح کے امکانات کو روشن بھی کرتی جاتی ہے اور رد بھی۔ یہی ہے نفسیات کا سائنٹفک طریق کار، جہاں مصنف اور تنقید نگار اپنے احساسات و نظریات میں یک جان ہو کر ممکنہ نتیجہ دیتے ہیں۔ اس طرح تحریر وفور جذبات کے چھلک جانے کی تہمت سے بچ کر اس سانچے میں ڈھلتی ہے، جو قاری کی راہنمائی میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسی تنقید ایک طرز کا نفسیاتی مجموعہ ہے، جس کے عنوانات پڑھنے والے کو اکساتے ہیں اور اپنی Psychological Curosity طرف مائل کرتے ہیں۔ نفسیاتی ناقد عملِ تنویم کا ماہر ہے پہلے تو وہ ادیب اور اس کی تحریروں کے نازک مقامات یا پریشر پوائنٹس پر ہاتھ رکھتا ہے، جب اپنے تجربے کی گرفت مضبوط ہوتی ہے تو پھر لاشعور اور شعور کے مخمصے میں سے صاف اور سیدھی بات لا کر قاری کے سپرد کر دیا ہے۔ اس تجربے کے لیے اسے مخصوص تخلیقی زبان، مصنف کی سوانح اور پھر عمومی مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر ان تینوں ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ چناں چہ وہ بڑی آسانی سے تخلیقی عمل، ادبی شخصیت تخلیقی فن پارے اور قارئین کی نفسیات کا درجہ بدرجہ جائزہ لیتے چلے جاتے ہیں۔ آخری لمحے محسوس ہوتا ہے انھیں سماج کی نشوونما اور معرفت و حقیقت کے علم تک گہری رسائی حاصل ہو گئی ہے اور اب وہ قاری، تخلیق کار اور اپنی ذات کے ذہنی عوارض پر آسانی سے غلبہ پا سکتے ہیں۔ فرائیڈ نے اپنے نظریات کے لیے شیکسپیئر کے ڈراموں اور دیگر تحریروں کو استعمال کیا تو اِدھر ڈاکٹر سلیم اختر غالب، اقبال اور دیگر مشاہیر کی تحریروں سے فیض یاب ہوئے۔ تحلیل نفسی کے ساتھ ساتھ انھیں ایڈلر کے احساس کہتری و برتری نے بھی اپنی گرفت میں لیا اور ژونگ کے اجتماعی لاشعور کے طویل سلسلے نے بھی متاثر کیا۔ ان تین عظیم نفسیات دانوں کو اُردو ادب میں دیر تک مقبول عام کی سند دلانے میں ڈاکٹر صاحب کا بہت حصہ ہے۔

مبادی مسائل اور علم نفس کے مسائل کی واقفیت کے ساتھ ساتھ فرد کی نفسیاتی واردات سے گزرتے ہوئے نفسیاتی تنقید کے مخصوص مباحث کی درجہ بندی اس طرح کی جا سکتی ہے:

الف۔ مختلف اصنافِ ادب کے نفسیاتی محرکات کا سراغ، وضاحت اور تخلیقی عمل یا مخصوص تخلیقات سے ان کے رابطے کی تفہیم۔

ب۔ تخلیق کار کی شخصیت کی نفسی اساس کی دریافت اور پھر اس کی روشنی میں تخلیقی شخصیت کا مطالعہ۔

ج۔ نفسیاتی اصولوں کے سیاق و سباق میں مخصوص تخلیقی کاوشوں کی تشریح و توضیح اور پھر ان کے

ادبی مرتبہ کا تعین۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیاتی نقاد کی حیثیت سے اسی طریقہ کار سے تخلیق اور تخلیق کار تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ فرائیڈ کا نظریہ، لاشعور اور اس کے نتیجے میں مدون کیا گیا، تحلیل نفسی کا نظریہ، جنس کے ارتقاع کے سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ ادب پارے کی نفسیاتی تشریح کے ساتھ تنقید کا دوسرا فریضہ مصنف کی نفسیاتی ساخت کے تعین اور پھر اس کی روشنی میں اس کی تخلیقی کاوشوں کا جائزہ لینا ہے۔ نفسی دریافت کے لیے تخلیق کار کی نفسی واردات، خارجی واقعات اور تحریریں نفسیاتی مواد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ نفسیاتی تقابل کا تجربہ بھی اس طریق کار میں دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ اس لحاظ سے ایک معرکتہ الآرا کتاب ہے۔ اقبال کی نرگسیت اور اقبال کا تنقیدی شعور دونوں معاملات اقبال کی ذہنی کشمکش اور باطنی انتشار سے ابھرے ہیں بقول مصنف:

> ''یورپ میں اقبال نے آزادی اور بے فکری کی جو زندگی بسر کی وہ اپنی جگہ بذات خود ایک لذت رکھتی ہے، اس پر مستزاد ہم مذاق اور ہم خیال خواتین کی صحبت، یورپ کی خنک آب و ہوا، اقبال کا گرم پنجابی خون اور حسن کی رنگ افروز کیفیات کو جذب کرنے والی شاعرانہ آنکھ۔'' (ص ۵۷)

اقبال کی نرگسیت اور غالب کی نرگسیت دراصل مصنف کے اپنے نرگسیت آمیز تصورات کا ایک پرتو ہے۔ غالب کے خطوط سے سلیم اختر ایک نرگسی، خوشامدیں کرنے والا، عاجز اور منکسر المزاج غالب برآمد کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، جو احساس مرگ کے رومان میں مبتلا ہے۔ اسی طرح افسانہ نگاروں کے نفسی محرکات سے بھی مصنف اپنے من پسند نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی نفسیاتی تنقید نگاری کا مختصر محاکمہ کیا جائے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ان کی تنقید ان کے بے پناہ مطالعے، تجربے، مشاہدے اور عمق و تجزیے کی عکاس ہے۔ وہ لاشعور کو شعور پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی تنقیدی زبان شائستہ رواں جدید اور ایک خاص قسم کی شگفتگی لیے ہوئے ہے۔ وہ شخصیت کے ساتھ ساتھ فن پارے کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے محاکمہ کرتے ہوئے عموماً بے تعصبی، جرات مندی اور بے باکی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اپنی رائے کا اظہار کرنے کی جرات رکھتے ہیں۔ وہ کسی زمانے میں متنازعہ تنقید نگار ہوں گے لیکن پچاس برس کی مستقل محنت اور پیش بینی کے بعد ان کی تحریر کسی تنازع کا باعث نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تنقید، ان کی افسانہ نگاری کی طرح ایک نیا پن اور اپنا ذائقہ رکھتی ہے۔ انھوں نے کما حقہ، احتیاط سے کام لیا ہے البتہ جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے حوالے دے کر اپنی بات اور رائے کا اعتبار قائم کیا ہے۔ فرائیڈ، اور ژونگ اور ایڈلر کے نظریات کو ہمارے کسی تنقید نگار نے اس قدر

باقاعدگی کے ساتھ عملی تنقید کا حصہ نہیں بنایا جس استقلال سے ڈاکٹر سلیم اختر ان نظریات کی روشنی میں آگے بڑھے ہیں۔ جوش کا نفسیاتی مطالعہ اس طرز کا ایک خاص مضمون ہے۔

ادب اور کلچر کے ضمن میں پاکستانی کلچر ڈاکٹر سلیم اختر کا پسندیدہ موضوع ہے، ان کا کہنا ہے:

''سیاسی انتشار، لاقانونیت، عدم مرکزیت بل کہ معاشی بدحالی سے قوموں کی نفسیات پر مخصوص نوعیت کے اثرات ہوا کرتے ہیں، ان کی بنا پر فرد میں عدم تحفظ کا جو احساس جنم لیتا ہے وہ ہلکے اثر والے زہر کے مانند قوم کی رگ و پے میں غیر محسوس طور پر سرایت کر جاتا ہے، جس کے نتیجے میں قومی سطح پر عوارض ظہور پذیر ہوتے ہیں انھیں درون بینی اور اپنی ذات میں سکڑنا اور سمٹنا یعنی نفسی مراجعت ایسی اصطلاحات سے واضح کیا جاسکتا ہے۔۔ اس سے قوم میں اگر ایک طرف زندگی اور اس کے تقاضوں سے فرار کا رجحان قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے تو دوسری طرف مکمل فرزانہ ہونے کی بنا پر پژمردگی، مایوسی اور قنوطیت اور یاس پسندی جنم لیتی ہے۔''

اسی موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''فرد کے مانند قوم کی بھی مخصوص نفسیات ہے، جس سے اس کی نفسی شخصیت کے خدوخال متعین کیے جاسکتے ہیں۔ فرد ہی کے مانند قوم بھی نفسی عوارض میں مبتلا ہوسکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ''ماس ہسٹریا'' ایسے واقعات اور اصطلاحات نہ ہوتیں۔۔ کسی مجمع یا گروہ کے برعکس قوم کیوں کہ منظم ہوتی ہے اس لیے قومی نفسیات کو انبوہ کی نفسیات سے ممیز کرنا بھی لازم ہے۔ جس میں وقتی اشتعال اور اس کی فوری تسکین اساسی کردار ادا کرتی ہے۔۔۔ زبان اور کلچر ترازو کے وہ پلڑے ہیں جو قومی تعداد کی میزان بنتے ہیں۔۔۔ قوم کے لیے قومی زبان کی وہی اہمیت ہے جو بچہ کے لیے آغوش مادر کی۔۔۔ قومی زبان اگر ماں ہے تو قومی کلچر میں باپ کا روپ نظر آتا ہے۔'' (قوم زبان اور کلچر)

ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید نگاری اپنی ایک معنویت رکھتی ہے:

''جب میں نے نفسیات کی روشنی میں تنقید کا آغاز کیا تو ایک مقصد خاص رکھ کر

یعنی ادب اور اس سے وابستہ مسائل اور تخلیقی اصناف کا نفسیات کی روشنی میں

یوں تجزیاتی مطالعہ کیا جائے کہ اس تنوع کی واحد اساس اجاگر ہو جائے۔''

اسی تنقید خاص سے انھوں نے اپنی تاریخ اور تنقیدی وژن کو آگے بڑھایا ہے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب ابھی اور کئی معرکے سر کریں گے اور انفرادی و اجتماعی نفسیات کی روشن میں مرحلہ وار کئی نئے مباحث کے دروازے کھلتے رہیں گے، نفسیاتی میدان میں ڈاکٹر سلیم اختر اپنے دوٹوک نظریات میں میرا جی، ریاض احمد، ہادی رسوا، احتشام حسین، شکیل الرحمٰن اور کئی دوسرے ناقدین سے کہیں آگے ہیں بلکہ محمد حسن عسکری کے مقالے نفسیات اور تنقید میں ایک پتے کی بات کہی گئی ہے کہ:

''بہت سے نقادوں کو نفسیات کے نام سے گھبراہٹ ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں

کہ تنقید اور نفسیات اَن ملی اور بے جوڑ چیزیں ہیں۔ اس کا سبب داخلی مدافعت

ہے کیوں کہ انسان کو یہ حقیقت تسلیم کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے کہ

نفسیات کا منبع ومخرج کثافت ہے۔ (ستارہ یا بادبان ص ۸۹)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر سلیم اختر کو داخلی مدافعت اور انسانی کثافت کو ارتفاع کے مقام تک پہنچنے کے لیے کون سی اصطلاحات کی اشد ضرورت پیش آئی ہے۔ فرائیڈ کے مطالعے کے دوران میں اس کی کتاب (Interpretation of Dreams") ''خوابوں کی پیش بینی'' کا دارومدار ہملٹ' کے نشان زدہ ایڈی پس کامپلکس پر رکھا گیا ہے۔ باپ کے قاتل سے انتقام لینے کی جھجک یا ماں کے قریب رہنے کا فیصلہ اور پھر قوتِ فیصلہ کا فقدان، اس قوتِ فیصلہ کا مفلوج ہو جانا تحلیل نفسی کا متقاضی ہے۔ ارنسٹ جونز ہملٹ کی تحلیل نفسی کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہ ڈرامہ دراصل خود شیکسپئر کی اپنی نفسی تسکین کا لاشعوری طریقہ ہے کیوں کہ اس نے اپنی ماں کو اپنی محبت کا مرکز بنا رکھا تھا اور وہ باپ سے لاشعوری نفرت میں مبتلا تھا۔۔۔ ہوسکتا ہے ایسے ہی ہو لیکن ماں کی قربت اور باپ سے رقابت کے احساسات سے زیادہ قریب ہونا ہو تو ہمیں دوستوفسکی کے ناولوں سے رجوع کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ایڈی پس کامپلکس کو اپنی ذات پر بھی منطبق کرتے ہیں اور اس کا اظہار ان کی خودنوشت میں کئی مقامات پر دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی دوسری اصطلاح خواب بیداری ہے۔ خواب بیداری اور فینٹسی کی نفسیاتی اہمیت کے لیے ہم ان کے افسانوں اور خودنوشت سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے تنقیدی پاروں میں بھی یہ

اثرات دیکھ سکتے ہیں، ان کا خیال ہے تخلیق کاری اور اس کی علامات کے خام مواد کو علاحدہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ کسی ایک سے پہلو تہی احساس جرم میں مبتلا کر دینے کا باعث ہو سکتی ہے۔ چناں چہ تہذیبی ادراک کے لیے تخلیقی ادب اور خواب بیداری کے امکانات کو ساتھ ساتھ رکھنا چاہیے۔ فرائیڈ کی خواب بیداری کی اصطلاح ''دن سپنے'' انسانی ناآسودہ خواہشات کے لیے مکمل علاج کی شکل رکھتی ہے، ادبی صورت گری بھی ایک طرح کا 'دن سپنا' ہی ہے جس کی فعالیت سے تخلیق کار اپنی زندگی کی ناکامیوں اور اپنے جذبات کے وفور سے نجات پاتا ہے:

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے

کہ دامانِ خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

باغ و بہار کے درویش اور میر تقی میر کی زندگیوں کا جائزہ تصورات کی دنیا میں اپنی ذات کی موجودگی کی ایک مثال ہے۔ بل کہ اقبال کے اس شعر کی عملی توجیہہ سے ذرا پہلے کی کیفیت میں ہے۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے ممدوحسین کے ہاں جو نفسی علائم و رموز تلاش کیے ہیں ان میں ایک اصطلاح تخلیق کار کی مریضانہ شخصیت بھی ہے۔ یہ ابنارملٹی، نیوراتیت، اعصابیت، اعصابی خلل، جسمانی کمزوریاں اور بیماریاں نفسی علاج چاہتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں اور تحریروں میں اس نیوراتیت کا بڑا چرچا ہے بل کہ اس سے پیدا ہونے والے خوف، دہشت، لذتِ مرگ اور کریہہ المنظر اشتباہات نے ان کی تحریروں میں اپنے جلوے دکھائے ہیں۔ وہ تخلیق کار کی مریضانہ حرکات کے عقب میں سماجی اخلاقیات اور طبقاتی تقسیم کا بھی جائزہ لیتے چلے جاتی ہیں۔ خوابوں اور ارادوں کی تکشیف اور انتقال سے پیدا ہونے والی آسودگی اس مریضانہ وفور میں کمی کا باعث بنتی ہے۔

ژونگ کے تتبع میں استعمال ہونے والی اصطلاح اجتماعی لاشعور، تخلیقی صلاحیتوں کی طرف اشارہ دیتی ہے۔ فرائیڈ نے اس لاشعور کو بوتل میں بند کر رکھا ہے لیکن ژونگ اس کی آزادی پر یقین رکھتا ہے اور اسے نفسی توانائی کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔ اس نفسی مزاج کے عقب میں نسلی وراثت، انسانی سائیکی اور اساطیری واقعات کی کارکردگی چھپی بیٹھی ہے۔ دماغ کی وراثتی ساخت تاریخی روایات اور خیالات کی منتقلی کے بغیر بھی اپنا کام کرتی چلی جاتی ہے، صدیوں کا تجرباتی

مواد لاشعور کے بنیادی سانچے تشکیل کرتا ہے اور یہیں تخمتمثال Archetypes کا کلیدی تصور جڑ پکڑتا ہے۔ سائیکی کی گہرائیوں میں مدفون ان آرکی ٹائپس کی موجودگی میں مرد و زن کی ایک دوسرے کے نفس میں موجودگی ڈاکٹر سلیم اختر کا پسندیدہ موضوع ہے۔ نسوانی موجودگی Anima اور مردانہ موجودگی Animus مصافِ زندگی میں مخصوص صورتِ حال پیدا کرنے کا باعث ہیں۔ علامت اور اس کا استعمال بھی ڈاکٹر سلیم کی تحریروں میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، بل کہ کچھ علامات برگد اور آنچل کے توسط سے انھوں نے اپنی فکر کے دائرے کو دور تک پھیلایا ہے وہ علامت کو ایک زندہ شے سمجھتے ہیں، ایک ایسی شے جو اپنا اظہار اور ابلاغ جانتی ہے۔ اس کے پوشیدہ معنی کی تفہیم دنیائے ممکنات تک رسائی کا دریچہ کھولتی ہے۔ زندہ اور مردہ علامات کی موجودگی آرکی ٹائپس تنقید کے لیے آسانیاں پیدا کرتی ہے۔ اساطیری اور رسوماتی ادب کی شیرازہ بندی کے ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر ہربرٹ ریڈ کو سراہتے ہیں۔

بقول ان کے:

''ہربرٹ ریڈ نے تخلیق کار کے ذہن کے ان دیکھے گوشوں سے خوفزدہ ہونے کے برعکس ان تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، وہ تخلیق اور شخصیت کے گہرے نفسی رابطے تسلیم کرتا ہے۔'' (نفسیاتی تنقید ص ۱۲۳)

آرکی ٹائپس کی موجودگی کا سراغ نفسی کیفیات کے محتاط مطالعے کا متقاضی ہے۔ اسی سلسلے میں ماڈ باڈکن نے جدید علوم اور جمالیاتی ذوق سے مدد لینے کی سفارش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس سفارش پر بھی عمل پیرا ہیں۔

نفسیات اور اخلاق سازی کے ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے عمومی نفسیات کے شعبے میں جو کام کیا ہے ایک طرف تو وہ فرائیڈ کے ٹوٹم اینڈ ٹیبوز کی نفسی اساس اور تحریمات کے تقاضے پورے کرتا ہے، دوسری جانب وہ تحریم کو اعصابی خلل نہیں بل کہ معاشرے کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔ سزا اور جزا کا عمل اپنی جگہ دوہری اجارہ داری رکھتا ہے۔ بداخلاقی اور مجرمانہ ذہنیت کے متشدد مظاہر کو روکنے کے لیے کسی کسی مقام پر عریاں نگاری کو بطور علاج استعمال کیا جاسکتا ہے۔ آخر میڈیکل سائنس اسی طریق کار پر ہی تو گامزن

ہے۔تو پھر ادیب اگر مصلح یا مدبر کا درجہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو وہ تحریمات کی اکھاڑ پچھاڑ کیوں نہیں کر سکتا۔
ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی تحریروں میں نرگسیت اور نیوراسس کا بھی بہت تذکرہ کیا ہے۔ اساطیری حوالوں سے قطع نظر اشخاص ہوں یا افراد، اگر الفتِ ذات ہی قصہ، اول و آخر ہے تو پھر کسی قسم کی ترقی کا تصور محال ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر چہ خود کو بھی ایک نرگسی شخصیت قرار دیتے ہیں اس کے باوجود انھوں نے اپنے دائرہ عمل کو بہت دور تک پھیلانے اور اپنی ذات کے الجھاوے اور بہکاوے سے مبراء ہو کر زندہ رہنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے

سلیم اختر نے افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۲ء میں کیا، جب وہ لیکچرار بن کر ملتان گئے تو ملتان کی رومانوی سرزمین اور ادیب دوستوں کی ایک معقول تعداد ان کے اندر چھپے ہوئے افسانہ طراز کو باہر کی دنیا سے متعارف کرانے میں کامیاب رہی۔ بچپن میں غیر منقسم ہندوستان کے جن علاقوں میں انھیں رہائش پذیر ہونے کا موقع ملا اس کی تفصیل وہ اپنی خودنوشت میں محفوظ کر چکے۔ پونا اور انبالہ کی فضاؤں میں دیوی دیوتاؤں کے توسط سے جن نادیدہ طاقتوں کا راج تھا، ان کے اثرات اکیسویں صدی میں سانس لیتے ہوئے، سلیم اختر پر ابھی تک باقی ہیں۔ سربستہ آوازیں، نادیدہ مخلوقات، سانس لیتے درخت، پاؤں پکڑتی پرچھائیاں، کسی بھی کمزور دل و دماغ شخص پر، ہسٹریائی کیفیات طاری کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ سلیم اختر اگر انھی فضاؤں میں دیر تک آباد رہتے تو بیراگ اور جوگ کا راستہ اختیار کرتے اور اگر طبیعت میں ذرا سی عیاری کا ہنر زیادہ ہوتا تو علم جفر کی رُو سے رمال یا نجومی بن کر طوطا فال نکالا کرتے۔ تخلیق اور تخلیقی شخصیت کی وجدانی دیوانگی اور اس کی مماثلتیں اس اعصابی خلل میں پنہاں ہیں، جو آخرکار تحلیل و تشریح کے لیے سنسنی خیزی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ سلیم اختر نے اپنے خوابوں، ذہنی واہموں، خواب بیداری اور سلسلہء خیال کے لیے شعور اور لاشعور کے درمیان بسیرا کیا ہے۔ کوئی افسانہ نگار کے اندر خانے ایک ترازو لے کر بیٹھ گیا ہے اور ہمہ وقت ناپ تول کے عمل سے گزرتا رہتا ہے: نرگسیت، اذیت پسندی، تصورانہ اور مریضانہ کج روی، انسانی کمزوریوں کے مختلف احتمالات افسانہ نگار کا پیچھا کرتے رہتے ہیں، قلمکاری ایک طرح سے خودکار تحریر کا نفسیاتی حربہ ثابت ہوتی ہے اور وہ مخفی محرکات کی نشاندہی کرتا چلا جاتا ہے، ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے:

> ''افسانہ نگاری بھی مشاطگی ہے، ہیئت کے تقاضے، اسلوب کی جمالیات، متنوع احساسات اور متناقض جذبات کو تاثر کے محدب عدسے تلے یوں لانا کہ وہ آنچ دینے لگیں؛ معاشرہ اور افراد کے حوالے سے کرداروں کا خارجی رنگ اور اس کے برعکس ان کے باطن میں پنہاں کئی کشمکش کے طوفاں، سائیکی کی بھید بھری پرچھائیوں والا لینڈ اسکیپ، شعور اور لاشعور کے مابین رسہ کشی، ان سب کی موثر

تصویر کشی کو مشاطی سمجھتا ہوں۔ فطرت خود بخود لالہ کی حنابندی کرتی ہو گی مگر
افسانہ کے لالہ کی حنابندی افسانہ نگار کو کرنا ہوتی ہے۔ افسانہ لکھنا مہینوال کے
مانند اپنی ران کاٹ کر کباب بنانا ہے۔'' (دیباچہ نرگس اور کیکٹس)

مصنف کا آخری فقرہ محلِ نظر ہے۔ مصنف افسانے کو اپنے وجود ہی کا حصہ بنا کر پیش کر رہا ہے، گویا تحریر اس کی اپنی ذات ہی کی پرچھائیں ہے اور وہ جارج کیمبل کے ہزار چہرہ آدمی کی طرح ہر بار آئینے میں اپنے ہی سرو قامت کا عکس دیکھ کر، ثنویت اور وحدت کے مزے لوٹ رہا ہے۔ یہ اظہارِ تخلیقی لاشعور کا وسیلہ اور ابلاغ بھی ہے اور تخلیق کار کی بنیادی شخصیت کا ارتقا بھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی ذات کے مرکزے اور الجھنوں سے نمودار ہوتا ہے اور پھر اپنے ماحول، واقعات و حوادث، میلانات و رجحانات اور ذہنی تعصبات کا احاطہ کرتے ہوئے سماجی تحریمات سے ٹکراؤ کی طاقت پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

اول اول الفتِ ذات یا تشہیر ذات کے گرداب میں گول گول گھومتا آدمی، جو خوش قسمتی سے اپنی ذات کا کھوجی بھی ہے، ایک ایک کر کے اپنے معدوم امکانات کو اجاگر کرتا ہے۔ اس سامان خود بینی میں پہلا وجود، پہلی موجودگی، پہلا عکس اس کا اپنا بدن ہے۔ اس بدن کی سلطنت کی ہمہ گیر اعتبارِ ذات کی پہلی کڑی ہے یعنی آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنا اور اپنے ہی عکس کو چومنا، احساسِ ذات کا مسلسل عمل اپنی محبت کی سرحد سے نکل کر اپنے ہی جیسی شخصیتیں، شکلیں یا اتفاقات تلاش کرتا پھرتا ہے۔

مماثلت کا یہ پھیلاؤ، کثرت کی ہمہ گیری سے متعارف ہوتا ہے تو پھر دوسروں کی تلاش کے دائرے میں داخل ہوتے ہوتے کہیں نہ کہیں ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ تصادم نرگسیت کے اسرار کو بے معنویت سے دوچار کرتا ہے۔ تشہیر ذات کا مسافر سفر ہی سفر میں اپنی اصل شکل تبدیل کر چکا، اب اسے آئینہ در آئینہ تقسیم ہوتے ہوئے، اپنی خالص شکل اور خالص ذات کا سراغ ملنا ناممکن ہے چناں چہ وہ نئے سرے سے اپنے ہی جنم کا خواہش مند ہے۔ پیدائش کی حالت سے شباب کی حالت تک، یکتائی کی کیفیت سے اپنی ذات کے فشار کی کیفیت تک، بنیادی نرگسیت اپنی مرضی کے چہرے تراشتی چلی جاتی ہے۔ حسرتِ آغوش کثرتِ آغوش کی متقاضی ہے اور انسانی تجربہ نت نئے محرکات چاہتا ہے، موضوع یا اسلوب وہ پیرایہء اظہار ہے، جسے مصنف اپنی ذات کے مسلسل بہاؤ کے لیے استعمال کرتا ہے، اپنے جذبہء ملکیت اور جذبہء تعرفیت کے باعث وہ ہر شے پر غالب آنا چاہتا ہے، مغلوبیت کے اس کھیل میں عمومی طور پر وہ عام آدمی کی طرح اولیں سطح پر اپنی جسمانی کارکردگی اور اس کے متعلقات پر بھروسہ کرتا ہے، اس بھروسے کی کامیابی یا ناکامی اس کی جملہ زندگی اور جملہ تحریری زندگی پر بھرپور اثر چھوڑتی ہے۔ سلیم اختر نے بھی اپنے افسانے کی پہلی اینٹ اسی جسمانی احساسِ ملکیت پر رکھی ہے۔

قاضیوں اور قریشیوں کی تحریماتی تہذیب میں لفظ 'فحش' اور اصطلاح 'فحاشی' تشہیر ذات کی وہ قسم ہے جو دوسرے کا دائرہ محدود کرتے ہوئے اپنی موجودگی کے امکانات پھیلاتی چلی جاتی ہے، مذہب، ادب، تہذیب، قانون، معاشرہ اپنی جداگانہ حیثیتوں کے باوجود اصل میں ایک ہیں، ان کی ماورائیت اور بے نیازی ایک منافقانہ ڈھکوسلا ہے، جس پر اشخاص یا اجتماع کے، اچھا یا برا ہونے کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس کشمکش کے دوران میں پیدا ہونے والی صورت حال نے مصنف کو بھی انفعالیت، ذہنی پژمردگی، وقتی یاسیت اور ہلکی سی کجروی سے دوچار کیا ہے، وہ بھی دوسرے افراد کی طرح وقتاً فوقتاً اپنی ذات کی پناہ گزینی پر مائل رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس لیے افسانہ نگاری سے بنیاد پرستی کے موضوعات کے دوران اپنے موقف کی ترسیل کے لیے اپنا اور اپنے معاشرے کا احتساب جاری رکھا ہے۔

افسانہ نگار کی شخصی تفہیم اور مشاہدات کی ذہنی استطاعت کا امتزاج، تخلیقی ابلاغ میں ڈھل کر ان افسانوں میں ظاہر ہوا ہے جنھیں افسانہ نگار نے وقفے وقفے سے کئی نام دے کر قارئین تک پہنچایا، افسانوں کے یہ مجموعے چونکا دینے والے ناموں سے مزین تھے، کڑوے بادام، کاٹھ کی عورتیں، مٹھی بھر سانپ، چالیس منٹ کی عورت، آدھی رات کی مخلوق، اپنے اپنے زمانے میں ان مجموعوں نے مقدور بھر سنسنی پھیلائی کیوں کہ ان کے موضوعات عمومی انسانوں کے جنسی، معاشرتی اور تہذیبی رویوں سے ماخوذ ہیں، چوں کہ مصنف اور اس کے پبلشر ان تحریروں کو نت نئے اشاعتی منصوبوں سے بھی متعارف کراتے رہتے ہیں چناں چہ ۲۰۰۴ میں ان افسانوں کو نرگس اور کیکٹس کے نام سے افسانوی کلیات کی حیثیت سے شائع کیا گیا۔ ان افسانوں کی تعداد ایک سو سات ہے، قارئین کی سہولت کے لیے ان افسانوں کا جائزہ نرگس اور کیکٹس کی جملہ ترتیب کے مطابق روا رکھا گیا ہے اور اس کے بعد جرسِ غنچہ کے افسانوں کا تذکرہ ہے۔

نرگس اور کیکٹس کے افسانوں کا جائزہ

نرگس اور کیکٹس ڈاکٹر سلیم اختر کے ایک سو سات افسانوں کا مجموعہ ہے جن کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

قفسِ رنگ

افسانے کا بنیادی موضوع حسن کی دہشت اور لذتِ مرگ ہے، کہانی ایک مصور طالب علم کے گرد گھوم رہی ہے جسے استاد ایتھنز کی مشہور طوائف کے مقدمہء قتل کی کہانی سنا رہا ہے۔ ایک مجمع موجود ہے جس کے لیے مقتول کے نام اور وجہء قتل میں کوئی دلچسپی نہیں البتہ بے داغ سفید لبادے میں سر تا پا مستور، کمان بھوؤں کے سائے تلے جھکی آنکھیں لیے، سر پر بالوں کا سنہری تاج سجائے، مرمریں بازو گود میں رکھے مشہور ہتیاری سنگی مجسمہ بنی دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔ وکیل منصفین سے مخاطب ہے:

"دیکھیے! خوبصورت جسم، ایتھنز میں آپ اپنی مثال مرمر کا یہ مکمل ترین پیکر
دیکھیے مسئلہ یہ نہیں کہ اس پر قتل کا الزام ثابت ہوتا ہے یا نہیں، اصل مسئلہ یہ ہے
کہ کیا زیوس کے ہاتھوں تراشا ہوا یہ مکمل ترین پیکر فنا کر دینے کے لائق ہے۔"

جمال پرست ایتھنز کے منصفوں نے حسن کا اکمل ترین نمونہ فنا ہونے سے بچالیا۔۔ یہی نہیں بل کہ یہی وہ ہتیاری ہے جس نے وینس کے مجسمے کے لیے پوز کیا۔

شاگرد جسم کی باغی دنیا کی کہانی میں گم ہیں کہ ایک لڑکی نمودار ہوتی ہے، حسن کا نادیدہ احساس ایک طالب علم کے اعصاب پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسے حسن کے پیکر کو چھو کر دیکھنا چاہتا ہے۔۔۔ آخر کئی مراحل کے بعد یہ گھڑی بھی آتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس ایک جسم میں کئی عورتوں کے جسم ہیں ہیلن، سیفو، الیکٹرا، مونالیزا، قلوپطرہ، دروپدی، زلیخا، انارکلی، سیتا، میرا بائی، قراۃ العین طاہرہ، جون آف آرک، آئی سس، عشتار، دُرگا، ایفرودت، سائیکی، وینس، مریم، حسن کی عملداری کا سفر جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ سیاہی قلب کی شب تار شکاری عفرتیں باہم لڑتیں، چڑیلیں کھوپڑیوں کو گیند بنائے، پچھل پائیوں کی طرح ناچتیں، تاریکی سے محو اختلاط ہوتی ہیں۔ خون آشام ہونٹوں کی لالی نادیدہ ہیئت کی اسیر ہے۔ صبح کی پہلی کرن دیکھتی ہے پینٹنگ میں نمودار ہونے والی عورت خون آشام

منہ کھولے کھڑی ہے، لہو کے چند قطرے سرخ ہونٹوں سے لکیر بناتے، تھوڑی تک آ گئے ہیں سامنے دانتوں میں گوشت کے ریشے چمک رہے ہیں اور ایزل کے سامنے مصور سینے پر گہرے گھاؤ کے اندر ساکت دل لیے چپ ہے۔ قطرہ قطرہ خون ایک ہاتھ میں لہو میں ڈوبا برش گویا تصویر کے نیچے دستخط کرتا ہے۔ آنکھوں اور ہونٹوں پر طمانیت حسن اور عشق کی تکمیل ہو چکی، تصویر اور تقدیر اپنی کاملیت سے ہمکنار ہوئیں۔

مصنف نے یہ افسانہ مجید امجد کی نظم ''ایک فلم دیکھ کر'' لکھا۔

چراغ بستی کا چراغ

ایک عمومی موضوع کا افسانہ ہے، جہاں ایک شخص بستی سے نکل کر عافیت اور سکون کی تلاش میں جنگل میں آیا کرتا تھا۔ جنگل اس کا رفیق ہے، وہ اپنے آپ کو بے چراغ بستی کا نوحہ خواں قرار دیتا ہے اور ہمیشہ ہاتھ میں ایک چراغ رکھتا ہے، لوگ اس سے بے چراغ بستی کا قصہ سنتے پھرتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ کیا بستی والے بہت ہی بد تھے؟ وہ جواب دیتا ہے:

''بدی کے درجات نہیں ہوتے، یا بدی ہے یا بدی نہیں۔ چھوٹی بدی، بڑی بدی، کم بدی، زیادہ بدی۔۔۔ یہ بے معنی تقسیم ہے، بدی کی صرف ایک ہی قسم ہے اور وہ ہے۔۔ بدی اور بس۔''

پھر وہ کہانی سناتا ہے۔

''یہ نیک خصلت اور پاک طنیت لوگوں کی بستی تھی، لوگ اتنے نیک کہ بدی کا نام بھی نہ سن سکتے چناں چہ ہر وقت بدوں اور بدی کی تلاش میں رہتے، وہ اتنے پاک تھے کہ ناپاکی کے تصور سے ناپاک ہو جاتے، لہٰذا ہر وقت پاک لوگ مزید پاک ہونے کی دھن میں رہتے، یہ طرزِ عمل حد سے بڑھ کر انتہا پسندی کے جنون میں تبدیل ہو گیا جس کے نتیجے میں انھیں اپنے علاوہ ہر شخص بد اور ناپاک دکھائی دینے لگا، یوں پاک معاشرہ میں الزام، بہتان اور دشنام نے فروغ پایا، اگلا مرحلہ تعزیرات کا تھا، لیکن پاک سرزمین پر ناپاک سزا یافتہ کیسے دفن ہو سکتے تھے لہٰذا بدکاروں گنہگاروں کے ناپاک وجود سے معاشرہ کو پاک کرنے کے لیے

انھیں جنگل کے درختوں کی مردہ جڑوں میں زندہ دفن کرنے کا سستا اور موثر
طریقہ ایجاد کیا گیا۔ تدفین کا صاف ستھرا انداز تب ایک دن۔۔ چوراہے پر
ایک بے حد خوبصورت نوزائیدہ پایا گیا۔۔ غصے، تعصب، نفرت اور کراہت سے
پاک لوگوں کے چہرے مسخ ہو گئے۔ میں بے اولاد تھا میں بچہ گود لینے کے لیے
مچل اٹھا، پاک بزرگوں کا فیصلہ تھا اس ناپاک وجود کو جنگل میں پھینک دو۔"

بچہ اس نوحہ خواں نے بچالیا اور خود جنگل بدر ہوا، اب اس کا کام ہے کہ وہ ہر بے چراغ بستی میں نیکی اور محبت کا چراغ جلانے پر متعین ہے۔ نیکی کے عذاب میں مبتلا اپنے گناہوں کے اعتراف سے منکر معاشرے آخرکار بے چراغ بستیوں میں تبدیل ہوتے ہیں۔

حاتم طائی کا زوال

سلیم اختر کی بہترین کہانیوں میں سے ایک ہے، حاتم طائی داستانی ادب کا ایک ایسا کردار ہے جو دوسروں کی مشکلات حل کرنے کے لیے ہفت کشور طے کرتا ہے لیکن خود بے ثمر ہی رہتا ہے۔ کہانی کی فضا داستانی اسرار و رموز اور علامتوں پر مبنی ہے۔ اپنے دوست منیر شامی کی خواہش پر حاتم، حسن بانو کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور پھر حسن بانو کی شرائط پوری کرنے کے لیے اپنے سفر پر نکل جاتا ہے۔ کامیابی پر دل ہی دل میں حسن بانو حاتم پر عاشق ہوتی ہے اور حاتم، حسن بانو پر، لیکن حاتم اپنے وعدے کا پکا ہے وہ حسن بانو کا ہاتھ منیر شامی کے ہاتھ میں دیتا ہے اور اسی نفسیاتی دباؤ میں قوتِ مردی سے محروم ہو جاتا ہے۔ آخر اپنے آپ کو ایک قبیلے کے سردار کی حضوری میں دیتا ہے۔

"ہوا یہ کہ قیام کی پہلی شب بھٹکے مسافر کی تھکن اتارنے کے لیے ایک خوبرو کنیز
اس کے خیمے میں بھیج دی گئی۔ زوجہ ہوتی تو زہر میں بجھی زبان سے طعنہ زن ہوتی
کنیز تھی سولب کشانہ ہوئی۔"

سردار نے اعتراف کیا کہ حاتم جس کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہے کہ بے ضرر شخص ہے تب حاتم نے زبان کھولی۔

"چلیں یوں کرتے ہیں میں تمہارے اونٹوں کی دیکھ بھال کر لیا کروں گا،
بکریاں سنبھال لوں گا اور عورتوں کو کنوئیں سے پانی نکال دیا کروں گا۔۔۔ اور

ہاں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ۔۔۔۔

مصنف نے آخری فقرہ ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ وہ منیر شامی، حسن بانو اور حاتم کی غیر فطری تثلیث کو مسخرہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن رشک کے سو بہانے ہیں یقین نہ آئے تو فیض کی نظم رقیب سے۔۔۔ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

جیون جل

یہ کہانی بھی حاتم کے کردار کے گرد گھومتی ہے۔ کہانی کی فضا پرانی داستانوں کے رومان کو تازہ کرتی ہے۔ حاتم، حسن بانو کو منیر شامی کی بے قراری کے قصے سنا رہا ہے اور شہزادی مشتاق نظروں سے حاتم کو دیکھ رہی ہے، کامیابی سے دوچار ہونے کے بعد ایک لمحے حاتم سوچتا ہے:

"حاتم! یہ ارمغانِ حسن کہ باعثِ دلکشیِ شبستان شاہی ہے تو اسے ناکارہ منیر شامی کے حوالے کرے گا؟"

احمق حاتم خود ہی اپنے سوال میں گم ہے۔ منیر شامی حاتم کو تحفے میں کنیزوں کا جمِ غفیر عطا کرتا ہے جو اس کو طرح طرح سے بہلاتی ہیں لیکن حاتم کے سرد جسم اور ٹھٹھرتے ہوئے جذبات کو گرمانے میں ناکام رہتی ہیں۔

آخر ایک مرد دانا حاتم کو آبِ حیات، جیون دینے والے پانی اور مرتیو سے مکت کرنے والے جیون جل سے آگاہ کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گیان دھیان کے قوانین بھی سکھاتا ہے:

"یہ انمول شکتی یوں استری پر ضائع نہیں کی جا سکتی اس کی رکھشا کرنی ہوتی ہے۔ اے حاتم ہم سب سے پہلے اسی کی بلی دیتے ہیں۔"

تب حاتم کے سینے سے سرد آہ نکلی ہے، تو کیا میری زیست کارزیاں میں رائیگاں گئی؟ وہ اپنے آپ سے آخری سوال کرتا ہے، جواب گم ہے۔ بے ثمر، لاولد حاتم منیر شامی کی بساط کا ایک معمولی مہرہ ثابت ہوتا ہے۔

تذکرہ اشجار

سلیم اختر کا ایک اور کامیاب افسانہ ہے۔ افسانے کا بنیادی منظر نامہ داستانوی ادب سے ماخوذ ہے۔ فضا بے حد رومانوی اور پُر اسرار ہے، مکالمہ جاندار اور کردار جانے پہچانے؛ بنیادی طور پر افسانہ طاقت،

عیاری، دوراندیشی اور بروقت فیصلوں کے اوصاف سے مزین ہے۔ وثیقہ نویس کہتا ہے:

''عاجز، شہنشاہِ دو عالم، گیتی پناہ، سریر آرائے تختِ سلیمانی فخرِ دودمان سلطانی کے پشتنی غلاموں میں ہے، جب آج سے قبل اڑھائی صدی، شہنشاہ عالم کے نیر درخشاں جیسے جد، ماورالنہر سے مقدر آزمائی اور مہم جوئی کے لیے نکلے اور اس خطہ مینو سواد کا رخ کیا تو اس غلام کے آبا بھی ہم رکاب تھے۔ انھوں نے معرکہ آرائیوں میں قوت بازو کا مظاہرہ کیا، لشکر جرار کی قیادت کی، دشمنوں کی سرکوبی کی، بدخواہوں کو نیست و نابود کیا، مفسدوں کے سر کچلے اور سازشیوں کو نابود کیا۔ یہی نہیں سلطنت تو ہر فاتح ہی حاصل کر سکتا ہے مگر اسے قابو میں رکھنا اور رعیت کی محبت حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ انھوں نے حسن تدبر، عدل و انصاف اور معاملہ فہمی سے رعایا کے دل جیت لیے۔۔۔ بندہ حقیر نے چار پشت ملک تیغ کی وفاداری سے حق نمک ادا کیا۔ دربار سے تعلق کے بعد ایک صبح میرے والد نے فجر کی نماز ادا کی اور تسبیح کے بعد مجھے یوں خطاب کیا:

''اے پسر۔۔۔ گوشِ نصیحت سے کام لو گے تو کبھی سرگرداں اور خوار نہ ہو گے اے نور چشم۔۔۔ بادشاہ اور بچے میں صرف عمر کا فرق ہوتا ہے مزاج کا نہیں۔۔۔ بادشاہ پر جب غصہ سوار ہو، اسے جاں سپاری اور جان نثاری کچھ یاد نہیں رہتی لہٰذا اسے کبھی غصہ نہ دلاؤ۔۔۔ ہمارا بادشاہ نیک نہاد ہے لیکن بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے۔''

عاجز نے پدر محترم کے پند سودمند کو حرز جاں بنایا اور کتاب سے مکالمے کو ترجیح دی۔ آخر ایک دن ایک انمول کتاب کا تحفہ جو عقل و دانش کا نچوڑ تھی بادشاہ کی نذر کی۔ کتاب کیا تھی موتیوں کا خزانہ، حضور تحفہ پا کر خوش ہوئے اور گلوئے مبارک کی مالائے مروارید عنایت فرمائی۔ اب عالم پناہ امورِ سلطنت کے بجائے محوِ مطالعہ رہتے اور اپنا وقت خردمندی میں گزارتے اکثر اوقات کجلی بن کی طرف نکل جاتے اور مجھے ہمراہ رکھتے۔ وہیں ایک دن ایک زنِ باجمال ظاہر ہوئی میں اور میرا قلم اس بداطوار غیر منکوحہ کے ظہور پر چپ رہے، آخر ایک دن بادشاہ کجلی بن کے بے نشان مدفن کی طرف روانہ ہوا اور اسی بے نشان قبر کا شکار ہوا

جس میں پہلا بادشاہ اتارا گیا تھا۔ میں کہ وقائع نگار خصوصی اور دربار شاہی کا مورخ تھا، مجھ سے یہ حقیقت کیسے روپوش رہ سکتی تھی کہ چالاک بادشاہ، مخالفین اور ماضی کے ساتھیوں کو جس طرح قتل کروا رہا ہے، نگلی بن ایک بڑے قبرستان میں بدل جائے گا۔

میں نے باپ کی نصیحت پر عمل کیا، خاموش رہا۔ منہ کو بند اور قلم کو بادشاہ کا تابع رکھا۔ میری زندگی میں ایک بار پھر ایک نیا بادشاہ زنِ نابجار اور اسرار اشجار کا شکار ہوا؛ صفحے ختم ہوئے، درختوں کو چیونٹے چاٹ گئے، بادشاہت کو گھن لگا مگر میرا قلم وفاداری کے باعث چپ رہا۔ رموزِ سلطنت کی چالاکی اور وقائع نگاری کی عیارانہ چشم پوشی تاریخ عالم کی عالمگیر سچائی ہے۔ سلیم اختر کا یہ افسانہ زبان و بیان اور اشارات خفی کے باعث قابل پذیرائی ہے۔ تاریخ نہ رہے تو وقائع نویس بھی کہاں ہوتے ہیں چناں چہ مخطوطے کے آخری صفحے غائب ہیں۔

کاٹھ نگر میں پتلی تماشا

کاٹھ نگر، کاٹھ نگر کی عورتیں، کاٹھ کا شہر، سلیم اختر کے ہاں بے حسی، ظلم، عدم انصاف اور جبر و تشدد کا استعارہ ہے۔ پتلی تماشے کی علامت شاہی احکامات کے زیر اہتمام ایک دبی ہوئی، مایوس، مغموم اور مظلوم زندگی گزارنا ہے لیکن ایک دن عجب واقعہ رونما ہوتا ہے۔ کٹھ پتلیاں بنانے والا تخلیقی فن کار، جسے نت نئے تماشے دکھانے، نئی کہانیاں گھڑنے، گیت لکھنے اور پھر انھیں خود ہی گانے کا ماہر سمجھا جاتا ہے اپنے بادشاہ کی خوشی کے لیے انوکھا پتلی نگر بساتا ہے، تخت نشینی کا جشن منایا جا رہا ہے۔ رعایا محبوب بادشاہ کے تخت کے جشن کے لیے جی جان سے مصروف ہے۔ عظیم الشان پتلی تماشے کے مقابلے کا اعلان ہوتا ہے۔ بادشاہ، جو خود بھی ایک پتلی کی نسل سے تعلق رکھتا ہے، پتلی بازوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس لیے پتلی بازی کو کسب شاہانہ کا درجہ حاصل ہے۔ شعرا نے ہوا کے رُخ کے ساتھ موضوع اصناف ہی بدل دیا ہے۔ ظلِ سبحانی ایسے پتلی باز شعرا کی کمال پذیرائی کرتے ہیں۔ کسی گلِ سر سبز کی جگہ کاٹھ کا پھول قومی نشان قرار پایا ہے اور شاہِ دوراں کی چشم بصیرت افروز نے شاہی مستقر کے لیے کاٹھ نگر کی تعمیر کا اعلان فرمایا ہے۔ درخت کٹے ہیں تو تتلیاں، پھول، پرندے اور موسم بھی اجنبی ہو گئے ہیں، اس کاٹھ نگر کا پتلی گر ایسی لکڑی کی تلاش میں ہے، جس میں انسانی جسم کی نرمی گرمی اور لوچ ہو، چناں چہ وہ ایسا درخت

تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ درخت کی سرخی اعصابیت میں جھنجھناہٹ پیدا کر رہی ہے۔ سرخ زمین پر سرخ درخت، تنا انسانی جسم کی طرح گرم۔ وہ اس بے برگ و بار سرخ درخت سے اپنے کردار تراشتا اور انھیں خوبصورت زیورات اور لباس سے مزین کرتا ہے۔ بادشاہ، ملکہ، شہزادی، شہزادہ، وزیر، وزیر زادہ بنانے کے بعد وہ احسان مندی کے جذبے کے تحت جنگل میں ملنے والے اس اجنبی کا پتلا بھی بنا ڈالتا ہے جس نے درخت کی نشاندہی کی تھی۔ سبز ڈھیلا چوغہ، لمبے بال، روشن آنکھیں، لمبا قد، یہ داستان گو کا کردار ہے جسے بادشاہ کے حضور کورنش بجا کر کہانی بیان کرنا اور آخر میں فرشی سلام کرنا ہے۔ دربار سجایا گیا ہے دراز قد داستان گو آیا ہے، لوگ تالیاں بجا رہے ہیں لیکن قصہ گو تو کچھ اور ہی کہہ رہا ہے۔ کٹھ پتلیاں پتلی گر کے قابو میں نہیں، کاٹھ کے ہاتھ زندہ ہو گئے ہیں۔ بادشاہ کے ظلم کی کہانی کہی جا رہی ہے۔ بادشاہ گرفتاری کے احکامات اور پتلی زادوں کو جلا دینے کے احکامات جاری کر رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پتلیاں اور کاٹھ نگر شمشان گھاٹ میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اگلے روز تمام مملکت میں پتلی تماشے ممنوع قرار پاتے ہیں۔

مصنف جانتا ہے خیال اور لفظ کی طاقت کسی بھی جبر کی فضا میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر سکتی ہے اور اظہار کا کوئی بھی راستہ، انقلاب کے سرخ سویرے کے استقبال کے لیے اپنے بازو پھیلا سکتا ہے، پاکستانی مملکت میں برسوں مارشل لاء کی پابندیاں اور قید و بند کے موسم رہے لیکن لکھنے والوں کے قلم، مصوروں کے برش اور گیت سناتی زبانوں کو روکا نہ جا سکا، اور پھر کٹھ پتلی کی طرح زندگی بسر کرتے ہوئے عوام اپنے حقوق کے لیے انھی پتلیوں کے پیراہن سے باہر آئے اور اپنے حقوق چھین لیے، افسانہ اپنے اندر ابلاغ کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

جبل ممنوعہ

جبلِ ممنوعہ ایک علامتی افسانہ ہے، جس میں مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آرزوؤں اور حسرتوں سے بھری اس دنیا میں ہر شخص کا اپنا ایک پہاڑ ہے، جو اس کے لیے پیغام اور انعام کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی روشنی اور اس کا بلاوا انسانی خوابوں میں چھپا ہوا ہے اور یہ بلاوا زندگی کی دلیل ہے۔ اس پہاڑ کے اس طرف کیا ہے کوئی نہیں جانتا بلندی کی حد۔۔ کہانی بادشاہ اور اس کے خوشامدی درباریوں

کے گرد گھومتی ہے جو بادشاہ کی خوشنودی بھی چاہتے ہیں اور اسے چشم حسود سے بھی دیکھتے ہیں، زندگی اور موت کی عطا کا گھناؤنا کھیل کھیلتے ہوئے بادشاہ ہر لمحہ اپنی تعریف و توصیف چاہتے ہیں اور ان کے وزیر باتدبیران کے اس وہم کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جاتے ہیں کہ اس قرطاس ابیض پر بادشاہ کے لیے خوش بختی کے علاوہ کچھ اور درج نہیں۔ البتہ کچھ وزیر اس خوش بختی اور خوش تدبیری کو کسی ایک بادشاہ کے مستقل وجود کے لیے مناسب نہیں سمجھتے اور بادشاہ کی بے کلی و بے قراری کے لیے انوکھے حل تجویز کرتے ہیں۔ وہ بادشاہ کے نام کو مزید بلند، مزید بلند، بلند، بلند، بلندی کے درجے پر فائز دیکھنے کے لیے اسے اڑنے کا مشورہ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ خشکی، تری، ہوا، پانی سب کا مالک ہے۔ اس افسانے کے بادشاہ کو بھی یہی باور کرایا گیا ہے، چناں چہ اس نے اپنے لیے موم کے پر تیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

دن بے حد چمکدار ہے، بادشاہ کی اُڑان کا دن ہے، شاہی قلعہ کے سب سے اونچے برج پر سے شہنشاہ نے آغاز کیا ہے۔ کلمات تحسین بلند ہو رہے ہیں شاہِ دو جہاں کا دل دھڑک رہا ہے لیکن وہ بادشاہوں میں سب سے معزز اور بلند مرتبت ہونے کی پر جوش مسرت میں خلا میں قدم رکھ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ زمین کی ہر شے ایک نقطہ بنتی جا رہی ہے، کوے، طوطے، چیلیں، گدھ بادشاہ کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ بے آب و گیاہ چاند پیچھے رہ گیا ہے، بے کراں وسعتوں میں جسم گویا پسینہ بن کر بہہ جانا چاہتا ہے واپسی میں تاخیر ہو چکی ہے۔ شہنشاہ سفر سے نہیں لوٹا، دوسرے دن رعایا نئے بادشاہ کی تاج پوشی کا منظر دیکھتی ہے جو وزیر باتدبیر سے کہتا ہے کہ وہ واقعی باتدبیر ہے:

> ''وزیر باتدبیر کورنش بجالایا مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی کہ ہر وزیر باتدبیر مسکراہٹ سے ناآشنا ہوتا ہے۔''

خیابانِ پاک جہاں

ایک طنزیہ افسانہ ہے، جس کی عمومی گفتگو بے ربط اور تعفن سے بھرپور ہے، افسانے کا آغاز دو فقروں سے ہوتا ہے ''یہ سڑک کہاں سے آتی ہے'' ''یہ سڑک کہیں سے نہیں آتی۔'' افسانے کا انجام بھی دو فقروں پر ہے ''یہ سڑک کہاں جاتی ہے۔'' ''یہ سڑک کہیں نہیں جاتی۔''

مصنف معاشرتی بے تعلقی، بے مقصدیت اور لچرپن کے مختلف شیڈز سے افسانے کو آگے بڑھاتا

ہے، چوں کہ معاشرتی ارتقا کی کوئی ظاہر اور باطن صورت حال دکھائی نہیں دیتی، چناں چہ سڑک بھی اپنی جگہ پڑی رہتی ہے۔ جب مسافر کہیں جانا ہی نہ چاہتے ہوں تو راستے کو کیا پڑی ہے کہ ان کی منزل کا تعین کرے۔ غیر ممالک کے سہانے خواب دیکھتے دیکھتے، مقامی چیزوں کی بے حرمتی میں مصروف ہیں اور بھانت بھانت کی آوازوں سے پاکستان کا گلستان بھرا پڑا ہے۔ یہ چمنستان نہیں ججوستان ہیں، جہاں نیکی کی توقع سے افسانہ نگار مایوس ہو چکا ہے۔

آدھی رات کی مخلوق

نیویارک کی ترقی یافتہ زندگی کی دہشت کا افسانہ ہے، جہاں لوگ کالوں کی راہ زنی سے خوفزدہ ہیں۔ اسی فضا میں مصنف ایک لڑکی کے قریب آتا ہے جو پیشہ ور طوائف ہے لیکن راہ زنوں کا خوف دونوں کو قریب لے آتا ہے مانوسیت کے احساسات میں لپٹی ہوئی عورت، پاکستانی مرد کے کمرے میں ستار کی آواز سن رہی ہے اور کافی پیتے ہوئے اپنے آپ کو ذرا دیر کے لیے گھریلو عورت سمجھ رہی ہے۔ لڑکا خوش ہے کہ ذرا سی دیر کے لیے ہی سہی، اس نے ایک عورت کی معصومیت کو دریافت کرلیا ہے، کبھی کبھی خوف انسانوں کو بہت قریب لا کر یکسوئی اور یگانگت بھی عطا کر دیتا ہے۔

جنم روپ

سلیم اختر کے پسندیدہ موضوع سائیکی اور آرکی ٹائپ کی ایک مثال ہے، جسے نرگسیت کی اصطلاح کو اجاگر کرنے کے لیے نارسس اور ایفروڈائیٹ کی علامتی کہانی سے مضبوط کیا گیا ہے۔ نظم کی بنیاد میراجی کی نظم ''سمندر کا بلاوا'' پر رکھی گئی ہے جسے میراجی کے ناقدین ممتا سے بھری نظم قرار دیتے ہیں۔

گرو دکشنا

سلیم اختر کے پسندیدہ موضوعات میں سے ایک موضوع سے متعلق ہے۔ کہانی کے تین کردار ہیں گرو، چیلا، طوائف، اس تثلیث کو مصنف نے بیک وقت مرد و زن کی محبت اور ہم جنسیت کے احساسات اجاگر کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ گرو ہمیشہ چیلے کو عورت سے دور رہنے کا درس دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھاتا رہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن چیلے کو اپنے گرو کے علم اور عرفان کی تعلیم کا معاوضہ دینا ہے کیوں کہ احسان کا بدلہ ایک نہ ایک دن چکانا ہی پڑتا ہے۔ جانوروں، سانپوں، پودوں پرندوں اور

درختوں کی رفاقت میں پروان چڑھنے والا چیلا ایک دن ایک ویشیا سے ٹکرا جاتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی سے گرمی کی جو لہر چلی تو تن جوالا کی راکھا انگ انگ میں بکھر گئی، ڈگمگا کر چوکھٹ پکڑ لیتا ہے، ایک دن ویشیا اس سے سوال کرتی ہے:۔

''مہاراج آپ کیا کرتے ہیں۔

گیان۔

کاہے کو۔

سریر پوتر کرنے کو۔۔۔اور

آتما پوتر کرنے کو۔۔۔اور

بدھی مان بننے کو۔''

وہ سب دہرا کر ہولے سے پوچھتی ہے ''یہ سب کاہے کو''

وہ گرو دیو کا پڑھایا دوہراتا ہے اور ویشیا کہتی ہے:

''گرو دیو نے کتھاؤں کے بارے میں نہیں بتایا: کتھا سرت ساگر، پنج تنتر، بیتال کتھا؟

چیلے کا دعویٰ ہے کہ برہم چاریوں کو ناٹک سے کیا لینا؟ یہ سب مایا ہے؟؟

ناری کہتی ہے:''ناٹک بھی تو مایا ہے۔''

چیلا اسی ناٹک کا اسیر ہو جاتا ہے اور اس بات پر یقین لے آتا ہے کہ ناری ہی گیان، ناری ہی تپسیا، ناری ہی بدھی اور یہ جانے بغیر گویا کچے گھڑے پر جیون پار کرنا ہے۔

ناری کا دعویٰ ہے کہ وہی جیون رس ہے اور وہی گنوان کو شکشا دے سکتی ہے۔

چیلا ناری کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے اور لچھمن ریکھا الانگ جاتا ہے۔

کہانی کے آخر میں مہاراج گرو چھری تیز کیے چیلے سے گرو دکشنا کے متقاضی ہیں اور چیلا سوچ رہا ہے کہ یہ دکشنا تو وہ کسی اور کو دے آیا ہے!!!

ڈاکٹر سلیم اختر تصوف اور بیراگ کی غیر فطری زندگی کو مصنوعی زندگی تصور کرتے ہیں اور جسمانیت کی اولیت پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے بہت سے افسانوں کا موضوع جنسیت کے مختلف مظاہر ہیں۔ یہاں بھی آدم کی پہلی استاد حوا کی کارگزاری چیلے کو اس جسمانی مانوسیت سے مانع رکھتی ہے، جس کا تقاضا گرو نے کیا ہے۔ یہ افسانہ مصنف کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے اور اپنے تاثر کے باعث دیر تک قاری کو اپنے حلقہء اثر میں رکھتا ہے۔ اسے اُردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

ہراک خواہش پہ

افسانے کی شکل علامتی ہے، ایک طنز لطیف جو انسانی بے چارگی کا اشارہ دیتی ہے، ایک دھوبی کا گدھا اپنی زندگی کی مشقت اور اپنی تحقیر سے اکتایا ہوا ہے اور کسی دوسری شکل میں بہتر زندگی کا تمنائی ہے۔ وہ دیوتا کے مندر جا کر جیون سپھل ہونے کی دعا کرتا ہے۔ دیوتا اسے تین جیون عطا کرتا ہے: پہلی حالت میں وہ اپنی چار ٹانگوں کے بجائے دو ٹانگوں پر کھڑا ہے اور ایک کڑیل جوان میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ابھی وہ آزادی کی شاہراہ پر قدم ہی رکھتا ہے کہ دھر لیا جاتا ہے۔ سپاہی اسے کوتوال کے پاس لے جاتے ہیں خاصی چھترول کے بعد بندی خانے میں ڈال دیا جاتا ہے، اگلی صبح جبری مشقت پر لگا دیتے ہیں۔ مہاراجہ کے باپ کا مقبرہ بن رہا ہے، بیگار میں پکڑے ہوئے مزدوری بھی کرتے ہیں، گالیاں اور جوتیاں بھی کھاتے ہیں۔ مقبرہ بن جاتا ہے تو گدھا بھی آدمی کی جون سے رہائی چاہتا ہے۔ اب اسے ایک سیاہ بھونرا آنکھوں والی نرم گرم دوشیزہ کی شکل میں ظاہر ہونا ہے جو دیکھنے میں کنچنی لگتی ہے۔ لوگ اس پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں اس کے لباس کے ساتھ ساتھ اس کے انگ اور آتما بھی ادھڑ گئی ہے۔ گدھا یہاں سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے اچانک اسے دیوتا کی شکل عطا کر دی جاتی ہے۔ منتیں مُرادیں مانگنے والوں کا ایک ہجوم ہے جو دعائیں نامقبول ہونے کے باعث اسے جلی کٹی سنا رہا ہے گدھا التجا کرتا ہے: ''پربھو مجھے پرائے جیون راس نہ آئے، میں واپس گدھے کی جون میں آنا چاہتا ہوں۔''

ندائے غیب ابھرتی ہے: ''احمق گدھے! کیا اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتا کہ گدھے سے پرش، استری اور دیوتا بنایا جا سکتا ہے مگر دیوتا سے گدھا بننا ممکن نہیں''

سانتا کلاز کا زوال

اس کائنات میں ہر شے کا حوالہ کوئی دوسری شے ہے۔ پرانا لطیفہ ہے کہ خدائے یکتا اپنی مخلوق سے شناسائی کے لیے شہر کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتا تھا اور صدا لگاتا تھا کہ میں خدا ہوں۔ کسی نے اس کی بات پر اعتبار نہ کیا۔ آخر کار اپنی ذات کے استناد کے لیے اسے عیسیٰ اور اپنے مابین تعلق کا حوالہ دینا پڑا، تب کہیں جا کر لوگوں کو اس کی ربوبیت کا اعتبار آیا۔ سلیم اختر کا یہ افسانہ اسی قسم کے رجحانات کی جانب اشارہ دیتا تھا۔

خداوند مسیح کی دنیا میں آمد کا دن ہے، آج اس کا دن ہے وہ سفید برف کے رنگ کے حاشیے والا دبیز سرخ چوغہ پہن کر لمبی سرخ ٹوپی میں سر کے گھنے بال چھپا کر، روئی جیسی داڑھی بکھیرے سرخ تھیلا ہاتھوں میں لیے بچوں کے خوابوں کی تعبیریں، خوشیوں کے تحائف اور آرزوؤں کے گلاب بانٹنے نکلتا

ہے۔ برف کی گاڑی تیار ہے۔ سانتا کلاز پیتل کی گھنٹی بجاتا ہے اور اشارہ پاتے ہی رینڈیر ہوا ہو جاتے ہیں۔ اچانک اسے محسوس ہوتا ہے کچھ گڑبڑ ہے۔ اسے اپنے گردنادیدہ دائرے کا احساس ہوتا ہے۔ منظر نامہ ساکت ہے اگرچہ سفر جاری ہے۔ اس کی گاڑی رک جاتی ہے۔ وہ اندھیرے میں ایک مکان کی چوبی سیڑھیاں پھلانگتے ایک بچی کو اُداس دیکھتا ہے۔ اُداسی کا سبب پوچھتا اور اپنا تعارف کراتا ہے او راپنے تحائف کی اہمیت دوہراتا ہے۔ بچی سوال کرتی ہے کیا میں جو چاہتی ہوں مجھے ملے گا؟ سانتا کلاز پُریقین ہو کر اثبات میں سر ہلاتا ہے، لیکن بچی کے لیے تحفہ تلاش کرتے ہوئے اس کا ہاتھ گویا پتھر کا ہو جاتا ہے۔ بچی کہتی ہے: ''مجھے میرا باپ چاہیے۔'' وہ باپ جو زندہ ہے لیکن اس بچی کے ہمراہ نہیں۔ اسی اثنا میں بچی کی ماں نمودار ہوتی ہے اور سوال و جواب پر چڑ کر کہتی ہے: ''سانتا کلاز ہوتے ہوئے تم کتنے احمق ہو۔۔۔ مجھے کئی مردوں نے مل کر خراب کیا ہے اور وہ بھی کرسمس والے دن۔ اب میں اکیلی رہتی ہوں اور اسی طرح روزی کماتی ہوں۔۔۔ چلو بھاگو کچھ دیر میں خاص مہمان آتے والے ہیں۔ سانتا کلاز سوچتا ہے، اس کے تحفے کیا کسی باپ کا نعم البدل ہو سکتے ہیں؟ اسی اثنا میں ایک اپاہج نمودار ہوتا ہے، جسے پچھلی کرسمس کے موقع پر سانتا کلاز نے شاعری کی کتاب کا تحفہ دیا تھا۔ اپاہج کہتا ہے: ''خرابی یوں ہوئی کہ میں ظالموں کی بستی کا شاعر تھا۔ ظلم پر مبنی معاشرہ میں انسان کی عظمت، مساوات اور حقوق کا شاعر۔۔۔ میرے اشعار کی شہرت پھیلتی گئی حتیٰ کہ ایک دن مجھے بے دین اور باغی قرار دے کر بستی سے نکال دیا گیا، اب راستے میں پڑا ہوں راہ کے پتھر کی مانند۔''

''اگر تم میرے ہم خیال ہو تو اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالو اور میری گمشدہ شاعری مجھے واپس لوٹا دو۔''

سانتا کلاز کا سر ایک مرتبہ پھر جھک جاتا ہے۔ آگے ایک پر رونق بستی میں وہ ایک نورانی چہرے والے مقدس مقرر کر دیکھتا ہے، جو پر جوش اسلوب میں نیکی، عبادت، شرافت اخلاقی قدروں، مذہب اور خدا کے حقوق کی تلقین کر رہا ہے؛ اس نے دعائے خیر پر وعظ ختم کیا۔ سب نے حسب اطاعت نذر پیش کی، سانتا کلاز بھی آداب بجالایا اور اپنا تعارف کرایا۔ مرد نیکوکار تمسخرانہ ہنسا اور بولا: دراصل میں سانتا کلاز کو بچوں کا ڈھکونسلا سمجھتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے میں مذہبی آدمی نہیں، مذہب میرا پیشہ ہے، میرا روزگار، میرے بچوں کا پیٹ پالنے کا ذریعہ۔۔۔ یوں سمجھ کہ میں پاؤں کی بیڑیوں کے باوجود بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا تمہارے تھیلے میں ایسا کچھ ہے جو مجھے سچا مذہبی بنا سکے؟ سانتا کلاز اسے حرف تسلی ہی دے سکا، مقدس مقرر اسے اپنے ایک دوست کا پتہ دیتا ہے جو مجرمانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ مجرم تک رسائی کے بعد سانتا کلاز، اسے تائب ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ مجرم کہتا ہے: ''میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں مگر یہ

مجرم ہاتھ جیسے کسی اور کے مجھ سے بھی بڑے مجرم کے ہاتھوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔۔ میں توبہ نہیں کر پاتا۔''

ابھی سانتا کلاز اپنے کام میں مگن ہے اچانک پولیس کا چھاپہ پڑتا ہے، وہ تعارف کراتا ہے میں سانتا کلاز ہوں، آواز آتی ہے: ''سالے تم تو مجھے بہروپیئے لگتے ہو'' سانتا کلاز کا تھیلا مالِ مسروقہ میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہیں اور اسے انصاف گھر لے جایا جا رہا ہے۔''

بستی اور نیکی کا زوال سلیم اختر کا مقبول موضوع ہے، وہ اخلاقیات کی ٹوٹتی بکھرتی اقدار کو دکھ، تکلیف اور شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاید آسمانی طاقتیں بھی انسانی عیاری کا توڑ پیش نہیں کر سکتیں۔ ایسے بے رحم معاشرے میں بے چارے سانتا کلاز اور اس کے معصوم اور بے ضرر تحائف کی کیا اہمیت ہے۔

یہ دورِ بے ہنراں ہے بچا رکھو خود کو
یہاں صداقتیں کیسی کرامتیں کیسی؟

موہنی

صورت گھر دیوی کی مورتی بنانے کے لیے کسی زندہ شجر کا متلاشی ہے جو دیوی کی سندرتا سے جل کر راکھ نہ ہو جائے بل کہ اس کی شکتی کا بوجھ سنبھال سکے۔ آخر اسے ایک دودھیا چٹان دمکتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس چٹان کو نرم گرم محبوبہ کی طرح گھر لے آتا ہے اسے اپنے جیون اور جیون ساتھی سے دلچسپی نہیں رہتی، پتھر سے ایک مجسمہ تراشی گئی ہے جو حسن و حیرت کی تصویر ہے، مورتی ساز شرابی نظروں سے مورتی کو دیکھتا ہے سب اس کی تعریف کر رہے ہیں۔ اس کی جیون ساتھی اس پتھر کے ٹکڑے کو اپنی سوت قرار دیتی ہے وہ اسے نفرت، رشک اور حسد سے دیکھتی ہے اور مورتی کار کی زندگی سے نکل جاتی ہے اور اپنا بچہ بھی چھوڑ جاتی ہے۔ مورتی کار مڑ کر مورتی کو دیکھتا ہے جس کی آنکھوں میں سکون اور خمیدہ ہونٹوں پر مسکان اور شانتی ہے۔ اس کا خواب حقیقت بن چکا تھا مگر یہ زندہ حقیقت نہ تھی، مورتی کار ایک بار پھر مورتی کی زندگی کے لیے بیوی سے رجوع کرتا ہے اس کی آنکھوں کا کاجل، ہونٹوں کی لالی اور بدن کا لباس چاہتا ہے کیوں کہ اس سب کے بغیر مورتی محض پتھر کی بے جان مورتی ہے۔ وہ غصے سے کہتی ہے:۔

''پہلے اس نے مجھ سے تمہیں چھینا اور اب چھنال مجھ سے اپنا پن مانگ رہی ہے
میری سوت میرا کاجل لگائے گی تو اس کی آنکھیں پھوٹ جائیں گی میری لالی
اس کے ہونٹوں پر کوئلہ بن کر دہکے گی۔ میرے بال اس کے سر پر ناگوں میں

تبدیل ہو جائیں گے۔۔سوت کے لیے ہرگز نہیں۔"

وہ خاموشی سے گھر سے نکل جاتا ہے، بے مقصد بستی کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا ہے، اسے اپنی مطلوبہ عورت مل جاتی ہے، جو اپنی ہر چیز اس مورتی کو دینے کے لیے تیار ہے لیکن ایک شرط رکھی ہے:

"میں اسے دیکھوں گی اگر وہ واقعی سندر ہے اور میرے بالوں، کاجل، لالی،

بندیا اور پائل کی حق دار ہے تو بخوشی دے دوں گی۔۔میں نے ہمیشہ اپنے انگ

کے دام وصول کیے ہیں، ایک تحفہ میری طرف سے بھی ہو جائے۔"

"دونوں ساتھ چلتے ہیں ویشیا بستی نہیں آ سکتی، اس لیے لمبا گھونگٹ کاڑھ لیتی ہے لیکن اس کا انگ انگ بول رہا ہے، لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ وہ مورتی کو غور سے دیکھتی ہے، یہ دیوی تو نہیں، صورت گر شرمندہ ہو کر کہتا ہے، میں تو دیوی بنا رہا تھا لیکن نہ جانے ہاتھ کیسے بہک گئے اور یہ بن گئی۔۔۔مگر ہے سندر۔۔بس میرے لیے ہے۔ میرے لیے یہ دنیا کی سب سے سندر ناری ہے۔۔اسی کی خاطر دنیا بھر کی عورتوں سے دان مانگتا پھرتا ہوں"

ویشیا بولی: "ٹھیک ہے جو تم چاہتے ہو، سب مل گیا مگر کیا تم نے ابھی تک اس پر غور نہیں کیا کہ تم نے میری ہی مورت بنا ڈالی ہے، ایک ویشیا کی، مورکھ۔

وہ مورت کے ساتھ کھڑی ہے، دونوں جڑواں بہنیں لگ رہی ہیں، ایک سفید، دوسری سانولی، ایک دنیا چکھے ہوئے، دوسری انجان۔ کون دیوی تھی کون ویشیا۔ اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑا گیا ہے۔

خالص عورت کے تصور کے لیے طوائف اور دیوی کے موضوع کو ہمیشہ رومان پسندی کا مظہر سمجھا گیا ہے، اس تصور کی عام زندگی میں تفہیم ممکن نہیں اس لیے یہ دونوں روپ مونثی عورت کے روپ ہیں، البتہ بیوی کا احساس ملکیت، ذمہ داریاں اور خالص موجودگی؛ مرد کے لیے غیر شعوری طور پر سوہانِ روح بنی رہی ہے، وہ اس معاشرتی قید کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیوں کہ اس کے خوابوں کی عورت وہی ہے جو یا تو قابل پرستش اور ان چھوئی ہو یا زمانے بھر کی دھتکاری ہوئی۔ آپ سب کچھ نذر کر دینے والی عورت۔ سلیم اختر ویشیاؤں کے اندر چھپی ہوئی خالص عورتوں سے خالی ہمدردی رکھتے ہیں۔ ایک مثال آدھی رات کی مخلوق میں ہمارے سامنے گزر چکی، دیویاں بھی ہمارے مصنف کی پسندیدہ مخلوق ہیں اور ان کا ذکر چلتا رہے گا۔

تیرہواں برج

بارہ برجوں میں تیرہواں برج برج ہول ہے۔ ایک افسانوی دہشت کی فضا میں کہانی کے ہیرو کی

ملاقات ایک نیم دیوانی بڑھیا سے ہوتی ہے، جو مدفون ماضی اور نازائیدہ مستقبل کی پیش بینی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نوزائیدہ بچوں کو اپنے تھیلوں میں رکھ لیتی ہے اور جنگل میں جاکر بھون کر کھا جاتی ہے۔ کچھ لوگ اس کے تھیلے کو شجر حیات کے پھل پھول کی آماجگاہ سمجھتے ہیں جنھوں نے بڑھیا کو عمر خضر عطا کر رکھی ہے۔ وہ ہیرو سے کہتی ہے تمھیں وہاں ہونا چاہیے جہاں تمہارا مقدر ہے اور تمہارا مقدر تیر ہواں برج ہے کیوں کہ تم عام لوگوں جیسے نہیں ہو۔ مقدر کے اس برج سے فرار ممکن نہیں۔ یہ متعین برج ہے۔ ہیرو سفر کھینچتا اپنے آپ کو خطہء ناخوب میں پاتا ہے۔ سیڑھیاں اسے نیچے اترنے کی دعوت دے رہی ہیں وہ نیچے اترتا چلا جاتا ہے۔ خوف کے منظر نامے میں اندر کا منظر بالکل مختلف ہے یہاں تازہ گھاس ہے، خوشگوار اور خوش رنگ پھول ہیں، آسمان کی نیلاہٹ ہے۔ اس نیلے دائرے میں ایک پرندہ پھڑ پھڑا رہا ہے شاید یہ کوئی دیوی ہے لکشمی، پاربتی، سرسوتی ایک من موہنی شکل اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ابھی وہ شانتی کے ساگر میں آنکھ موندھ رہا ہے کہ اچانک آنکھیں پوری قوت سے کھل جاتی ہیں۔ ایک خوبصورت سراپا اس کے خواب و خیال کا گھیراؤ کر رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے اسیر ہوئے ہیں، عین اس وقت جب نقطہء عروج کا فوارہ خوشی سے اچھلنے کو ہے، سب کچھ غائب ہو جاتا ہے۔ پری پیکر اپنے استھان پر ہے لیکن ایک کریہہ حلیے کے ساتھ مسافر چیخنا چاہتا ہے مگر زبان گنگ ہے۔ اس کے پاؤں پگڈنڈی پر ہیں۔ نہ مندر، نہ ٹوٹی چھت، نہ بکھرتی دھوپ، نہ دیواروں سے لپٹی بیلیں، نہ سنگی نہ ساتھی۔ لاوا اگلتی دھرتی سے ایک درخت نمودار ہو رہا ہے، انسانی ہاتھوں سے متشابہہ ناگ پھنی نہال ہو رہی ہے اور شاخ در شاخ سانپ خوشی سے شوکتے ہیں، ہونی ہو کر رہی ہے۔

نیک پروین

ایک عمومی شکل وصورت کی لڑکی مصنف کے ایک وجیہہ دوست کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے۔ وہ صورتِ یوسف جو لڑکیوں پر منڈلاتا ہوا بھنورا بنا ہوا تھا، اسی لڑکی کے احساسِ ملکیت اور حق خدمت کے باعث ایک اسیر کی سی زندگی بسر کرنے لگتا ہے اور اپنی زندگی کی طنابیں اپنی بیوی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جسے وہ از راہِ مذاق چڑیل اور بدروح سے مشابہہ قرار دیتا ہے۔

> ''جس طرح عورتوں پر سایہ ہو جاتا ہے اور ان پر جن عاشق ہو جاتے ہیں اسی طرح مردوں پر بھی چڑیلیں عاشق ہو جاتی ہیں۔''

لڑکی کے نام پروین کی نسبت سے ہی افسانے کا نام نیک پروین رکھا گیا ہے۔ کہانی کے ہیرو کا خیال ہے کہ اس معمولی صورت والی عورت نے اس پر تعویز گر وار کھے ہیں جو وہ اس کا ہمیشہ کے لیے تابع ہو گیا

ہے۔

نیا تماشا

مجمع باز اپنا تماشا دکھا رہا ہے۔ بچہ جمورا اس کا معمول بنا وہی زبان بول رہا ہے جو مجمع اور مجمع باز اس سے سننا چاہتا ہے۔ اچانک کرتب دکھاتے ہوئے وہ اس چادر کو فضا میں کئی فٹ بلند کرتا ہے جس میں بچہ جمورا بند ہے۔ مجمع باز کا کہنا ہے کہ وہ نیا تماشا دکھانے والا ہے۔ فرش سے بلند چادر کا تخت پاکستان کے مختلف علاقوں میں گھومتا گھامتا مجمع کے سامنے ہے اچانک بلا نازل ہوتی ہے، میلی چادر کی بنی قبر ڈھے جاتی ہے۔ تب مجمع کی حیرت زدہ آنکھیں چادر پر خون کے دھبے ابھرتے اور نمایاں ہوتے اور پھیلتے دیکھتی ہیں۔ شاید رزق کمانے کی خاطر ایک مظلوم کا خون کیا گیا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں روٹی کمانے والے اپنی جان داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں، اسی قسم کے المیوں سے دوچار ہوا کرتا ہے۔ یہی المیہ ہمیں دوسری شکل میں کاٹھ نگر کے پتلی تماشے میں دکھائی دیا تھا۔

سیاہ حاشیہ

کہانی رنگوں کی علامت سے آگے بڑھتی ہے۔ مصنف کی بیوی کی دوست اس بات پر مصر ہے کہ کفن سفید رنگ کے بجائے سیاہ رنگ اور لٹھے کے کپڑے کے علاوہ بھی ہوسکتا ہے۔ کالے رنگ کی موزونیت اس لیے ہے کہ یہ موت، ماتم اور غم واندوہ کا رنگ ہے اور موت بھی خبر بن کر سیاہ حاشیے میں سجتی ہے۔ بیان دینے والی مصورہ ہے اور رنگوں پر اچھا خاصا مواد رکھتی ہے۔ ان کی خاصیت اور علاج سے بھی واقف ہے، اس کا پسندیدہ رنگ کالا ہے، باتوں ہی باتوں میں کھلتا ہے کہ اس کے سسرال میں کالے کپڑے پہننے کی ممانعت ہے۔ اب وہ کالے رنگ کی پسندیدگی صرف اپنی تصویروں میں ہی پوری کرسکتی ہے۔ اچانک اس کی ساس انتقال کر جاتی ہے، وہ پاؤں پھسلنے کے باعث سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ اسی اثنا میں مصورہ جس کا نام ناز ہے اپنی تصویر کی نمائش پر سب کو مدعو کرتی ہے، بقول مصنف:

> ''ناز کی تصاویر اعصاب پر عجب اثرات ڈال رہی تھیں کہ یہ سب سیاہ تھیں بلیک انک، چارکول، سیاہ مارکر، بلیک آئل پینٹ اور واٹر کلر۔ ہر صورت میں سیاہ رنگ استعمال کیے تھے۔ چمک دار سفید کینوس اور آئیوری کارڈ پر بولڈ اسٹروکس سے عجب ہانٹ کرنے والے نقوش ابھارے گئے تھے۔ سیاہ لاوا، سیاہ پھول، سیاہ شاخیں، ناگ، کالے بچے، کالی چٹانیں، دریا پگھلا ہوا کوئلہ، درختوں کی سیاہ

جڑیں، دہشت سے کھلی آنکھیں، ڈوبتی عورت کا مدد کو اٹھا ہوا ہاتھ، کوؤں کے نرغے میں عورت، ہاتھ اور پاؤں پر بھاگتی عورت۔ عجب تصاویر تھیں اور عجب اعصابی اثرات۔"

ناز کے طلسم خانے میں ایک تصویر ایسی بھی تھی جو قدم روک رہی تھی۔ کوٹھے کی سیڑھیوں سے سر کے بل گرتی عورت اور پس منظر میں پھیلے ہاتھ سے مشابہہ سیاہ بادل۔ ناز بھی سیاہ لباس میں اپنی نمائش کی ایک تصویر لگ رہی تھی۔

افسانہ رمز وایما کے درمیان چھوڑ دیا گیا تھا شاید سیاہ رنگ کی اسیر ناز نے ساس کو سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا یا شاید ناز نے ساس کا تعاقب کرتی سیاہ موت کو دیکھ لیا تھا۔ نمائش کے سیاہ حاشیے میں سب کچھ مقید ہو چکا تھا جرم بھی، مجرم بھی اور شکار بھی۔

آخری تدبیر

کمرے کا آئینہ اس کے جرم کا تمسخر اڑا رہا ہے وہ جو خود موت کی آہٹ کا اسیر ہے اور جسے کمرے میں انسانی پنجر اچھلتے کودتے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ خواب دیکھتا ہے اپنے مرنے کا جنازہ پڑا ہے اور اس کی بیوی اس پر جھکی اسے "یو سینٹی مینٹل" کے القاب سے نواز رہی ہے۔ وہ چیخ مار کر بیدار ہو جاتا ہے، اس کے لاشعور میں بابر اور ہمایوں کی محبت کی کہانی بیدار ہوتی ہے، جس کی تمثیل پر یقین رکھتے ہوئے اس نے اپنی بیوی کی چارپائی کا طواف کرتے ہوئے، اس کی موت اپنے لیے مانگی تھی اور اب وہ اسی خواہش سے انکاری تھا۔ بیوی کی محبت اور اپنا ارادہ دونوں اس کا تمسخر اڑا رہے تھے، چناں چہ وہ اس عظیم قربانی کے اجرا سے ذرا پہلے گزرتی رات کی تنہائی میں تکیے کی مدد سے بیمار بیوی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ ساکت جسم سے تکیہ اٹھاتا ہے تو آئینے سے سامنا ہوتا ہے، وہ سوال کرتا ہے:

"تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔"

آئینہ ساکت ہے اور خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہے:

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

وفاداری آخری تدبیر کے ہاتھوں اپنے انجام سے ہم کنار ہو چکی ہے۔ قتل کی واردات کے دونوں افسانے سیاہ حاشیہ اور آخری تدبیر خود حفاظتی کی لاشعوری کوشش، دبی ہوئی نفرت اور احساسِ جرم کی جانب اشارہ دیتے ہیں۔ جب ہمارے شعور کا گناہ لاشعور کی پنہائیوں میں نادیدہ آنکھ اور نادیدہ رنگ بن کر خوف اور دہشت کی علامت بنتا ہے تو اظہار کے لیے طرح طرح کے جواز تراشے جاتے ہیں۔

چھوٹی اینٹ

غریب عورت برکتے کے ستواہاں بیٹے کے گرد گھومتا افسانہ ہے جسے اس کے چھوٹے قد اور عجیب و غریب ہیئت کذائی کے باعث اس کا مالک خلیفہ چھوٹا کہہ کر پکارتا ہے۔ چھوٹا چوں کہ خاندانی اعتبار سے بھی چھوٹا ہے اور قد کاٹھ میں بھی اس لیے اپنی ذات کے اعتراف میں کوئی بڑائی نہیں رکھتا، ایک دن فالودہ کھانے والی لڑکیوں کے ہنسی مذاق پر وہ بھی شرکت کا گنہگار ہوتا ہے۔ انھی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی صورتِ حال کے باعث رونے لگتی ہے لیکن جوں ہی خلیفہ ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے چھوٹے کو مرغا بننے کی تلقین کرتا ہے، لڑکی چپ کر جاتی ہے۔ یہ لمحہ چھوٹے کی زندگی کا سب سے بڑا لمحہ ہے:

''چھوٹے کو یوں لگا کہ جیسے اس کے دل پر چھایا ہوا غبار اچانک چھٹ گیا ہو، اس نے اطمینان بھری سانس لی اور مرغا بن گیا۔''

کافر

ایک کمہار کو مٹی کی عورتیں بنانے کا بہت شوق ہے۔ شادی کے بعد وہ اپنے خیالی بیٹے کی ایک مورت بناتا ہے اور بیوی کو دکھاتا ہے۔ بیوی کو یہ بدصورت ہیئت پسند نہیں آتی، وہ اسے توڑ دیتی ہے۔ کچھ دیر بعد ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے وہ اس کا نام محمود رکھتا ہے، یہی نام وہ پہلے مٹی کے پتلے کے لیے تجویز کر چکا۔ خدا کا کرنا محمود کچھ دیر زندہ رہ کر خدا کو پیارا ہو جاتا ہے، جو مولوی اس کے کان میں اذان دیتا ہے وہی اس کا جنازہ پڑھاتا ہے۔ دوسرا بچہ نہ ہونے کی صورت میں کمہار پھر مٹی سے ایک پتلا بناتا ہے اور مولوی کو دکھا کر کہتا ہے کہ یہ اس کا محمود ہے، اسے اس نے بنایا ہے، مولوی اس پر کفر کا فتویٰ داغ دیتا ہے۔ کمہار امداد دیوانہ ہو کر مولوی کو گلے سے پکڑ لیتا ہے۔ اسی دھینگا مشتی میں امداد موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ امداد کا باپ محمود کے بعد امداد کی لاش اٹھا رہا ہے۔

خواہش کی معصوم اسیری مذہبی جہالت سے ٹکرا کر گناہ عظیم بن سکتی ہے۔ ایسا صرف متشدد معاشروں میں ہوتا ہے، جہاں نادیدہ کے لیے زندہ مخلوق کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ مولوی کا علامتی کردار بھی سلیم اختر کے پسندیدہ کرداروں میں سے ہے، جو معاشرے کا توازن برقرار رکھنے کے بجائے اس میں عدم توازن پیدا کرنے کا باعث ہے۔

لب پہ آتی ہے

اقبال کی نظم کا مشہور مصرعہ افسانے کا عنوان ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

ہجوم عیدالاضحیٰ کے مقدس موقع پر بعد از نماز دعا اور اعتراف دعا کی تسکین سے گزر رہا ہے ہر نیک خواہش دعا کا حصہ ہے۔ قربانی کی توفیق، حج کی توفیق، شفایابی کی توفیق، بیواؤں یتیموں کی دستگیری کی توفیق، دنیا اور پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کی توفیق، علاقے کے سربرآوردہ اصحاب کی آل اولاد کی خوشحالی اور بزرگوں کی مغفرت کی توفیق، بے دین لوگوں کے شر سے محفوظ رہنے کی توفیق، گناہوں سے بچنے کی توفیق، آخری کچھ دعاؤں پر مجمع اور مومنین خاموش ہیں۔

اے خدا سچا مسلمان بنا دے۔ اے خدا ہمیں مرد مومن بنا دے۔ اے خدا صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ اے خدا حقیقی مسلمان بنا دے۔۔۔ سب نمازی خاموش ہیں۔ جب کوئی سچا مومن ہی موجود نہیں تو دعا مستجاب ہونے کے امکانات بھی معدوم ہیں البتہ ہونٹ اپنی تمناؤں کے اظہار سے بجے ہیں۔ مصنف افسانے کا بیانیہ اور مکالماتی انداز اس سے پہلے ''خیابانِ پاک جہان'' میں بھی استعمال کر چکا ہے۔

بچھو سے ملاقات

قدیم داستانوی منظرنامے میں اپنی منزل کھوجتا اور ایک پُراسرار مینار کی خواہش میں آگے بڑھتا مسافر، جو سفر کے دوران میں سیاہ بچھو دیکھتا ہے اور یہ سوچ کر بچھو کو کچھ نہیں کہتا کہ:

> ''میں انسانوں کی بستی سے نکل آیا ہوں، جہاں بلاوجہ دوسرے کو ضرر پہنچایا جاتا ہے۔ یہ صحرا کی وسعت اپنے ہی قوانین کی حامل ہے، یہ بچھو مجھے کچھ نہیں کہہ رہا تو مجھے اس کا سفر کھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں''

بچھو کے پیچھے کئی اور بچھو ہیں جو رات کا استقبال کرنے نکلے ہیں۔ مسافر صحرا میں سیاہ مینار تک جا پہنچا ہے، گویا ریت مجسم ہوگئی ہے وہ زینہ بہ زینہ اوپر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ مینار پر پہنچتا ہے تو ایک نظر نیچے دیکھتا ہے ریت کا سمندر اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے، سر پر گدھ منڈلا رہے ہیں اور نیچے بچھوؤں کی قطار اس کی منتظر ہے، اجل رسیدگی کا عمل پورا ہو چکا، انسان انسانوں کے درمیان اور دوسری مخلوقات کے درمیان غیر محفوظ ہی ہے اور فرار کے راستے مسدود ہیں۔

کاجل بن

کاجل بن، سیاہی کا استعارہ ہے۔ کالے آسمان کے نیچے اس کالے جنگل کی ہر چیز سیاہ ہے۔ کسی انسان کی مجال نہیں کہ یہاں قدم رکھے، یہ کوؤں کا دیس ہے جو تمام وقت بولتے رہتے ہیں اور اپنی آواز پر فدا ہیں۔ ان کی دانست میں کاجل بن دنیا کا حسین ترین بن ہے، ان کے سیاہ گھونسلے اور سیاہ پھل منفرد ہیں، ہر کوا اپنے آپ کو حسین ترین اور ذہین ترین سمجھتا ہے ان میں سے جو پہنچے ہوئے کوے ہیں انہوں نے اپنی آواز کو عافیت کے انداز اور وظیفہ، حیات کو شعور و فکر میں تبدیل کرلیا ہے۔ کاجل بن کے باقی باسی یہاں سے ہجرت کر چکے ہیں۔ نہ درخت، نہ پھول، نہ ہوا، نہ دھنک، نہ جانور، نہ پانی۔ صرف مار سیاہ، شوکتی ناگنیں، کالے بچھو، سیاہ لمبے کن کھجورے اور کوئے کے بچے ہیں۔ اچانک ہی کاجل بن کے قلب میں رنگوں کی تنویر دکھائی دی ہے، سب اس رنگین معجزے کو دیکھ رہے ہیں۔ کوے بھی محو حیرت ہیں، پیکر رنگ و بو کی آواز دھیمی اور لہجہ میٹھا ہے وہ خوش منظر جنگل کے بارے میں بتا رہا ہے۔ کالے کوؤں کو سفید، سرخ، سبز، نیلے رنگوں کی کہانی سنا رہا ہے۔ جیسے جیسے ان کا تجسس کم ہوتا جاتا ہے کوے اس کی خوشبو کی آبشار اور دھنک کے آنچل کی لغویات سے منہ موڑتے ہوئے حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اس کی موت بھی ان کا غصہ کم نہیں کر سکی۔ ایک سیاہ کوا چھوٹے جنگل کی طرف جانے کا مشورہ دیتا ہے، جہاں جگنو بکھرے پڑے ہیں۔ کوؤں کا قافلہ اڑتا ہے اور کھلی چونچوں سے اس روشن اور مہکتے جنگل پر حملہ آور ہوتا ہے لیکن تمام کوے روشن بن کو تاریک بن میں تبدیل کر کے جب واپس لوٹتے ہیں تو تاریک بن میں روشنی لیے ہر کوا جگنو کی مانند چمکنے لگتا ہے۔ کاجل بن جگنو بن میں تبدیل ہوتا ہے۔

فکر، لفظ، آرزو اور نیک نہادی کے اوصاف روشنی بن کر قلب و جاں منور کر سکتے ہیں اور یہی ان کوؤں کے ساتھ ہوا ہے، رزقِ حلال کی روشنی، قلب سیاہ کو جگمگا گئی ہے۔

شجرِ سنگ بار

شاداب پربت کی گود میں آباد نیلی جھیل کے کنارے ایک بستی صاف ستھرے لوگوں سے مزین ہے، جو بزرگوں کا احترام کرتے اور بچوں سے محبت کرتے ہیں۔ قانون جہاں سکہ رائج الوقت ہے کوئی قانون کی حد سے نہیں گزرتا۔ شرم و حیا عورتوں کا گہنا ہے، چناں چہ یہاں کی عورتیں خدمت و پاکیزگی میں یکتا ہیں۔ بستی کے مرکز میں ایک عظیم اور قدیم شجر ہے جس کا کسی بزرگ کی طرح احترام کیا جاتا ہے۔ ان ہونی ہو کر رہتی ہے اور ایک کنواری ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس زنِ ناپاک سے نجات کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ شجرِ عظیم کے سائے میں سنگ زنی کی رسم شروع ہونے والی ہے، عورت نہ

شرمندہ ہے نہ معافی کی طلب گار۔ ہجوم میں اسے بے لباس کیا گیا ہے، جیسے ہی کوئی پہلا پتھر اٹھاتا ہے آواز آتی ہے ٹھہرو، کوئی آ رہا ہے۔ ہجوم کہتا ہے مارو اسے بھی مارو، پتھروں کی بارش سے پہلے وہ عورت کو اپنے جسم سے ڈھانپ لیتا ہے لوگ خشونت زدہ جانوروں میں تبدیل ہو چکے ہیں دونوں کی باہم پیوست لاشیں ناقابل شناخت ہیں، لاشیں درخت کے نیچے ہی چھوڑ دی جاتی ہیں۔ اگلی صبح بستی والے دیکھتے ہیں کہ شجرِ عظیم جس سے ان کے کئی طرح کے رشتے تھے، پتھر میں تبدیل ہو گیا ہے۔ تنا، شاخیں، پتے سب پتھر کے ہیں، ہوا چلتی ہے تو درخت سے پتھر برسنے لگتے ہیں۔ یہی موضوع اس سے پہلے بے چراغ بستی کا چراغ میں بیان کیا گیا ہے۔

پریاں قطار اندر قطار

ایک نفسیاتی مرد کے احساسِ ملکیت کا افسانہ ہے جو خوبصورت پریوں کو پہلے رام کرتا ہے اور پھر اپنے گھر میں سجائی ہوئی منہ بند بوتلوں میں محفوظ کرتا چلا جاتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام اور احساس فتح مندی کی کج روی کے دیگر نمونے شاہی حرم، کنیزوں کی پلٹن، کثرتِ ازدواج اور نت نئی دوستیاں بدلنے والی اضطراری کیفیتوں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں بقول مصنف کے:

''سچی محبت ہو تو بوتل چھوٹی رہتی ہے اور نہ عورت بڑی۔''

اور پھر بوتل اور عورت ایک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لفظوں کی قید اور وعدوں کی زنجیر میں اسیر عورت شیش محل کی پری ہو، سبز آنکھوں والی پری ننھی پری ہو یا سانولی پری، غلامی کے طوق کا ہی انتخاب کرتی ہے۔ افسانہ دلچسپ ہے اور مردانہ عیاری کے پیش نظر اقبال کی نظم مکھی اور مکڑا کی سی دلچسپ صورتِ حال سامنے لاتا ہے:

''وہ خوش ہو کر سوچتا ہے اب ایک اور الماری کی ضرورت ہوگی۔''

چالیس منٹ کی عورت

افسانے کا ہیرو ہندوستان کے سفر سے واپس لوٹ رہا ہے کہ اسے ایک خاتون شریک سفر ملتی ہے، جس سے وہ بہت متاثر ہوتا ہے۔ باتوں ہی باتوں میں پتہ چلتا ہے کہ وہ ادھیڑ عمر عورت بڑی سلیقہ دار، خوش اخلاق اور خوش گفتار خاتون ہے، جس کا شوہر آکسفورڈ کا طالب علم تھا اور بہت خوش شکل تھا۔ اس کے مقابلے میں یہ عمومی شکل وصورت کی عورت تھی۔ گرمی اور حرکت سے بھرپور شوہر مر گیا تو اس نے دوسری شادی پر توجہ نہ دی۔

پچیس منٹ کی فلائٹ مکمل ہو چکی تھی، دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور اپنی اپنی راہ

ہو لیے۔ کچھ عرصے بعد ہیرو اور اس کی بیوی کی ملاقات ایک پرانے دوست اور اس کے خاندان سے ہوئی، جس میں یہ ہم سفر خاتون بھی شامل تھیں۔ خاموش، صورت دیوار، پہچان سے عاری، دوست سے استفسار پر کھلا کہ یہ دوست کی آپا ہیں جنھیں وہ گونگی آپا کہہ کر پکارتے ہیں۔ ساری عمر شادی نہ ہو سکی، زندگی افسردگی سے گزار دی، کئی کئی دن خاموش رہتی ہیں۔ دہلی میں ہوتی ہیں اس انکشاف پر مصنف حیران ہوا ملاقات کے اختتام تک اجنبیت برقرار رہی اور حیرت بھی۔۔ شاید وہ سفر کے دوران میں ہی شناسائی کے لمحات سے گزرتی تھیں اور اصل زندگی میں انہیں یونہی گم سم رہنا تھا۔ افسانے کا عنوان چونکا تا ہے لیکن افسانے میں حیرت کا عنصر مفقود ہے۔

ہری ہری گھاس

ایک کوچوان اور اس کی گھوڑی کے رومان کا قصہ ہے، جسے وہ سوہنی کہتا ہے اور اس کے بڑے ناز نخرے اٹھاتا ہے۔ سوہنی اس کی زندگی کا محور بن چکی تھی اور شہر کی لمبی سڑکیں، وہ تنہا تھا، نہ ماں باپ نہ بہن بھائی، بس کچا پکا گھر، تانگا اداس کی سوہنی، وہ اسی زندگی سے مطمئن تھا اچانک گامے کی زندگی میں ہلچل مچنے لگی، بچوں کی مس تھی۔ بچے تانگے سے اتر رہے تھے اور وہ دونوں تانگے میں خاموش بیٹھے تھے۔ راستہ کیچڑ سے بھرا تھا اور وہ اسے گھر کا راستہ سمجھا رہی تھی۔ اگلی ہلچل اسی مس کے تصورات کے تعاقب میں آئی تھی سرخ رنگ کے گریبان سے بہت نیچے تک سلے سوئے سوٹ میں ملبوس، چادر غائب، دوپٹہ غائب ہمراہ ایک خبیث بڑھیا، وہ اتنا محو ہوا کہ سوہنی کے سامنے سے گھاس اٹھانی بھول گیا۔ تانگہ روک کر وہ انارکلی چلی گئی۔ واپسی پر اس کے ہمراہ ایک آدمی بھی تھا، آدمی کے پیکٹ سے مچھلی اور کبابوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ واپسی پر اس نے حسب معمول تانگہ کھولا، سوہنی کو باندھا، پانی گھاس رکھی اور چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ خالی خالی نظروں سے گزری ہوئی ہلچل کے بارے میں سوچتے ہوئے اٹھا اور اپنا غصہ سوہنی پر اتارنے لگا۔

> ''اچھا تجھے دانہ چاہیے، ہری ہری گھاس چاہیے، حرام زادی، ذلیل، کتیا، بے شرم، بے حیا''۔۔۔ گامے کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور وہ سوہنی کی پیٹھ پر چابک توڑے جا رہا تھا۔

ہتک اور ذلت کے احساسات سے لبریز یہ افسانہ انسانی بے چارگی کی منہ بولتی تصویر ہے۔

توتا کہانی

اس کی علامتیں رجب علی بیگ سرور کی داستان سے مستعار لی گئی ہیں۔ بیگم جمال ایک خوبصورت اور خوش لباس عورت ہیں، جو ہمہ وقت آئینے سے محوِ کلام رہتی ہیں اور اپنے حسن کی داد چاہتی ہیں۔ آئینہ انھیں مردانہ نگاہ سے دیکھتا اور سراہتا رہتا ہے۔ جمال صاحب کسی دوسرے ملک میں کاروبار کرتے ہیں۔ کاروبار کیا ہے، سونے کی کان ہے، سال دو سال بعد تحائف سے لدے پھندے آتے ہیں۔ البتہ چیکوں کی ترسیل باقاعدہ ہے۔ مسز جمال کا کوئی بچہ نہیں، اس لیے سوشل ورک میں محو ہیں۔ ایک دن وہ فٹ پاتھ پر جارہی ہیں کہ طوطا فال کی طرف راغب ہوتی ہیں۔ طوطا معنی خیز انداز میں آنکھیں نچا کر کے کہتا ہے تمہاری قسمت کا حال ان لفافوں میں نہیں۔ آخر وہ طوطے کی فرمائش پر اسے خرید کر گھر لے آتی ہیں۔ طوطا گویا مرد کی عدم موجودگی کا نعم البدل ثابت ہوتا ہے اور لچھے دار باتوں سے ان کا دل گرماتا رہتا ہے۔ اس تبدیلی پر آئینہ طوطے کا رقیب بن جاتا ہے۔ ایک دن انھیں شرارت سوجھتی ہے اور وہ طوطے کو آئینے کے مقابل کر دیتی ہیں۔ طوطا آئینے میں سراپا دیکھ رہا ہے یا آئینہ طوطے کی چشم کے دریچے سے خود کو جھانک رہا ہے۔ دونوں خاموش ہیں، طوطے نے ان کے شوہر کی خاموشی کی کمی پوری کر دی تھی۔ وہ باہر جانے سے پہلے اس سے پوچھتیں، یہ قمیص کیسی رہے گی، گلے کی وی لمبی تو نہیں۔ ایک دن طوطے نے آہ بھر کر کہا ''نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل؟ بیگم جمال اس عاشقانہ رویے پر مزید تفاخر میں مبتلا ہوئیں اور پھر ایک شام طوطے نے انھیں جمال صاحب کی عدم موجودگی کا وہ احساس دلایا کہ وہ اس کا نعم البدل تلاش کرنے پر مجبور ہوئیں۔ طوطے نے دلدار مرزا کی طرف توجہ دلائی جوان کے ہمسائے میں رہتا تھا اور اچھی شہرت کا مالک تھا۔ طوطے نے مزید ہلاشیری دی۔ انھوں نے اس کی شہرت سے کیا لینا ہے صرف باتیں ہی تو کرنی ہیں جمال کی باتیں۔ بیگم جمال نے ایک نظر سراپے پر ڈالی، آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔ افسانہ اپنی کرافٹ کے اعتبار سے بھرپور تاثر کا حامل ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ نیوراسس اور نرگسیت کے مخفی جذبات سے لبریز نسوانیت کا عیارانہ قدم شناسائی۔۔۔ طوطے اور آئینے کی سازش یا ترغیب ہے یا خود بیگم جمال کی رضا اس فیصلے کو پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

میاں بیوی اور جیمز بانڈ

ایک کنوارے مرد کی رقابت اور دوست پر عائد کردہ احساسِ ملکیت کا افسانہ ہے، جس میں وہ جاسوس کا کردار ادا کرتے ہوئے ناکام رہتا ہے۔ افسانہ ایک طنزِ لطیف ہے ان لوگوں کے لیے جو میاں بیوی کے

مضبوط رشتے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے اور اس میں دراڑ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید وہ دوستوں کی بیوی میں اپنی محبوبائیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

علامتی مرد

کہانی ایک ایسے مرد کے گرد گھومتی ہے جو اپنے آپ کو اپنی ہیئت کذائی کے باعث مکمل آدمی نہیں سمجھتا اور سوچتا ہے عام لوگوں کی نگاہ میں وہ خوش بخت ہوگا کہ ایک بڑی فرم میں ملازم ہے، معقول تنخواہ، اپنا گھر اپنی گاڑی لیکن دفتر کی لڑکیاں بھی اسے بھائی جان سے آگے کا درجہ دینے کو تیار نہیں۔ ایک دن بارش کے موسم میں اس کی گاڑی کیچڑ میں پھنس جاتی ہے اور وہ بھی اس دلدل میں فنا ہونے والا ہی ہے کہ اچانک ایک مضبوط ہاتھ اسے اس کیچڑ سے باہر کھینچ لیتا ہے۔ یہ ایک بھٹیاری ہے جو غیر آباد راستے پر تنور سلگاتی ہے۔ وہ اس کے ہاں شب بسری کرتا ہے اور اس کی ہلکی سی توجہ، زندگی پر اس کی گرفت مضبوط کر دیتی ہے۔ یہ پہلی عورت ہے، جو اسے ہمدردی سے کھانا کھلاتی اور اس کی باتیں سنتی ہے۔ آخری لمحے خوشی سے اس کی آنکھیں چھلک پڑتی ہیں اور ناز دادا کا اگلا باب شروع ہوتا ہے۔

بن آتما

راجہ کی عادت ہے کہ وہ اپنی پرجا کا بہت دھیان رکھتا ہے لیکن کچھ عرصے سے وہ کسی کمی کا شکار ہے۔ ایک دن وہ شاہی لباس اتار، پرجا کے لباس میں گھوڑے پر سوار، جنگل کی راہ لیتا ہے۔ جنگل بالکل خاموش ہے، مہامنتری، جو راجہ کے ساتھ ہے، احتیاط تلوار نکال لیتا ہے تا کہ راجہ کی رکھشا کر سکے۔ راجہ محسوس کرتا ہے کوئی شے اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ ایک سندر نار نمودار ہوتی ہے، کنول بھرا تالاب، راجہ اس جل پری کی محبت میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے تن کی جوالا میں اشنان سے نئی شکتی پاتا ہے۔ جل پری واپسی کے سفر میں راجہ کے ساتھ ہے۔ مہامنتری پوچھتا ہے اس پری کو آئے کتنے چاند گزر گئے راجہ کو گنتی یاد نہیں۔ مہامنتری کہتا ہے یہ عورت نہیں ناری کے روپ میں کچھ اور ہے یہ بن آتما ہے۔ جس کے تعاقب میں کئی روحیں ہیں یہ جیالے مردوں اور نوزائیدہ بچوں کی قاتل ہے، مہامنتری اس عورت کے قتل کا مشورہ دیتا ہے لیکن مہامنتری اور مہا پجاری اس وقت چونک اٹھتے ہیں جب راجہ کی کڑک دار آواز عورت کی آواز میں تبدیل ہوتی ہے۔ بن آتما اپنا کام کر چکی اور اب وہی راج سنگھاسن پر ہے۔

آخری شعبدہ

یہ کہانی آخری تماشا ہی کی دوسری شکل ہے۔ شعبدہ باز کے فن کی بنیاد تنوع ہے۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔ اس کے آخری شعبدے کی تشہیر ہوئی ہے، شہر کا شہر اس کارگزاری کا منتظر ہے، اپنی گزشتہ کارکردگی بیان کرتے ہوئے وہ تالیوں کی گونج میں پستول نکالتا ہے اور حاضرین کو بتاتا ہے یہ اصلی پستول ہے وہ اس میں اصلی گولیاں بھر رہا ہے۔ سامعین اگر چاہیں تو آ کر اطمینان کرلیں، دو تین مرد جاتے ہیں اور گولیوں کے اصلی ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ کنپٹی پر پستول رکھتے ہوئے مخاطب ہوتا ہے:

''اچھا تو معزز سرپرستو! خدا حافظ، معزز خواتین و حضرات! آخری سلام۔۔۔

یہ ہے میرا بہترین، مکمل ترین اور آخری شعبدہ!

شعبدہ باز تالیوں کے شور میں پستول کی لبلبی بجاتا ہے۔۔۔

ہندوستانی فلم ''میرا نام جوکر'' سپرہٹ ثابت ہوئی اس نے لوگوں کے اذہان پر دیرپا اثرات چھوڑے، آخری شعبدہ بھی موت کی رومانویت کا ایسا ہی افسانہ ہے۔

روشن دن کا تاریک رات میں سفر

یہ بیک وقت الیکٹرا اور ایڈی فس کامپلکس کا افسانہ ہے، جس کے مختلف شیڈیز ہیں۔ ماں، بیٹا اور بیوی، شوہر، بیوی اور بیٹا، ماں اور پھر ازاں بعد بیٹے کی موت جنسی سرد مہری میں اضافہ کرتی ہے اور کہانی کا ہیرو نائٹ میئرز کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے ہمیشہ ایک ایسی زندگی ملی ہے جو عدم تحفظ کے تاثرات سے بوجھل ہے۔ اسے خوابوں میں کتے نظر آتے ہیں۔ جو اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کبھی وہ اپنی میت اور جنازے کے خفیہ مناظر دیکھتا ہے۔ یہ تاریک رات اس کی زندگی سے کبھی باہر نہیں نکلتی۔ وہ رقابت کی آگ میں بھی جلتا ہے لیکن آخری حربے کے طور پر شرم اور ذلت کا احساس بچتا ہے:

''اب ایک ہی چھت کے تلے میاں بیوی نہیں بل کہ دو چار پائیوں پر دو اجنبی

جسم ہیں۔''

موجودگی اور وجود کی معنویت معدوم ہو چکی۔ افسانے کے بہت سے فقرے اور واقعات مصنف کی آپ بیتی میں بھی موجود ہیں۔ ادھورا سچ کیا ہے افسانے کی دنیا میں اس کی تلاش بے سود ہوگی:

''گو وہ پڑھائی میں بہت اچھا تھا مگر اس کی اعصابیت اسے ٹک کر بیٹھنے نہ دیتی،

چناں چہ جاسوسی ناول پڑھتا رہتا یا پھر انگریزی فلمیں دیکھتا رہتا، جہاں طرح طرح کی بکتیاں اسے انگیٹھی پر دھری کیتلی کے پانی کی طرح کھولا کر رکھ دیتیں۔"

کاٹھ کا شہر

کاٹھ نگر، کاٹھ کی عورتیں، کٹھ پتلیاں مصنف کے پسندیدہ موضوعات ہیں یہ افسانہ بھی لکڑی کے بے جان شہر کے بارے میں ہے جسے آخر کار خواہش کا ایندھن بننا ہے۔ ایک دن بادشاہ کی جانب سے اراکینِ مملکت کو حاضری کا حکم ملتا ہے۔ بادشاہ ان کے وقوف کا امتحان لیتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ ایک ایسا شہر بنایا جائے جو سنگ وخشت سے پاک ہو۔ مقرب خاص کہتا ہے: "یعنی کاٹھ کا شہر"۔

لبِ مبارک کا فرمانا تھا کہ کام شروع ہوا؛ مملکت کے سب درخت کاٹے گئے، پرندے آشیانوں سے اڑے اور دوسری سبز بستیوں کی طرف روانہ ہوئے، ڈھور ڈنگر مرنے لگے، رعایا مستقل مزاج نکلی۔ صاحبِ حیثیت لوگوں نے سنگ وخشت کے موروثی مکانات ڈھا کر کاٹھ کے مکان بنا لیے۔ بادشاہ نے بھی اپنے خاص محل، دولت خانے اور دربارِ شاہی کے لیے صندل کی لکڑی پسند کی تا کہ ہر دم شامِ جاں معطر رہے۔ شہر مکمل ہوا تو دُور دُور سے خلق اس یگانہ شہر کو دیکھنے آئی۔ تب اختر شناسوں کی مقرر کردہ ساعتِ سعید میں سب اپنے اپنے مکانوں میں آباد ہو کر زندگی کرنے لگے۔

کسے خبر تھی یہ کاٹھ کا شہر دیمک کی بستی پر تعمیر ہوا ہے۔۔۔ انجام قریب ہے۔

بے حسی اور بے لچک زندگی کی بنیاد آخر کار ٹوٹ جانے اور بکھر جانے سے عبارت ہے اور دیمک کا کیا وہ تو اندر ہی اندر پورے معاشرے اور ریاست کو کھوکھلا کرنے کا ہنر جانتی ہے۔

کنول کنڈ

ایک دل بہار بستی میں زندگی لہلہاتی تھی۔ پیر و جواں محبت اور احترام کی ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آج تک کسی کنواری کی نہ نظر جھکی نہ چال لٹکی نہ جوانی بھٹکی۔ بستی والے کنول کنڈ کو دیکھتے، بار بار دیکھتے مگر سیراب نہ ہوتے، آخر انہونی ہو گئی۔ ایک دن ایک بچہ وہاں تھا جسے ہوا کی نرم انگلیاں سہلا رہی تھیں۔ کنول کے پھول کی مانند بے لباس وہ سنہری کنول ہی لگ رہا تھا۔ تب سب کا ماتھا ٹھنکا،

بستی میں کوئی پلید روح داخل ہوئی تھی۔ جب یہ طے پا گیا کہ یہ انسان ہی کا بچہ ہے تو کنول کا پھول بدی کا پھول قرار پایا؛ ایک ناجائز وجود، گناہ کا انگارہ، اک زنِ فاحشہ بستی میں داخل ہوئی۔ اس پھول کی حفاظت کے لیے، سوال کیا گیا کہ وہ اسے کیوں بچانا چاہتی ہے۔ اس نے کہا اس لیے کہ یہ انسان کا بچہ ہے، لوگ بولے یہ ناجائز وجود ہے۔ بستی ناپاک کر دے گا، ہم پر قہر آئے گا۔ مصیبتوں کی فصل کاٹنی پڑے گی وہ ہنسی اور کہا تم جانتے ہو، یہ میرا انھیں اور میں بستی سے باہر رہتی ہوں۔ تم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہو میرے ساتھ نہیں۔ تمھیں میرا احسان مند ہونا چاہیے میں تمھارا کام کر رہی ہوں۔ لوگ بولے چھنال، حرافہ، پچھل پائی، کٹنی، وہ گالیوں کی بوچھاڑ میں بے نیازی سے بڑھتی رہی اور بچے کو اپنی طرف کھینچتی رہی اور اسے محبت سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ جب وہ اٹھی تو محسوس ہوا، وہ فاتح ہے تمکنت اور وقار والی نظروں کے ساتھ مردوں کے پتھر والے ہاتھ بھی جھک گئے۔

اسی موضوع پر ایک افسانہ بے چراغ بستی کا چراغ اور دوسرا شجرِ سنگ بار ہماری نظر سے گزر چکے۔

احمق کٹھ پتلی

کٹھ پتلیاں بنانے والے کی تلاش ختم ہو گئی تھی اسے وہ درخت مل گیا تھا جو اس کی منزل تھی۔ اس نے لکڑی کے سڈول ٹکڑے کاٹے اور کٹھ پتلی بنانے لگا۔ آخر کار وہ مطلوبہ کٹھ پتلی بنانے میں کامیاب ہوا جو اس کے ذہن کی تصویر سے مشابہ تھی۔ وہ اس سے گویا ہوا، تم ہر لحاظ سے مکمل ہو۔ کٹھ پتلی نے پوچھا مگر میں کون ہوں، جواب ملا کٹھ پتلی۔ اب جب میں بن گئی ہوں تو میرا کیا بنے گا، وہ بولا تمھاری ڈور میرے ہاتھ میں ہوگی۔ تمھیں نچاؤں گا روٹی کماؤں گا۔ وہ بولی میں ناچنا نہیں چاہتی البتہ اپنی خوشی سے ناچنا اور بات ہے۔ وہ بولا میں تمھیں اپنی بیوی بناتا ہوں، وہ بولی، وہ کیا ہوتی ہے اور بیوی بن کر کیا کرنا ہوگا۔ وہ بولا خاوند بس بیویوں سے پیار کرتے ہیں۔ تم بچے پیدا کرنا اور پھر ان کی پرورش۔ وہ بولی میں بیوی نہیں بنتی یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ خالق کو غصہ آ گیا، کہنے لگا احمق کٹھ پتلی تو شاید نہیں جانتی، بیوی بنا کر میں تجھے کتنی عزت دے رہا ہوں۔ کٹھ پتلی نے کہنا چاہا مجھے اپنی زندگی اور آزادی کی قیمت پر عزت کا یہ سودا منظور نہیں، لیکن کاٹھ کا منہ نہ کھل سکا اور کاٹھ کی آنکھ میں آنسو کہاں تھے۔

مصنف عورتوں کے سماجی رتبے کے بارے میں افسردہ ہے۔ وہ عورت کو تابع فرماں اور فرماں بردار مخلوق دیکھتا ہے اور اس کی مظلومیت اور مردانہ جارحیت پر شکوہ کناں ہے۔

مردہ دھار والی مقراض

ہجوم کی آنکھوں میں حقارت تھی۔ بستی کے تمام مرد دائرہ در دائرہ کھڑے تھے لیکن اس کے باپ بھائی نہ تھے۔ ظاہر ہے وہ اس کی بے حیائی کی گواہی نہیں دے سکتے تھے۔ بستی کے معمر ترین شخص نے قدیم لکڑی کا صندوق کھولا، لڑکی کی آنکھوں میں خوف تھا، آخر قفل کھل گیا۔ رعشہ زدہ ہاتھوں میں ایک بڑی مقراض تھی بھیڑوں کی اون کاٹنے والی، رعشہ زدہ ہاتھوں نے مقراض سنبھالی اور اس کے بال کاٹنے شروع کیے۔ لڑکی مردوں کے نرغے میں تھی اور وہ اسے جنگل کی طرف دھکیل رہے تھے۔ جنگل گھنا، تاریک اور لیسدار درختوں سے اٹا تھا اور اس تمام منظر پر ایک اندھا الو پہرہ دیتا تھا۔

یہ پاکیزہ لوگوں کی بستی تھی۔ صندوق اور مقراض اجتماعی انصاف کا مظہر تھے۔ اس باکردار بستی میں بارش وقت پر ہوتی، سورج، ہوا، پانی سب اعتدال کے خوگر تھے۔ آج ناشدنی کی سزا کا دن تھا لڑکی کے بال کٹ چکے تھے وہ جنگل بدر ہو چکی تھی۔ سب اطمینان کا سانس لے رہے تھے، البتہ مردوں کے دائرے کے عقب سے شور بلند ہوا، مڑ کر دیکھا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، بستی کی تمام عورتیں سینہ تانے درانہ چلی آتی تھیں اور ان سب کے منڈے ہوئے سروں پر سورج اس طرح چمک رہا تھا کہ آج تک کسی اور شے پر یوں نہ چمکا۔

یہ عورتوں کی شعوری آگہی اور حقوق کی آزادی کی ایک جھلک تھی جو گناہِ آدم وحوا کے دوسرے فریق کی سزا متعین کرنے والی تھی۔ مردہ دھار والی مقراض آج تیز ہو گئی تھی۔ اپنے وجود کے احترام کے اعلان کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ یہ موضوع کنول کنڈ کی ویشیا کے عزم صمیم کو آگے بڑھاتا ہے۔

جس رات ستارے ٹوٹے

اماوس کے بعد چاند طلوع نہ ہوا تھا۔ بڑھے بوڑھے ابھی اسی ناشدنی سے گھبرائے ہوئے تھے کہ اچانک ایک رات ستارے ٹوٹنے کا عمل شروع ہو گیا۔ اس دہشت بھری رات کے اختتام پر سورج محبت بھری روشنی لایا۔ فضا میں سکون تھا اور سورج میں تمازت، لوگ رات کی حقیقت جاننے ستارہ شناس کے پاس پہنچے وہ خود پریشان تھا۔ لوگ ساحر کے پاس گئے، جس نے اپنے گرد دائرہ کھینچ رکھا تھا۔ وہ چلایا دائرے کے اندر مت آنا، اس نے تنبیہ کی، یقیناً ستاروں کا ٹوٹنا کسی بڑے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ جاؤ معافی مانگو۔ ہجوم بادشاہ کے محل کی طرف جانے لگا، محل کے دریچے بند تھے۔ بادشاہ، پڑوسی حاکم کے پاس جا چکا تھا۔

ایک بدبودار عجیب الخلقت بچے کی پیدائش ہوئی، جو پھولوں سے باتیں کرتا اور بلبلوں سے کہانیاں

سنتا۔ ایک دن اس نے ہوا میں مٹھی لہرائی اور پھر بند کر لی۔ وہ بے ضرر تھا لیکن جسم کی بدبو بڑھتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ یہ بو تعفن میں تبدیل ہوئی۔ تب وہ گیت گانے لگا۔ الفاظ جانے پہچانے، مفہوم انوکھا۔ یہ گیت نہیں کئی روحوں کے لیے آئینہ تھا لوگ داد دینے پر مجبور ہوئے۔ اس کے تعفن کے باعث طے پایا کہ اسے بستی کی حد سے نکال دیا جائے، بچ گیا تو مقدر۔ اس نے کسی مزاحمت کا مظاہرہ نہ کیا، بل کہ غار کے دہانے پر رک کر ایک ایسا گیت گایا، جس میں بستی والوں کے لیے عفو و درگزر کا پیغام تھا۔

غار کا دھانا بند کر دیا گیا۔ اسے چمگادڑوں، بچھوؤں، سانپوں نے کچھ نہ کہا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے بدن سے غیر مرئی لہریں اٹھ رہی ہیں، اس نے انگلی سے غار کی دیوار پر مستطیل کا نشان بنایا کھڑکی کھل گئی اور ہوا اندر آنے لگی وہ منظر نامے سے لطف اندوز ہونے لگا اور گیت گانے لگا۔ اس نے ایک بڑی کھڑکی بنائی اور سمندر سے مکالمہ کرنے لگا، گویا سمندر کو بلاوا دے رہا ہو۔

نہ چاند نکلا، نہ ستارے ٹوٹنے بند ہوئے، نہ آفت آئی، سب زندہ تھے یہی معجزہ تھا۔ وہ ایک عقل مند بزرگ کے پاس پہنچے۔ وہ بولا، تم نے ظلم کیا یہ اس کی سزا ہے۔ جاؤ جا کر اسے واپس لاؤ۔ اس نے تمہارا بُرا چاہا تھا، کسی سے دغا کی، جواب نفی میں تھا، البتہ تعفن کے ضمن میں سب متفق تھے۔ حکم ہوا تعفن کے ساتھ رہنا سیکھو۔ لوگ جنگل کو دوڑے، غار کا دھانہ کھولا، اس کی اندرونی دیواروں پر ستاروں جیسے دمکتے الفاظ میں گیت لکھے تھے اور لفظوں کی خوشبو اور چاندنی سے غار میں اجالا تھا۔

افسانہ نگار کے پیغام میں اثبات کا ایک پہلو ہے۔ وہ صبر، برداشت اور درگزر کا درس دیتے ہوئے دوسروں کی کمزوریوں سے صرف نظر کرنے کی تلقین کرتا ہے اور لفظ کو بہت بڑی طاقت گردانتا ہے۔

لکھا بادِ سموم نے

ریگستان کے دائرے میں ایک نقطہ موہوم کی طرح ایک مسافر موجود ہے۔ ہر سو ریت کا سمندر پھیلا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے خود کو تنہا پاتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ کیا وہ واقعی اپنا دشمن ہے۔ بھلا آدمی اپنا دشمن کیسے ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ خودکشی کرنے والے بھی اپنے دشمن نہیں ہوتے۔ جب وہ بستی سے نکلا تھا تو گالیاں، پتھر اور کتے اسے رخصت کرنے آئے تھے۔ اب اسے گہرا اطمینان ہے، باہر ہوتا تو دوستوں کی منافقت کو سانپوں کے مانند آستین میں پلتا دیکھتا، گھر پر بیوی کے خود غرضانہ جسم کی کاذب راحت کا عذاب سہتا ہے۔ اب وہ سب سے بچھڑ کر سکون میں ہے۔ وہ ریت کو مٹھی سے دوسری مٹھی میں منتقل کرنے لگا۔ افق پر دھند کا پردہ تن رہا تھا، اچانک اس پردے سے شبیہیں ابھرنے لگیں، وہ کچھ نہ سمجھ پایا۔ اگلے لمحے بستی کی تصویر ابھری۔ زندگی کے معمولات سے آباد یہ بستی اس کی بستی تھی اور شاید اس کے بغیر زیادہ خوش تھی۔ پھر

اچانک بستی میں تاریکی کا سورج طلوع ہوا، لوگ اس تاریکی کا مقابلہ کرنے کے لیے مصنوعی روشنیوں سے کام لینے لگے تھے جو پل بھر کو چمک کر بجھ جاتیں۔ بستی الٹی ہوگئی، ہر شے الٹی، گویا بوندیں ریت پر گر رہی ہوں۔ اس نے رکی ہوئی سانس چھوڑی۔ سب کچھ خاموش تھا اور ہاتھ کی ریت بھری پیالی سے دوسری پیالی میں ریت گر رہی تھی۔ ریت کا مقصود ہے خاتمہ!!!

مٹی کا قرض

ایک مرتی ہوئی بیوی اور اس کے زندہ شوہر کا مکالمہ ہے، جو دفن ہونے کے تصور کو مٹی کا قرض کہتے ہیں۔ انھیں خواہش نمو ہے اور دونوں ایک ساتھ ابدی زندگی کے آرزومند ہیں۔ وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ مرتے وقت طرح طرح کے پھولوں کے بیج، ان کے کفن میں رکھے جائیں تا کہ اسی زمین سے ایک گلستان نمودار ہو اور وہ دونوں ایک ہی شاخ کے دو پھول بن کر ساتھ ساتھ کھلیں اور اپنی مہکار بکھیریں۔

خواہش مرگ اور موت کی رومانویت کا یہ افسانہ سجاد حیدر یلدرم کے افسانچے ''جہاں پھول کھلتے ہیں'' کی خوشگوار فضاؤں جیسا ہے۔

نادیدہ

نادیدہ کا خوف آسیب کی طرح بستی پر مسلط ہے۔ ہر روز نیا حادثہ، نیا خوف۔ ہر شخص کا اپنے مشاہدے اور ذاتی عذاب کا ثمر بن کر ظاہر ہو رہا ہے۔ کسی کے خوف کا کوئی راز دار بننے کو تیار نہیں۔ ہر متنفس اپنے خوف کے قفس کا اسیر ہے۔ تین دوست خواب دیکھنے والا شاعر، نغموں کے پھول کھلانے والا مغنی اور رنگوں کا دلدادہ مصور اپنی تخلیقات کے طلسم کے اسیر ہیں۔ وہ تینوں خوف کی بستی میں سکون اور طمانیت سے اپنے وجود کا ہمراز بنانے میں مگن ہیں لیکن کبھی کبھی اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کو نادیدہ کے خوف کے جنگل میں بلبلاتے دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں: ''ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔'' ہمیں بستی کو اس نادیدہ کے خوف سے نجات دلانی چاہیے۔ وہ گوالے، باغبان اور مالن سے ملتے ہیں تا کہ نادیدہ کی واضح نشاندہی ہو سکے۔ آخر تینوں نے ایک ایک راستہ انتخاب کیا اور تین سمتوں کو روانہ ہوئے۔ چوتھی سمت سمندر ہے آخر کار انھوں نے الفاظ، گیتوں اور رنگوں سے نادیدہ کا سراغ لگا لیا اور تینوں ایک جلے ہوئے پہاڑ پر آن کر ملے کہ یہی منزل تھی۔ سامنے غار کا دہانہ تھا، نادیدہ کو یقیناً اسی غار میں ہونا چاہیے تھا اور آگے بڑھے، آگے، اور آگے، وہ حیران تھے اندر تو کچھ نہ تھا نہ دیو، نہ آدم، نہ پچھل پائیاں، نہ عفریت، نہ اژدھا، نہ اگیا بتیال۔۔ بجز اس جالے کے جس کے دل میں مردہ مکڑی جھول رہی تھی۔

ہر شخص کے اندر چھپا ہوا اپنا اپنا ڈر آخر کس طرح تلاش کیا جا سکتا ہے۔ افسانے کی مجموعی فضا مصنف کے پسندیدہ جنگل اور اس کی سرسراہٹوں اور شبہیوں میں پروان چڑھتی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے یہ صرف فن کار ہیں جو اپنے اپنے خوف پہ غالب آتے ہیں اور لوگوں کو خوف کے دائرے سے نکالنے کی تعبیر کر سکتے ہیں۔

سب کہاں

خوف اور جبر کی فضا کا اسیر ایک قلمکار اپنے کمرے میں بند ہے اور تنہائی میں مکڑے، پتنگے اور چھپکلی کو دیکھتے ہوئے اپنے ہونے کا جواز اور اپنی مماثلتیں تلاش کر رہا ہے اسے لگتا ہے وہ محض ایک پتنگا ہے جسے پلک جھپکتے چھپکلی چٹ کر سکتی ہے۔ رات کی خاموشی، افکار کی زیادتی۔ اندیشے اور وا ہمے۔ اس کا بدن خوف سے اکڑا ہے اور ایک بڑی عمارت کے ایک کمرے میں اسی خوف کا عذاب سہہ رہا ہے۔ اچانک ایک ٹرک عین عمارت کے نیچے رکتا ہے اور فضا بوٹوں کی آواز سے لرزنے لگتی ہے وہ بھی اندر ہی اندر لرز رہا ہے مبادا اس کی گرفتاری یقینی ہو لیکن بوٹ کسی ہمسایہ کے کمرے کے باہر رکے ہیں اور مطلوبہ شخص کو گرفتار کرنے یا مارنے میں کامیاب ہیں۔ خطرہ ٹل چکا ہے اور لکھاری اپنے خوف کی دلدل میں تنہا ہے۔

مارشل لاء کے جبر و تشدد کا زمانہ ہے جب ادیبوں کی پکڑ دھکڑ عام رہی اور انھیں ریاست کا دشمن سمجھا گیا۔ حالاں کہ زیرِ بحث افسانے کا ہیرو محض ایک رومان نگار ہے، جس کی تحریریں جھوٹ میں بھی عافیت سمجھتی ہیں، اسے صرف گرفتاری کا خوف ہے۔ سچائی کی طلب نہیں۔

محاذ 1971ء

۱۹۷۱ء کی جنگ کی شہری فضا کا افسانہ ہے، جب لوگ سائرن اور ہوائی حملے کے خوف سے کپکپاتے رہتے ہیں اور اپنے بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہوائی حملہ ہوا ہے اور جہاز عین چھت پر غوطہ لگا رہا ہے، بولنے میں خوف مانع ہے، کہانی کا ہیرو اندازہ نہیں کر پا رہا کہ بولنے میں خوف مانع ہے تو یہ بیوی کا ہے یا شوہر ہونے کا خوف ہے یا بچوں کا باپ ہونے کا یا خوفِ مردانگی ہے۔ سارا وجود کان بنا ابھرنے والی آوازوں کو سن رہا ہے اور ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑتی رہتی ہے۔

خوفِ مرگ اور اپنے پیاروں سے بچھڑ جانے کا خوف، وہی نادیدہ خوف ہے، جس کا پہلے بھی ایک افسانے میں مصنف ذکر کر چکا۔ سب کہاں اور محاذ ۱۹۷۱ء ایک ہی کیفیت پر ختم ہونے والے

افسانے ہیں۔

"میں اپنے ہی بنائے ہوئے تالاب میں کھڑا تھا۔"

دو سیارے

ایک انگریز دوست کے ہاں ایک پاکستانی مرد اور ہندوستانی عورت کی ملاقات ہوتی ہے؛ دونوں ملکوں میں جنگ کا زمانہ چل رہا ہے۔ دونوں کے رفقا جنگ میں مارے جا چکے ہیں؛ دونوں ایک دوسرے سے دوستی کے خواہاں ہیں اور اسی فیصلے پر دونوں خوف اور محبت کے ملے جلے جذبات کے تحت داخلی اور خارجی ٹکراؤ کا شکار ہیں۔ انسانی جذبات جنگ سے بالاتر ہوتے ہیں یا جنگ جذبات سے بالاتر ہوتی ہے، اس کا فیصلہ مشکل ہے۔

گریز پا

وہ ایک خاندانی فقیر تھا، جس کی ماں بھی فقیرنی تھی۔ ماں ایک ٹرک کے نیچے آ کر مر گئی وہ بے گھر ہوا۔ مسجد میں جا سویا، مسجد والوں نے اسے جوتی چور کہہ کر بھگا دیا۔ اب وہ ایک زیر تعمیر کوٹھی میں گزر بسر کرنے لگا، یہیں بارش کے موسم میں ایک بڈھے اور ایک لڑکی سے اس کی ملاقات ہوئی جو فقیر تھے۔ اب تینوں مل کر رہنے لگے۔ اندھا بڈھا، چلبلی لڑکی اور وہ؛ تینوں کی مجموعی کمائی بھی کافی تھی۔ لڑکی کی زندگی میں ایک عاشق نمودار ہوا لیکن خاندانی فقیر کے ہاتھوں بہت پٹی۔ اس نے لڑکی کے دانت توڑ دیئے۔ اب وہ چوک کے ایک کونے میں چھوٹی سی ریڑھی میں ٹانگیں سکیڑ کر بیٹھی ہے۔ لوگ اس کی جوانی دیکھتے ہیں، اس کی زخمی ٹانگوں پہ بھنبھناتی مکھیاں اور رحم کھاتے اپنی جیبیں خالی کرتے ہیں۔ اب اس کے باپ کو اور کہانی کے ہیرو کو اس کی حفاظت کی ضرورت نہیں، دونوں جانتے ہیں وہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی اس گریز پائی میں احساس ملکیت، احساس جرم اور انسانی عیاری کے کئی رنگ چھپے ہوئے ہیں۔

سفر سے واپسی

کہانی شیخ صاحب اور ان کے ملازم فضلو کے گرد گھومتی ہے۔ شیخ صاحب کاروباری آدمی تھے اور ایک زمانہ انھیں جانتا تھا وہ اکثر فضلو سے کہتے "تو زمانے سے پیچھے رہ گیا ہے، اب زندگی وہ لوہاری کی گندی گلی نہیں جسے تو پیچھے چھوڑ آئی ہے۔" فضلو کہتا ہے: "آپ چھوڑ آئے ہیں، میں تو اب بھی سب سے ملنے

جاتا ہوں۔ یہاں گلبرگ میں کیا رکھا ہے لوہاری جیسی گندی گلیوں سے سب لوگ اٹھ کر یہاں چلے آئے ہیں اور بڑا بننے کی کوشش میں ہیں، مجھے تو لگتا ہے یہ سب بھوتنے ہیں جو محلوں اور قلعوں میں رہنے کو آ گئے ہیں۔'' چار کنال کی آٹھ بیڈروم کی کوٹھی میں شیخ صاحب اور فضلو ہی بچے ہیں شیخ صاحب کی اچانک موت فضلو کو دہلا دیتی ہے۔ وہ سب رشتے داروں اور جاننے والوں سے رابطہ کرتا ہے مگر کوئی شخص حتیٰ کہ شیخ صاحب کی بیٹی بھی آنے سے انکار کر دیتی ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ فضلو کوٹھی کا دروازہ بند کر کے سیدھا لوہاری پہنچتا ہے اور سب کو شیخ صاحب کی موت کی خبر دیتا ہے۔ سب شیخ صاحب کا جنازہ اٹھاتے ہیں اور واپس لوہاری پہنچ جاتے ہیں:

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

''جب واپس لوہاری پہنچے تو تمام گھروں کی بتیاں روشن تھیں اور فجر کی اذانوں سے فضا گونج رہی تھی۔''

پرانی تہذیب کی محبت اور نئی تہذیب کی مطلب براری اور معنوعیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانہ وحدت تاثر کے باعث قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

رزقِ حلال

ایک ایسے سکول ماسٹر کی کہانی ہے جو دینیات کے مضمون میں اپنی سخت گیری کی خاصی شہرت رکھتا ہے۔ کھچڑی داڑھی، گھٹا ہوا سر، ٹخنوں سے اونچی میلی شلوار قمیص، سر پہ رومی ٹوپی، ایک ہاتھ کے ناخن بڑھے ہوئے۔ جس بدقسمت طالب علم پر غصہ آتا، اس کی کان کی لو میں دونوں ناخن چبھو کر گوشت باہر نکال لیتے۔ ماسٹر کرم داد کھانے پینے کے شوقین تھے؛ مونگ پھلی، ریوڑیاں، چلغوزے اور دودھ جلیبیاں کھاتے، پیٹ پر ہاتھ پھیرتے، ڈکارتے اور حقہ پیتے رہتے، قسم قسم کی گندی گالیاں ان کا معمول تھیں۔
ادیب بہت دنوں بعد انھیں ملا تو کہنے لگے ''تم پروفیسر ہو گئے ہو اور سنا ہے گندی گندی باتیں اور گندے گندے افسانے لکھتے ہو، جنس پر کتابیں لکھتے ہو، کاش تم اسلامیات پڑھاتے اور میرا نام روشن کرتے''
دوسری بار ادیب انھیں داتا صاحب کے عرس میں دیکھتا ہے جہاں وہ پنج سورے، دعائے گنج العرش اور آیۃ الکرسی بیچ رہے ہیں اور اس رزقِ حلال سے گزر بسر کرتے ہیں۔
تیسری ملاقات میں بازار میں ایک دن کوئی مصنف سے کہتا ہے کہ مولانا کرم داد اسے یاد فرماتے ہیں۔ وہ ایک دکان پر لایا جاتا ہے، ماسٹر کرم داد عطر حنا میں ڈوبے ہوئے، سفید بے داغ لباس، روشن

چہرے، آنکھوں میں سرمے کی لکیر، سفید نورانی داڑھی اور مہندی رنگے بالوں سے اسے خوش آمدید کہتے ہیں۔ کتابوں کی دکان ہے، فارمیکا کی میز اور فارمیکا ہی کا کاؤنٹر، دیواروں پر مقاماتِ مقدسہ کی تصاویر اور آیات کے طغرے۔ مصنف سوال کرتا ہے کیا وہ یہاں ملازم ہیں، جواب ملتا ہے وہ اس دکان کے مالک ہیں۔ استغفار پر مولوی صاحب نے فرمایا، مجھے میرے سینما والے دوست نے فلمی گانوں اور فلمی رسالوں کے سٹال پر بیٹھنے کی دعوت دی تھی، میں نے سوچا اس سے میرا کردار کیا داغ دار ہوگا میں اس گندے ماحول میں بھی پاکیزہ رہ سکتا ہوں۔ میں نے اپنا کام کیا، نماز روزہ کبھی نہ چھوڑا اور اچھی کمائی کرلی، پھر میں نے اپنے ایک دوست سے گانوں کی کتابیں چھپوائیں رقم جمع ہوگئی تو چھاپہ خانہ لگالیا۔ تمھیں بلانے کا مقصد ہے تمھاری کتاب بل کہ کتابیں چھاپوں۔ مگر یہ ادبی کتابیں نہ ہوں گی، ادب بے کار ہے تم لکھو وہ کتابیں وہ سرگوشی میں بولے جو آنہ لائبریری میں خفیہ چلتی ہیں، کوڑیوں میں چھاپو ہیروں میں کماؤ۔

ماسٹر کرم داد کا کردار، افسانے کا موضوع اور اس کی کرافٹ بہت عمدہ ہیں۔ ماسٹر کرم داد سے ملتے جلتے کردار ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی میں کئی مقامات پر ظاہر ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ان کے بچپن اور لڑکپن کے واقعات میں۔ رزقِ حلال کی اصطلاح کی اس سے بہتر تفسیر ممکن نہیں۔ اس افسانے کو اُردو ادب کے بہترین افسانوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

ماں بیٹا

ایک جوان بیوہ اور اس کے بیٹے کی کہانی ہے، جو ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ بیٹا ہمیشہ ماں کو اچھے لباس اور بہترین حالت میں دیکھنے کا متمنی ہے گویا ماں اس کی محبوبہ ہے لیکن شادی کے بعد صورتِ حال یکسر بدل جاتی ہے۔ بیٹا ماں کی خوش لباسی کو طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ آخر ماں اسی کم تو جہی کی کیفیات میں دنیا سے اٹھ جاتی ہے اس کی قبر شہر کے نشیبی علاقے میں بنائی گئی ہے جسے بیٹا پختہ کرانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن ادھر ادھر کی مصروفیات میں اسے سب بھول جاتا ہے، بہت برس بعد جب وہ اس بات کو عملی جامہ پہنانے کا سوچتا ہے تو وہ دیکھتا ہے:

> ''کسی وزیر کے رشتے دار نے قبرستان پر دکانیں تعمیر کردی تھیں، جہاں سودا لینے والوں کی خوب بھیڑ تھی، ماں کی قبر کا نام ونشان باقی نہ تھا۔''

آئینہ

ایک خوبصورت لڑکی جو محبت اور راحت سے بھرپور زندگی بسر کررہی ہے، ایک حادثے میں اپنے چہرے کی خوبصورتی کھو بیٹھی ہے۔ وہ آئینہ دیکھتی ہے، لوگوں کے ناروا سلوک اور اپنے محبوب کی بیوفائی سے اُداس ہو کر آئینہ توڑ دیتی ہے۔ اسی اُداسی کے لمحات میں اس کا بدصورت ملازم، اس کے کمرے میں آتا ہے تو وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پوچھنے لگتی ہے۔ تمھیں پتہ ہے تم کتنے بدصورت ہو۔۔تم کتنے بدصورت ہو، ملازم خاموش ہے مگر وہ روئے جارہی ہے۔

گویا آئینے کے بعد اسے اس کے چہرے کی بدصورتی ملازم کے بدصورت چہرے میں دکھائی دے رہی ہے اور اب یہی اس کا آئینہ ہے۔

درد کا بندھن

ساس اور بہو کی رقابت اور قدرِ مشترک کا افسانہ ہے۔ دونوں خاور کی زندگی میں توجہ کی کھنچا تانی میں مصروف رہیں۔ اب اس کی موت پر ایک دوسرے کو منحوس گردان رہی ہیں اور افسانے کی آخری سطروں میں ایک دوسرے کی غم خوار دکھائی دیتی ہیں۔

> ''دونوں خالی صحن میں آمنے سامنے تھیں، خاور کی موت کے بعد پہلی مرتبہ ان کی آنکھیں چار ہو رہی تھیں۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں، وہ اسے کتنا چاہتا تھا، جمیلہ کے لیے ساس کا بڑھاپا خاور کا ماضی تھا جب کہ ماں کے لیے بہو کی جوانی بیٹے کی جوانی۔ دونوں ایک ہی غم کی تصویر بنی کھڑی تھیں۔ ایک دوسری کے وجود میں اپنا خاور تلاش کرتی اور پھر خاور نے گویا مقناطیس کا کام کیا۔۔۔
>
> دونوں ایک دوسری سے لپٹی رورہی تھیں۔

محاورے کے معنی

یہ ایک کرداری افسانہ ہے، بوڑھی اماں عرصے سے کہانی کار کی خاندانی مہمان ہیں بل کہ وہ پورے گھرانے کی مہمان ہیں۔ سب ان کی عزت کرتے ہیں اور ان کا صندوق ایک لیجنڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے مرنے پر جب صندوق کھولا جاتا ہے تو اس میں دھاگے میں پرویا ہوا ایک سوکھا پھول نکلتا ہے جو سب کو حیران کردیتا ہے۔ بقول مصنف وہ بوڑھی اماں اب بھی ایک محاورہ ہیں لیکن اب اس کے معنی

تبدیل ہو چکے ہیں۔
تعلق کے دھاگے کا آخری پھول مرجھا جائے تو پھر اک یاد ہی باقی بچتی ہے۔ اس نے اس سوکھے ہوئے پھول جیسی زندگی گزاری لیکن تعلق کا دھاگہ توڑنے سے باز رہی بڑی اماں کی سراپا نگاری قابل توجہ ہے۔

دھرتی کی زنجیر

قحط کا سا موسم ہے۔ ماں اور بیٹا بارش کے لیے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن آسمان خالی ہے۔ بیٹا گاؤں چھوڑنے کا ارادہ کر بیٹھا ہے تاکہ شہر سے کمائی کر لائے۔ آخری لمحے وہ بس کے انتظار میں بیٹھا ہے کہ اسے محسوس ہوتا ہے جیسے ماں نے پکارا ہے۔ مگر وہاں صرف خاموشی ہے، دھوپ ہے اور پیاسے کھیت ہیں، اچانک اس کے ذہن میں نرم نرم پھوار شروع ہوتی ہے اور اعصاب، زمیں کی سوندھی مہک پر دھمال ڈالنے لگتے ہیں۔ وہ واپسی کا رخ اختیار کرتا ہے۔ جب وہ پھولی سانسوں سے کھیت پر پہنچتا ہے تو ماں وہیں بیٹھی ہے، وہ کہتی ہے: ''مجھے معلوم تھا کہ تم یہیں آؤ گے۔''
کسان کے لیے ماں اور زمین ایک ہی درجہ رکھتی ہیں اور وہ انھیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔

پانچویں کھونٹ

یہ بھی گویا تیرہواں برج ہے۔ مسافر وحشت ناک سفر سے اُکتا چکا ہے۔ اچانک آگ اگلتی دھوپ کے بخارات میں سیاہ حصار مرتعش نظر آیا۔ اس کے پاؤں بے دار ہو گئے وہ چلتا رہا اور اسے ایک پردار دکھائی دیا جو پتھروں پر سیاہ نقطہ تھا اور پتھر اس دنیا کے نہیں تھے، مسافر پتھر میں غائب ہو گیا۔ بوڑھے نے مسافر کی کراہیں سنیں وہ کہہ رہا تھا پرندہ میری آنکھیں نوچ کر لے گیا، بوڑھا اندھا خوش ہوا کہ اب ہم دونوں برابر ہوئے۔
سیاہ پتھروں کے درمیان جھیل کے وسط میں سفید پتھریلا انسان باقی رہ گیا تھا، جس کے ہاتھ دعا دینے کے انداز میں اٹھے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھیں تیز ہوا کو دیکھ رہی تھیں، سورج نکل آیا تھا۔ یہ افسانہ علامتی افسانہ ہے اور داستانوی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس کے اندر ابہام کی ایک صورت ہے۔

عذاب میں گرفتار بستی

لوگ بارش کے منتظر ہیں اور پانی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ افسوس آسمان سے بادل نہیں ٹڈی دل اترتا ہے اور پھر گدھ۔۔ بستی کا عذاب اس کی بربادی پر ہی ختم ہوتا ہے۔ شاید کوئی پلید روح سب کچھ غارت کرگئی۔

بستی

بستی اک پرفضا جگہ تھی جہاں مرحومین سے محبت کی جاتی۔ اچانک کفن چور کفن چرانے لگے اور یہ پُراسرار سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ دوشیزہ کی لاش کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ لوگ ساری ساری رات قبرستان پر جاگ کر گزارنے لگے اور یہی فیصلہ ہوا کہ بستی چھوڑ دی جائے، مگر بستی سے نکلنے لگے تو ایک غیر مرئی ہاتھ نے پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا، وہ ایک قدم نہ اٹھا سکے، وہ لوٹ آئے لیکن کسی نے انہیں خوش آمدید نہ کہا۔

اختتام

عجب دہشت ناک سفر ہے۔ فضا پُراسرار خوف سے لبریز ہے۔ نادیدہ مخلوق کی موجودگی کے خوف سے وہ آیت الکرسی کا ورد کرتے آگے بڑھ رہے ہیں۔ انہیں ہاتھ نہ آنے والی عورت لبھاتی ہے، جو آغوش میں آ کر بدبودار عفریت میں بدل جاتی ہے۔ وہ آیات اور جلتی آگ کے حصار میں ہیں لیکن عورت کے جسم کی موجوردگی سے غافل نہیں۔ ان کا ایک دوست اسی جان لیوا سفر میں غائب ہوگیا انھیں اچانک کسی اجنبی کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے جو سفر میں ان کے ساتھ ہے۔ وہ ان کا مددگار ساتھی بھی ہے اور اس پر وہ شک بھی کرتے ہیں، مبادا وہ ان کی موت کا باعث ہو۔ ایک دن وہ اُسے مار دینے پر آمادہ ہیں، اور وہ کہتا ہے: "جلدی کرو۔ موت کو کم سے کم تماشا بننا چاہیے۔" سب کی آنکھیں لاش پر ہیں، انھیں توقع ہے کہ شاید لاش میں سے کوئی دھماکہ ہوگا اور سب کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔ ایسا کچھ نہیں وہ اس کی لاش جنگل میں چھوڑ آئے ہیں لیکن پہلے سے زیادہ خوفزدہ ہیں۔ تقویت بخش آیات ذہن سے محو ہو چکی ہیں اور اب وہ خود بھی ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کو تیار اور اپنی موت کے منتظر ہیں۔

افسانہ اندرونی خوف، خود حفاظتی، مایوسی اور موت کی دہشت سے لبریز ہے۔

زنجیر

اختتام کی طرح اسے افسانے کی بنیاد بھی انسانی خوف اور خود حفاظتی کے احساسات اجاگر کرتی ہے۔ ایک شخص گاڑی میں سفر کر رہا ہے اس کے ارد گرد لوگوں اور ان کی باتوں کا ہجوم ہے۔ ریل کے پہیوں کا شور اس سارے کو مزید بڑھا رہا ہے۔ زنجیر دائیں بائیں ہل رہی ہے، وہ پڑھتا ہے:

''خطرے کے وقت زنجیر کھینچی جائے، بلا ضرورت کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوسکتا ہے اور حوالہ پولیس بھی کیا جاسکتا ہے۔''

بظاہر اسے خطرے کی وجہ نظر نہیں آ رہی، لیکن خطرہ اس کے اعصاب میں چھپا ہے۔ وہ سوچتا ہے، زنجیر مجھی سے مخاطب ہے۔ اسی خوف کی فضا میں اسے حاتم طائی کا حمام بادگرد یاد آتا ہے پھر اسے باہر کی مناظر گڑ بڑ لگتے ہیں اور بچپن کی ایک لوری یاد آ جاتی ہے۔ ''الڑ بلو باوے دا'' سوچتے سوچتے اسے سب مسافر الڑ بلو لگنے لگتے ہیں، قریب ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، وہ یہیں سے قبلے کے صحیح یا غلط تعین کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ اسے انجن کی موجودگی ڈرانے لگتی ہے، یہیں سے وہ عدل جہانگیری کے بارے میں سوچتا ہے کہ محل سے لٹکنے والی زنجیر کی ساخت کیسی تھی۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ ڈبے کے سب لوگ زنجیر سے چشم پوشی کی سازش کر رہے ہیں۔ پھر وہ سوچتا ہے اصلی خطرہ تو ہم سفر ہیں، ان سے بچنے کے لیے زنجیر عافیت کا کنارہ ہے۔ وہ خلقت کے خوف سے کھڑا ہو جاتا ہے، لوگ خاموش ہیں اسے گھور رہے ہیں، اسے لگتا ہے وہ باوا ہے، جسے لوگوں نے اٹھا کر، اس کے گلے میں زنجیر پھنسا کر، اسے لٹکا دیا ہے۔ ٹکٹ چیکر ڈبے میں آتا ہے ہر شے اپنی جگہ ہے۔ لوگ ایماندار ہو گئے کوئی بے ٹکٹ نہیں، وہ زنجیر کی طرف دیکھتا ہے جس سے بندھا ایک باوا جھول رہا ہے۔ وہ مضحکہ خیز طریقے سے ہلتے ہوئے باوے کو دیکھتا ہے۔ مسافر اور وہ ہنستے ہیں، سفر خوش گوار ہو گیا ہے، مصنف نے افسانے کا ماخذ سہراب مودی کی فلم ''پکار'' بتایا ہے۔

افسانہ اندرونی خوف اور ہجوم کے خوف کی کشمکش سے ترتیب پاتا ہے۔

ظلِ ہما

بے حد دلچسپ افسانہ ہے۔ بظاہر نجی اور کند ذہن نظر آنے والے، جب اختیار کی لگام تھامتے ہیں تو عقل مندوں کو چونکا دیتے ہیں، سچ ہے دیوانہ بہ کار خویش ہشیار باشد۔

خلقت رنجور، عمائدین دل گرفتہ، پرچم سرنگوں ہے، شہنشاہِ عالم، مالک تاج و تخت انتقال کر گئے، وزیر با تدبیر اراکین مملکت سے مخاطب ہے:

"دنیا سرائے خانی ہے اس لیے ظلِ ہما کا ماتم برحق۔ ہم سب بھیڑوں کے گلّے
کے مانند تھے اور ظلِ ہما ہمارا راعی، مگر امور مملکت تعطل میں نہیں رہ سکتے۔
چناں چہ بادشاہ کا انتخاب ہما ہی کرے گا، ہما خوش بختی کی نشانی، پرندوں کی دنیا
کا مبارک ترین پرندہ۔"

خلقت جمع ہے۔ سب کی نگاہیں محل کے دروازے پر ہیں۔ ہما اپنی پرواز شروع کرتا ہے اور خلقت کے اس جم غفیر میں بیٹھے ایک غبی کے کندھے پر بیٹھ جاتا ہے۔ ہجوم دم بخود ہے لوگوں کا تقدیر پر ایمان پختہ ہو گیا ہے۔ نعرہ لگتا ہے "ظلِ ہما زندہ باد۔"

ظلِ ہما کی اصل حقیقت سے صرف وزیر باتدبیر واقف ہے، جو جانتا ہے ظلِ ہما سچے موتی کھاتا ہے۔ بادشاہ نے بھی بہت مرتبہ ظلِ ہما کی حقیقت جاننے کی کوشش کی لیکن وزیر باتدبیر کی سخن سازی غالب رہی۔ راج ہٹ بہت مشہور ہے۔ بادشاہ اپنی کوشش میں لگا رہا تب ایک خواجہ سرا کی مخبری سے ہما تک رسائی ہوئی۔

جشن شاہی کا اہتمام ہے۔ شاہانہ ضیافت کے بعد دربارِ عام میں ولی عہد مقرر کرنے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ اراکین مملکت اس اعلان پر حیران ہیں۔ وزیر باتدبیر اٹھا ہے، تخت شاہی کو بوسہ دے کر بادشاہ کو یاد دلاتا ہے کہ یہ اعلان مملکت اور ملکی روایات کے برعکس ہے، ہما کی موجودگی میں کوئی یہ فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں کہ تخت پر کس کا قبضہ ہوگا۔

تب بادشاہ کی آنکھیں قہر سے بھر جاتی ہیں۔

"کیسا ہما"؟ وہ قہقہہ لگا کر بولا: "اسے تو کل رات میں کھا چکا ہوں۔"

وزیر بے تدبیر، احمق عمائدین اور ایک آدھ رکن سلطنت کا سر قلم کیا جا چکا۔ لوگ اور اراکین دربار ولی عہد کی جے جے پکار رہے ہیں۔ جشن کی مہلت بڑھا دی گئی ہے، خزانے کا منہ کھلا ہے۔ شاہی عیاری اور شاہی بیوروکریسی کا ٹکراؤ افسانے میں دلچسپی کو نقطۂ عروج پر پہنچا رہا ہے۔ بادشاہ گری کے معاملات میں کبھی کبھی وزیر باتدبیر وزیر بے تدبیر بھی ہوا کرتا ہے۔

کھجوروں کا موسم

بستی کے بادشاہ کے سر پہ سایۂ ہما ہے اور بخت رسا ہے۔ بادشاہ بخت رسا رکھنے کے ساتھ ساتھ ذہن بھی رسا رکھتا ہے۔ چناں چہ کھجوروں کے درخت لگوانے کا منصوبہ رکھتا ہے۔ قلیل عرصے میں ہر طرف کھجور کے درخت نظر آنے لگتے ہیں۔ ہر طرف سر کشیدہ درخت فاتحین کے پرچموں کی طرح فضا

کھجوروں کی مٹھاس سے بوجھل، سانسوں میں کھجوروں کی مہک۔ یوں لگتا ہے، انسانی وجود چھچھاتی کھجور میں سب ہو گئے ہیں دھڑ، سر، تن، ذہن، آنکھیں ہر شے پر کھجور کا گمان ہونے لگا ہے۔

ملک کی تاریخ، کھجور کی تاریخ میں تبدیل ہو گئی۔ جغرافیہ کھجور کا موسم قرار پایا، کھجور کا درخت مرکزِ ثقل بن گیا۔ اسی فضا میں ایک مصور اور ایک شاعر تھے، جو انفرادی سوچ کے حامل تھے۔ دونوں خواب دیکھنے والے لیکن ان کے خوابوں میں کھجوروں کی گنجائش نہ تھی۔ ایک دن دونوں بستی سے باہر کھجوروں کے جھنڈ میں بیٹھے تھے۔ موضوع وہی تھا کھجور کا درخت۔۔۔ وہ حسب معمول کھجوروں کی مذمت کر رہے تھے۔ اچانک پہلو کا درخت جھکا اور اس کی لمبی شاخوں نے، اسے بچے کے مانند بازو میں لے لیا۔ درخت سیدھا ہوا تو شاعر غائب تھا انسان اب صرف کھجور کی کھاد بننے کے لیے تھے۔ ایک دن اس نے کلہاڑی اٹھائی درخت کے تنے پر ضرب لگائی، اسے حیرت ہوئی اس کے دوست کو کھا جانے والا درخت ایک ضرب میں ڈھ گیا۔ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا پیشتر اس کے اس کا کھلا منہ بند ہوتا ایک درخت اسے اچک چکا تھا۔

سچ ہے جبر اور جی حضوری کی فضا میں انسانی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ڈاکٹر سلیم اختر کے مخصوص سٹائل کا افسانہ ہے۔

پکار

بستی خوف کی مٹھی میں ہے۔ رات کی پرچھائیں غیر مرئی مخلوقات کو جنم دے رہی ہیں، خوف زدہ کتے کی آواز دروازے پر دستک دیتی ہے تو لوگ خوف سے لرزنے لگتے ہیں۔ نالی سے گھر میں داخل ہوتا چوہا ماں کے پہلو میں نوزائیدہ بچے کو دیکھتا ہے۔ بچے کو منہ میں دبا کر سیاہ بھیڑیے کی طرح دیوار پھلانگ جاتا ہے۔ صبح بچے کے ناخن، بال اور چیتھڑے ملتے ہیں۔ عورت خواب گاہ میں محبوب کا انتظار کر رہی ہے، خوف سے بچنے کے لیے لہسن کھڑکیوں میں لٹکائے گئے ہیں۔ اچانک اسے ایک رقصاں ہیولیٰ دکھائی دیتا ہے، جو اسے بازوؤں میں بھر کر شہ رگ میں دانتوں سے سوراخ بنا دیتا ہے۔ وہ دن بھر بے کلی اور بے چینی کی لذت میں مبتلا ہے۔ بستی پر خوف کے سائے لوگوں کے تعلقات پر اثر انداز ہو رہے ہیں؛ ہر ذہن میں شک کے کانٹے اگ آئے ہیں، بستی کے لوگ عاملوں، ساحروں اور کاہنوں سے علاج کے خواہاں ہیں لیکن وہ بھی ناکام ہیں۔ مسافر محبوبہ کی جان بچانا چاہتا ہے، جو نادیدہ کے عذاب کی اسیر ہے۔ وہ جادوگرنی کی طرف بڑھتا ہے جس کے پیلے منہ میں سیاہ دانت سنگریزوں کے مانند ہیں۔ وہ گہری آواز میں سوال کرتی ہے ''تم کیوں آئے ہو۔'' اس بلا سے بچنا آسان نہیں؛ جو جون بدل سکتی ہے، جس کا خون

منہ کو لگ جائے اسے نہیں چھوڑتی''۔ وہ سوچتا ہے۔''وہ خوبصورت ہونٹ جو صرف پیار کے لیے بنائے گئے ہیں کیا دوسروں کا خون چوسیں گے۔'' جادوگرنی ایک غار میں لے جا کر اسے زہر دیتی ہے تاکہ اس کی محبوبہ کا خاتمہ ہو سکے اور خون آشامی ختم جائے، زہر دیتے وقت اس کے ہاتھ سے شیشی گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔

''اس کی محبوبہ کے کمزور جسم میں بلا کی توانائی ہے وہ کسی بچے کی طرح اس کے بازوؤں میں مچل رہا ہے باریک دانت شہ رگ میں سوراخ کر چکے، اس کا جسم ساکت ہے اور موت کے گالوں پر، ہونٹوں پر دلفریب سرخی ہے۔''

خوف اور شک دونوں اپنا کام کر چکے ہیں۔

لہو کی چہچہاہٹ

بنیادی طور پر جنسی لذت اور دہشت کا افسانہ ہے۔ طوفان میں ایک خوبصورت عورت لکڑی کے تختے پر بے ہوش سمندر سے باہر نکالی جاتی ہے، پانچ مرد اسے کندھے پر اٹھائے لیے جا رہے ہیں۔ جب وہ بیدار ہوتی ہے تو اس کے لیے ایک گڑھا کھودتے ہیں، خشک لکڑیاں جمع کی جا رہی ہیں، مچلتے جسم کو گڑھے میں رکھا گیا ہے۔ ایک نے بڑا ہتھیار اٹھایا ہے، عورت کی گردن دھڑ سے الگ کی گئی ہے اس کے خون سے پیالے بھر بھر کر سیراب ہونے کے بعد اس کے جسم کے مختلف حصوں کو کاٹا گیا ہے: مغز اور چھاتیاں آخری اعضا ہیں، جن پر آرام سے ہاتھ صاف کیا جانا ہے۔ مزے لے لے کر گوشت کھاتے اور خون پیتے آدمی بہت خوش ہیں، انھیں لگتا ہے ساری فضا میں اس گوشت اور خوشبو کا ذائقہ بھر گیا ہے۔ اب صرف چوسی ہوئی ہڈیوں کا ڈھیر ہے، جس پر جوق در جوق گدھ منڈلا رہے ہیں۔ مرد آسودہ نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ گوشت نے پیاس چمکا دی ہے وہ پانی پی کر ابھی مڑنے بھی نہیں پائے کہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑے۔ گڑھے کھودے جا رہے ہیں، الاؤ روشن ہے فرق صرف یہ ہے کہ اب کے شعلوں کی زبانیں زیادہ تیز اور ہتھیار چلانے والے ہاتھوں میں زیادہ پھرتی اور مشاقی ہے۔

ساری بستی کو انسانی گوشت اور خون کا ذائقہ لگ چکا ہے۔ استحصال اور جنون کی کیفیات آسمان چھو رہی ہیں۔

اماوس

اماوس کی رات ہے۔ تاریکی میں الوؤں کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ چمگادڑوں کے دل خوشی سے دھڑک رہے ہیں۔ ایک بجو بچے کی تازہ قبر میں سوراخ بنا رہا ہے۔ کھنڈر کے بھوتوں سے ملاپ کے لیے پچھل پائیاں تاریکی کے سمندر میں لہریئے لیتی جارہی ہیں۔ صرف انسان خوف کی نیند کے بوجھ تلے کراہ رہا ہے۔ خاموشی سے خاوند اٹھا ہے اور بے ہوش بیوی پر نگاہ ڈالی ہے، اس کے بعد اس کی بادامی آنکھیں خنجر سے نکال لی ہیں۔ دائی نے سرِ شام اس خوابیدہ ماں کے پہلو سے بچہ اٹھایا تھا تو اس کی آنکھوں میں اس بچے کی تصویر جم گئی تھی۔ اس نے بچے کو گندلے کپڑے کے بدبودار تھیلے میں گلے سڑے پھل کی طرح ڈال دیا۔

عین اسی لمحے، جب محبوب اسے آغوش میں لینے والا تھا، محبوبہ نے اس کا دل نکال لیا۔ تازہ کھدی قبر سے جب لاش نکالی تو وہ اکڑ کر لکڑی ہو چکی تھی۔ اس نے لاش کے تختے پر بیٹھ کر غسل عسل کا آغاز کیا۔

اماوس کی رات مخلوق بیدار تھی۔ آنکھوں میں انتظار، اعصاب میں چمک، مخلوق منتظر تھی، اس کے پیغام کی، جو اس کا مقرب لاتا تھا۔ خود مقرب کا رتبہ بلند تھا، اس نے اپنی علامت کا بلیدان دیا تھا۔ آج اعزاز کی رات تھی مقرب نے دور تک پھیلے دائرے پر نگاہ دوڑائی، قبرستان میں بجو بچے کی لاش سے سیر ہو چکا تھا۔ بھوت اور پچھل پائیاں ملاپ سے فارغ تھے، درختوں کی شاخوں پر الو بیٹھا تھا، چمگادڑیں آئیں اور ہجوم پر مسلط ہو گئیں۔

مقرب نے ایک مرتبہ سب کی طرف دیکھا، وہ جانتا تھا اماوس مخلوق بلیدان کو کیسے کیسے تحفے لاتی ہے۔ دلِ عاشق، چشمِ معشوق اور نوزائیدہ بچہ، جشن کامیاب۔

تب وہ اچانک ان کے سامنے آن کھڑا ہوا ایک ہیبت ناک شکل کے ساتھ، اماوس کی برات کا دولہا، پر کوئی خاموشی سے اٹھتا نذر گزارتا اور بیان کرتا۔ دشمن کا کلیجہ چاہیے، سوتن کا بچہ مر جائے، بیوی کا عاشق تباہ ہوئے، خاوند غارت ہو، ساس کا نشان نہ رہے، ناجائز حمل گر جائے وغیرہ وغیرہ۔

وہ سنتا گیا۔ دائی آگے بڑھی، نوزائیدہ بچہ اس کے قدموں میں رکھا، سب کی نظریں بچے پر تھیں۔ یہ بڑی رسم تھی نوزائیدہ بچے کے دل میں خنجر اترتے ہی سب نے اسی پر پل پڑنا تھا کہ اس کا خون اور گوشت اعادہ شباب تھا۔ مقرب کا ہاتھ بلند ہوا، نوزائیدہ مردہ بچہ ایک دم آنکھوں سے ہنسا۔ اس کے قہقہے نے سب کو لرزا دیا، فضا روشنی سے بھر گئی، سب نادیدہ مخلوقات چیخیں مارتی غائب ہو گئیں۔ چاند سوا نیزے پر آیا۔ مرد و زن دائرے میں محبوس ہو گئے ان کے ایک طرف قبرستان تھا دوسری طرف شمشان، تیسری جانب کھنڈر اور چوتھی طرف وہ، جس کا کوئی نام نہ تھا۔ سب سے پہلے مقرب تڑپ کر گرا اور پھر ایک ایک

کر کے وہ یوں گرے جیسے لاکھ کے پتلے آگ سے پگھلتے ہیں۔

وہ جس کا نام نہیں لیا جا سکتا، خاموش دیکھا گیا۔ تب اس نے آسمان پر چمکتے چاند کے تھال کو دیکھا ایک زقند بھری اور پناہ دینے والے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ صرف نرم کرنوں کے مسکراتے جھولے میں نوزائیدہ بچہ انگوٹھا چوستا رہ گیا۔

زندگی، اثبات اور محبت کی علامت بچہ، جو دنیا اور حیات کا ابدی استعارہ خوف، وہم اور موت کی فضا میں روشنی کی دلیل ہے۔

شاہی دستر خوان

ایک ایسے بادشاہ کا قصہ ہے، جو بظاہر بڑا مہربان اور مہمان نواز ہے۔ وہ ہر رات ایک نیا دستر خوان بچھاتا ہے اور نئے مہمان کی ضیافت کرتا ہے۔ کہانی کے اختتام پر کھلتا ہے کہ شاہی دستر خوان کی اصل ضیافت دراصل مہمان ہی ہے، بادشاہ آدم خور ہے۔ جس کے مہمانوں کی ہڈیوں یا لاشوں سے محل کے کئی کمرے بھرے پڑے ہیں، بادشاہوں کے کرم میں بھی کئی ستم چھپے ہوتے ہیں، اس مصلحت سے آگاہی بہت دیر بعد حاصل ہوتی ہے۔

شکتی

افسانے کا بنیادی موضوع مرد اور عورت کی جسمانی طمانیت ہے اور اسی طمانیت کو شکتی قرار دیا گیا ہے۔

''درخت کے تنے سے لپٹی بیل اوڑھے سندر نار کھڑی تھی، جس نے جھکا سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں کی ڈور، ان میں سے ایک کو باندھ چکی تھی۔''

جنون کی رات

جنون کی رات جسمانی طمانیت کی رات ہے، جو اپنی دہشت کے باوجود ثمر بار ہے۔

''جسم کی پھلواری میں زخموں کے سرخ پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ وادی میں سرخ پھول، نشیب پر سرخ پھول، فراز پر سرخ پھول، جسم سرخ پھولوں کا دہکتا ہار۔''

جذامی زمین نے صحت یاب ہو کر، مسکرا کر اشارے کرتے سرخ پھولوں کا لباس پہن رکھا تھا۔

افسانہ۔۔۔ جو میں لکھنا بھول گیا

میز، کاغذ، قلم، دیواروں پر علامہ اقبال اور قائد اعظم کی تصویریں۔ کتابوں سے بھری شیلف، اخبارات رسالے سب کچھ موجود ہے لیکن افسانہ لفظوں میں ڈھلنے کو تیار نہیں۔ افسانہ ایک وسیع و عریض دیوار کی مانند ہے، جس کی جڑیں پاتال میں اتری تھیں ایک وجودی لمحے میں مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ میں اس دیوار کو اسی صورت پار کر سکتا ہوں، جب سل پار کرلوں، سل کو صفحے کی مانند تحریر کرنا ہے۔ اپنے وجود کی روشنی سے اپنی ذات کی روشنائی ہے۔۔۔ صلاحیتیں لفظ پر مرتکز کرتا ہوں لیکن افسانہ بھول چکا ہوں، اسم اعظم کھو گیا ہے۔

یہ کھویا ہوا افسانہ کیا ہے اسے ابہام میں رکھا گیا ہے۔

سائے کی طرح ساتھ پھریں

ہیرو پر اشباہات اور نادیدہ مخلوقات کا سایہ ہے۔ ماں اسے پیروں فقیروں کے پاس لے کر جاتی ہے اور بیوی اس کا تمسخر اڑاتی ہے۔ نادیدہ کی تلاش کے جواب میں، ہیرو اپنی تلاش میں عامل اور اس کے چنگل سے نکل کر اپنے سسرال کا رخ کرتا ہے، گویا اس کی نادیدہ صلاحیتوں کا آخری علاج اس کی بیوی ہی ہے۔

آشوبِ چشم

آنکھوں کے جال میں پھنسنے سے پہلے وہ مسرور آزاد زندگی بسر کر رہا تھا اور اب لگتا ہے کہ پورے شہر کے لوگوں کی آنکھیں سر کے پیچھے ابھر آئی ہیں:

> ''وہ آزردہ بیٹھا مکھی کو دیکھ رہا ہے، جس کی کئی آنکھیں ہیں وہ اسے قریب کرنے لگا تو وہ اڑگئی، سب کچھ ناقابل برداشت تھا وہ رویا اور چھری سے آنکھیں نوچ لیں۔''

پیرِ تسمہ پا

افسانہ ڈاکٹر سلیم اختر کے پسندیدہ ہیرو حاتم اور اس کی قوت مردی اور بانجھ پن کے گرد گھومتا ہے۔
حاتم بوڑھا ہو چکا ہے اور اپنے ہی وجود کے بھوت سے رفتہ رفتہ عاجز آتا جا رہا ہے۔ راستے میں بیٹھا ہے، ایک پُر شباب نوجوان گزرا ہے تو اس کے تیور دیکھ کر اسے اپنی جوانی یاد آتی ہے۔ اس نے صدا لگائی، اے جانے والے بیٹا ذرا ندی پار کرا دے، خدا را میری مدد کر، نوجوان نے حاتم کو اپنے پُر قوت بازوؤں سے اٹھا کر اپنے مضبوط کندھوں پر بٹھا لیا اور چلا تیز تیز۔ حاتم نے اطمینان کی طویل سانس لی اور اپنے جسم کو نوجوان کے جسم کے ہچکولوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔ اسے بہت مزا آرہا تھا۔ عافیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اچانک ایک موڑ پر اس کی نظریں اپنے گمشدہ گھوڑے سے چار ہوئیں جس نے پہلے تو اسے تعجب سے دیکھا اور پھر نفرت سے منہ موڑ لیا، مگر حاتم نے پروا نہ کی کہ وہ تختِ رواں پر بیٹھا گویا چوتھے آسمان کی جانب محوِ پرواز تھا۔

سائے کی طرح ساتھ پھیریں اور پیرِ تسمہ پا کسی حد تک امرد پرستی کے رجحان رکھتے ہیں۔

بچہ جمورا

بچہ جمورا اپنے عامل کے سوالات کے جوابات دے رہا ہے، جو ملکی صورت حال سے متعلق ہیں۔
آخری سوالات حکم اور نگران کے بارے میں ہیں:

''حاکم کیا کرتا ہے'' ۔۔۔ ''رعایا سے محبت۔'' ''تم کون؟'' خاموشی۔ ''میں کون؟'' ''خاموشی۔'' ''گھوم جا۔'' ''خاموشی۔'' ادھر آجا۔'' خاموشی

اندازہ ہوتا ہے کہ حاکم وقت عامل ہے اور رعایا بچہ جمورا۔ مکمل جبر و اختیار کے موسم میں بچہ جمورا کی عافیت خاموشی میں ہے۔ اسی کرافٹ کا ایک افسانہ ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے'' ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ بچہ جمورا اور عامل کے توسط سے سلیم اختر کے افسانوں میں کاٹھ کا شہر، کاٹھ نگر میں پتلی تماشا، احمق کٹھ پتلی بھی اسی قسم کی جبریت کے افسانے ہیں۔

تخلیق

ذہنی ہذیان کا افسانہ ہے۔ تخلیق کار کے ذہن سے کردار امنڈ رہے ہیں اور ہر کردار اپنی مرضی کی زندگی چاہتا ہے، جو ناممکن ہے۔ انھیں سرکش ہوتا دیکھ کر وہ لفٹ میں دھکیل دیتا ہے۔ آخری منزل کا بٹن دباتے

ہوئے ہنستے چلا جاتا ہے کیوں کہ چند لمحوں بعد بجلی نے فیل ہو جانا ہے۔

بے چہرہ لوگ

تین سو کوارٹروں کی ایک بستی، جس میں کلرک یا دوسرے اسی قسم کے طبقے کے لوگ رہتے ہیں؛ ایک جیسے گھروں میں رہتے، ایک جیسی بسوں میں سفر کرتے، ایک جیسے مسائل اور ذہنیت کے ساتھ، ان کی کوئی شناخت نہیں۔ ہر مکان میں دو کمرے، ایک برآمدہ، ایک صحن، زاویہ قائمہ بناتے ہوئے راستوں کے دو کھمبے، ایک کا بلب فیوز، دوسرے میں بلب غائب، لوگ اپنے گھروں کو پہچان نہیں پاتے۔ اسی طرح اپنی بیویوں اور اپنے معمولات کو بھی نہیں، ایسی ہی ایک واردات کوارٹر نمبر ۱۱۵ میں ہوئی ہے۔

جاگے ہیں خواب میں

آسیبی فضا ہے۔ وہ زنجیر ہلاتا ہے سالخوردہ اندر آنے کا اشارہ دیتا ہے۔ لالٹین کی روشنی میں تین صورتیں گھوم رہی ہیں۔ آنکھ سے آنکھ کا تعارف، لڑکی اور عورت اور بوڑھا، شاید روح بلانے کا عمل شروع ہونے والا ہے لیکن کچھ نہیں ہوا۔ موم بتی بجھ گئی سب اپنے اپنے کمروں کا رخ کرتے ہیں۔ بستر آرام دہ ہے مگر وہ جاگ رہا ہے، بستر پر لیٹے وہ اپنے آپ کو سائے میں تبدیل ہوتا دیکھتا ہے۔ وہ اٹھ کر باہر جاتا ہے، کوئی سیڑھیوں سے اترتا ہے، یہ لڑکی ہے سفید لباس میں باغ میں اجاڑ گوشے میں نرم زمین کھودتی، ایک گڑھا بن جاتا ہے وہ لباس کی تہوں سے تھیلی برآمد کرتی ہے۔ ایک بیج نکال کر گڑھے میں ڈالتی اسے تھپتھپاتی اور واپس آجاتی ہے۔ وہ پھر ایک سایہ کھڑکی سے گزرتے دیکھتا ہے یہ عورت ہے جو پانی بھر کر لاتی ہے اور بیج والے گڑھے پر چھڑکاؤ کرتی ہے۔ وہ پلٹتی ہے تو یہ بھی پلٹتا ہے ایک مرد کا گزر ہوتا ہے وہ اسی مقام پر پہنچتا ہے اور بیج نکال کر منہ میں چباتے ہوئے لوٹ آتا ہے۔ چند لمحوں بعد بوڑھا نمودار ہوتا ہے، گڑھے کی مٹی سیدھی کرتا ہے گویا گڑھا تھا ہی نہیں۔

صبح نیند سے بیداری پر سب جمع ہیں۔ لڑکی پوچھتی ہے آپ تمام رات چلتے رہتے ہیں۔ عورت کہتی ہے میں نے تمھیں باغ میں منڈلاتے دیکھا ہے۔ مرد کہتا ہے کچھ لوگوں کو خواب میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے۔ بوڑھا کہتا ہے اس عمر کا مرض اچھا نہیں اس کا علاج ہونا چاہیے۔ وہ چپ چاپ سنتا ہے اور چپ رہتا ہے۔ باغ کی جانب سب رواں دواں ہیں۔ وہ ان کا جھوٹ بے نقاب کرنے کے لیے فاتحانہ انگلی گڑھے کی طرف اٹھاتا ہے۔ تب سب ہنستے ہیں۔ لڑکی پانچ سالہ بچے کی آواز میں بتاتی ہے: ''میری چڑیا مر گئی تھی اسے میں نے دفن کیا تھا۔'' اور تب اسے پہلی مرتبہ احساس ہوتا ہے کہ پرندوں کی آوازوں

سے محروم باغ کے اندھے کنوئیں جیسے سناٹے کو صرف ان کی سانسیں توڑ رہی ہیں۔
سب خواب کا منظر نامہ ہے یا جھوٹ کا یا واہمے کا، افسانے کی مبہم حالت قائم رہتی ہے۔

آئینۂ تکرار تمنا

دنیا کے تین خطوں کے مرد تھے ایک چٹیل صحرا کا باسی، دوسرا پہاڑ کی بلند چوٹی کا باشندہ اور تیسرا سمندر کی تہہ سے ابھرا تھا۔ ان کی منزل ایک ستارہ تھا، جو بظاہر یک رنگ تھا، ان کا سفر جاری رہا۔ ستارہ گویا پھل کی طرح اتنا قریب کہ اچھل کے توڑ لیں۔ وہ چلتے رہے آتش فشاں کے جہنمی دہانے پر، چار طرف قد آور مجسمے تھے مختلف چہروں اور حالتوں میں۔ اور تب انہیں علم ہوا کہ وہ ستارہ صرف آتش فشاں کا عکس تھا۔ اس سیاہی میں ایک آنکھ کی طرح چمکتا ہوا، شدت غم سے وہ چیخ بن کر نجات چاہتے تھے، تلاش ادھوری تھی اور وہ پتھر کے ہو چکے تھے۔

خاموشی کا کیپسول

ہیرو محسوس کرتا ہے کہ بدآہنگ آوازوں نے ایک شکل اختیار کر لی ہے اور ان کا بے جا لمس اعصاب پر ناگوار اثرات ڈال رہا ہے۔ اس کی بیوی اس کے قریب لیٹی ہے اور خراٹے لے رہی ہے۔ اس منحوس عورت نے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر مرنے کا لطف بھی غارت کر دیا ہے۔ خاموشی اور سناٹا آواز بن رہے ہیں۔ ہیرو آسودہ ہے کہ اس نے سکون پالیا ہے لیکن اب یہی خاموشی اسے نگل رہی ہے۔ وہ حاتم، کوہ ندا، زہرہ جبیں محبوبہ کی فلم دیکھ رہا ہے۔ اچانک یہ سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تصور پر خاموشی کا پہرہ ہے۔ وہ سوچتا ہے میں باہر کی چڑیوں، آسیبوں اور عفریتوں سے ڈر کر خاموشی کی پناہ میں آیا تھا مگر اب یہ رشتہ بھی ٹوٹتا ہے۔ مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ صرف آواز سے اپنے وجود کو دریافت کیا جا سکتا ہے۔ خاموشی کی کھائی سے کیسے نکلا جائے اسے پھر حاتم یاد آتا ہے۔

''اور تب حاتم نے کہ سفر کی گرد میں ملبوس تھا آن کر کہا۔ ''سن اے ماہ لقا! کوہ ندا کا راز خاموشی ہے۔''

ماہ لقا بول کیا تم خاموشی کا راز پانے کے لیے سفر نہ کرو گے۔ حاتم نے کہا ہرگز نہیں کیوں کہ اسی سے فرار کے لیے تو میں دوسروں کے لیے مہمیں سر کرتا پھرتا ہوں۔'' اور یوں اس پاگل سوال نے حاتم کا شاندار کیریئر تباہ کر دیا۔
ہیرو خاموشی کے سمندر میں ڈبکیاں کھا رہا ہے، اچانک ایک خاموش چیخ سے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے

وہ شکرادا کرتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک خواب تھا لیکن خواب کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک عجیب بات ہوتی ہے تقریباً ان ہونی۔ خاموشی کیپسول کی طرح سکڑنے لگتی ہے اس سے مہیب گنبد بے در چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے، ہیرو اس اسم اعظم سے بے خبر ہے جو کیپسول کو بلبلے کی طرح اڑا دے وہ سکڑنے لگتا ہے۔۔۔ ہیرو کے گھٹنے پیٹ سے لگے ہیں اور وہ نہیں جانتا۔ وہ آسودہ ہوا ہے یا مر گیا ہے۔

کمرہ تاریک ہے۔ عورت مرد ایک دوسرے کو نظر نہ آنے والی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، آنکھیں جن میں خوف سے پھیلنے اور سکڑنے کی سکت نہیں۔ صرف خراٹے ہیں زندگی اور موت کا ثبوت۔

پھن پھول

جنس کی زہرناکی اور کاملیت کا افسانہ ہے جو لذت مرگ پر ختم ہوتا ہے۔ کہانی کے ابتدایئے میں ایک دیوتا کے پہلو سے دیوی کا جنم ہوتا ہے جو کسی دوسرے پہ عاشق ہو جاتی ہے اور اسے اپنی محبت کی گرمی سے پگھلا کر پتھر کر دیتی ہے۔ داسو اور اس کا دادا گاؤں سے باہر ایک مری ہوئی گائے کو دیکھتے ہیں، جسے زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ اس گائے کا کچھ حصہ ایک گدھ کھا چکا ہے، جس کا انجام زہرناک موت ہے۔ زہریلے سانپ کی تلاش میں داسو کا دادا ریت کی لکیر تلاش کرتے کرتے ایک دائرے تک اور پھر ایک جھاڑی تک پہنچتا ہے، جہاں ایک ناگن دکھائی پڑتی ہے۔ ناگن دادے کو ڈسنے کے بجائے زندہ چھوڑ دیتی ہے لیکن داسو پر عاشق ہو جاتی ہے۔ ایک رات جب داسو اپنی محبوبہ زینا سے ملاقات میں ناگن کا تذکرہ کرتا ہے تو زینا ناگن کو اپنی موت سمجھنے لگتی ہے۔ ناگن زینا کو ڈس لیتی ہے، سپیروں کی اس بستی میں ہر شخص زینا کی قاتل ناگن کو پکڑنے کی دھن میں ہے۔ کہانی کے انجام پر ناگن ظاہر ہوتی ہے۔ داسو اور وہ محبت کی کشش میں اسیر ہو کر ایک ہو جاتے ہیں اور آخر کار دونوں مر کر امر ہو جاتے ہیں۔

> ''سانپ ندی میں سانپ جل تھا، سانپ جل میں سانپ امرت تھا، سانپ بیل میں سانپ پتے تھے، سانپ کلی میں سانپ پھول تھا، سانپ پنکھڑی میں سانپ رس تھا، سانپ پھل میں سانپ من تھا۔۔۔ وہ ناگ شجر کے سایے میں تھے۔
>
> ناگ شاخوں پر پھن پھول کھلے تھے اور دونوں پھن پھولوں کی بارش میں تھے۔''

تلاش کا سفر اور محبت کی انتہا ہو چکی تھی۔ افسانہ ڈاکٹر سلیم اختر کے عمومی افسانوں سے زیادہ طویل ہے، فضا رومانوی اور غیر مرئی باتوں سے بجی ہوئی ہے۔ افسانے کا منظر نامہ دلفریب ہے۔

سویٹ ہارٹ

افسانے کا ہیرو اس کلب میں ہے جہاں کبھی اس کی ملاقات ویلما نامی لڑکی سے ہوئی تھی۔ تب وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑکی جسم فروشی سے روزی کماتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے تو ہیرو کو معلوم ہوا کہ ویلما تپ دق میں مبتلا ہو چکی ہے۔ وہ اپنے دل میں اس لڑکی کے لیے نرم جذبات رکھتا تھا اور اس سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔ اچانک اسے بیرون ملک جانا پڑا، واپسی پر معاملات مزید بگڑ گئے اور ویلما ہسپتال میں داخل ہوگئی۔ ملاقات کے دوران میں ہیرو کی ملاقات اس کی بہن سے ہوئی، جو اپنی بہن کو اس کے دھندے کی وجہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے لیکن کہانی کے اختتام پر یہی بہن ایستھر سویٹ ہارٹ بنی ایک امیر آدمی کے ہمراہ کلب میں رقص کرتی دکھائی گئی۔ شاید مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ کچھ لوگوں کے دن کبھی نہیں پھرتے اور انھیں نہ چاہتے ہوئے بھی وہی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے جس سے وہ متنفر ہوتے ہیں۔

''ایستھر میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا، ہاں وہ ایستھر ہی تھی، پونی ٹیل غائب پرم کیے ہوئے بالوں نے اس کے بیضوی چہرے کے خطوط کو اور بھی نمایاں کردیا تھا۔ اس کا پارٹنر ویلما کے خاص قدر دانوں میں سے تھا۔ وہ بدصورت تھا اور ادھیڑ عمر اس کی بیوی طلاق لے چکی تھی مگر اس کے پاس شیورلٹ تھی اور بنک بیلنس۔''

کانا چور

ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے ادھیڑ عمر اور بدصورت مالک، نوجوان فوٹوگرافر اور اس کی خوبصورت بیوی کی مثلث کہانی کو بہت خوبصورتی سے آگے بڑھاتی ہے۔ بیگ صاحب ماڈل لڑکی کی تصویر دیکھ کر فریفتہ ہیں اور فوٹوگرافر آخر کار اس حسین بیوی کے بل بوتے پر دن بدن ترقی کی مراحل طے کرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جو افسانے کا نقطۂ عروج بھی ہے اور اختتام بھی۔ ''ایک۔ دو تین۔''، سب جھپٹا مار کر آگے بڑھے اور اگلے لمحے باکس خالی تھا اور خاور کا ہاتھ بھی! سب خوش ہو کر چابیوں کے ساتھ بندھے ٹیگ پر سے نام اور پتے پڑھ رہے تھے۔

"I got Nafeesa" بیگ صاحب خوش ہو کر چلائے پھر انہوں نے خاور کے خالی ہاتھ اور لٹکا ہوا

منہ دیکھ کر کہا۔ "This is the last surprise" ، بعض اوقات کسی کی بیوی منتقلی کورس میں ہوتی ہے تو اس رات ایک چابی گم ہو جاتی ہے، جو چابی لینے سے رہ جائے وہ کانا چور بنتا ہے۔ اس پر سب نے کانا چور کانا چور کہہ کر قہقہے لگائے۔ رضوان صاحب بولے ''کوئی بات نہیں یا Next time you will be Lucky سب کو جلدی تھی سب کی کاریں ایک ہی راستے پر جارہی تھیں، وہ تمام رات صوفیہ لارین کی فلم The key دیکھتا رہا۔۔۔ صبح چار بجے کے قریب گھر پہنچا تو سب کاریں ابھی تک وہیں موجود تھیں۔

موری کی اینٹ

ایک حلال زادی کا واقعہ ہے جو ایک شریف زادے بابو کی محبت میں حاملہ ہو جاتی ہے۔ سب کی مار سہتی ہے اور چپ رہتی ہے۔ شریف زادہ منظر سے غائب ہو جاتا ہے اور جننے کو گاؤں اس کی بوڑھی خالہ کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش تک جننے سوچتی رہتی ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی وہ اسے مار دے گی۔ وہ اپنی بچی کو گڑھے میں پھینک کر واپس پلٹتی ہے کہ اچانک اس کے رونے کی آواز اس کے پیروں کی زنجیر بن جاتی ہے، دوسرے لمحے ماں بیٹی کو سینے سے لگا کر رو رہی ہے۔

کاٹھ کی عورتیں

ان عورتوں کی کہانی ہے جو مردوں کے ظلم و ستم کی اس قدر اسیر ہو جاتی ہیں کہ مار پیٹ اور گالی گلوچ میں مزہ لینے لگتی ہیں۔ اس مزے میں انھیں موت کا غم بھی یاد نہیں رہتا۔

گندہ خون

موری کی اینٹ جیسا ہی افسانہ ہے۔ مصنف ایک جاگیردار دوست کے ساتھ اس کے علاقے میں سیر کے لیے آیا ہے اور اس کے دادا خان صاحب سے بے حد متاثر ہے، جو جلال اور جمال کا امتزاج ہیں۔ ایک دن وہ ان کے ساتھ سیر کی غرض سے جارہا ہے کہ گاؤں کے مزارعے موجو کا بیٹا، گستاخانہ پاس سے گزرتا ہے اور سلام کرنا گوارا نہیں کرتا۔ خان صاحب کے تن بدن کو آگ لگی ہے وہ اس حرامی کو سبق سکھانا چاہتے ہیں۔ میدان میں سب موجود ہیں، شرفا کرسیوں پر، چارپائیوں پر، سفید چہرے، کھڑی ناکیں، سنہری مائل سبز آنکھیں، اونچے قد، دوسری جانب مزارعین ہیں۔ کالے سیاہ، سہمے ہوئے زمین پر آلتی پالتی مارے ہوئے۔

شریف زادہ رورو کر پٹائی کا ماجرا بیان کررہا ہے۔ شرفا کے چہرے غصے سے سرخ ہیں، بڑے خان صاحب گرجتے ہیں موجو! جو تجھے کہنا ہے کہہ لے۔

موجو معافیاں مانگ رہا تھا، اپنی وفاداری اور خدمت کا تذکرہ کررہا ہے۔ پھر اچانک اس نے طویل سانس لی ہے، بیٹے کو کان سے پکڑا ہے اور سب سے مخاطب ہے۔ ''حضور دیکھیے کیا یہ سفید رنگ میرا ہے؟ کیا یہ اونچی ناک میری ہے؟ کیا یہ چمکیلی آنکھیں میری ہیں؟'' مجمع کہتا ہے یہ کیا بات ہوئی، وہ تھکے لہجے میں بولتا ہے۔

''مجھ سے آپ کیوں پوچھتے ہیں کہ اس نے آپ کے بیٹے کو کیوں مارا؟ مجھے کیا پتہ کہ اس نے کیوں کیا، لیکن نہیں شاید مجھے پتہ ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ یہ گندہ خون ہے یہ گندہ خون میرا نہیں ہوسکتا، میرا خون ہوتا تو میری مانند آپ کی جوتیوں میں رہتا۔''

اور پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر چیختا ہے بول کنجری بول۔۔ یہ کس کا حرام زادہ ہے۔

کھونٹا

ایک اپاہج بیوی اور اس کے مجہول شوہر کی کہانی ہے۔ بیوی ڈاکٹر اور شوہر پروفیسر ہے۔ بیوی ویل چیئر پر ہے اور اسے نت نئی ملازمائیں رکھنے کا شوق ہے، جنھیں وہ مردانہ لباس پہنا کر گھر میں اس طرح رکھتی ہے کہ وہ اس کی گھنٹی پر آناً فوناً حاضر ہونے کی پابند ہیں۔ شوہر ان میں سے ایک عورت پر مائل ہوجاتا ہے اور ایک رات اس عورت سے ملاقات کے بارے میں سوچتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔ اتنے میں بیوی کے کمرے کی گھنٹی بجتی ہے ملازمہ بھاگتے ہوئے ادھر کا رخ کرتی ہے، وہ کتابوں کی الماری سے ٹیک لگائے کھڑا ہے۔۔ ملازمہ فراغت کے بعد اپنے کمرے کی طرف جارہی ہے۔۔۔ وہ اپنے اعصاب پر قابو پا کر کمرے میں داخل ہوتا ہے کمرہ بیوی کی بدبو سے بھرا ہے۔ کچھ دیر بعد اسے اندازہ ہوتا ہے کہ بیوی کی سانس ہموار ہورہی ہے، وہ اپنے حصے کے بستر پر اپنی حد میں محصور کاٹھ کا جسم لیے لیٹا ہے نیند اور رات گزر رہی ہیں۔

افسانہ بیک وقت ہم جنسیت اور ذوجنیت کے تصورات ابھارتا ہے۔ رشتے کے کھونٹے سے بندھے اور عدم اعتمادی کے بوجھ تلے ٹھہرے ہوئے میاں بیوی بے چارگی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔

جلے پاؤں کی بلی

ایک لڑکی نعیمہ کی کہانی ہے جو اکلوتے بھائی کلیم کو ملنے والی مراعات سے متاثر ہے۔ وہ سوچتی ہے اگر وہ بھی مرد ہوتی تو آزادی کی زندگی بسر کر سکتی تھی۔ اسے بھائی کے کپڑے پہن کر آسودگی حاصل ہوتی ہے اسی طرح وہ ڈرامے میں وزیر کا کردار ادا کرتے ہوئے سکون محسوس کرتی ہے۔ افسانے کے اختتام پر وہ بھائی کا مردانہ لباس پہنے گھر کی کھڑکی سے محلے کی لڑکی سے اشاراتی محبت میں مبتلا دکھائی گئی ہے۔

بسیرے کی جورو

ایک ایسی عورت کی کہانی ہے، جو تن و توش سے بڑی مضبوط ہے۔ اپنے کمزور اور مریل شوہر کا ہر معاملے میں دفاع کرتی ہے، بچے کی نعمت سے محروم ہے۔ اسے اس بات کی خواہش ہے کہ بسیرا بھی عام مردوں کی طرح اسے خوب مارے اور شدت سے محبت کرے۔ بسیرا اسی شدت سے محروم ہے، اسی لیے جورو مصنف کو ایک قابلِ رحم عورت محسوس ہوتی ہے کیوں کہ وہ ایک نامرد کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے۔

بیوی کا الاؤ

ایک خوبصورت جوان ڈاکٹر لطیف اور ایک کیمسٹ ناظم کی بڑی دوستی ہے۔ ناظم عورتوں کا بڑا رسیا ہے لیکن کم صورت ہے۔ آخر کار ناظم کی شادی ایک خوبصورت عورت سے ہو جاتی ہے۔ ناظم اس کی خوبصورتی کی تاب نہ لاتے ہوئے اس سے جسمانی تعلقات میں ناکام رہتا ہے اور اس کا جواز یہ تراشتا ہے کہ وہ اس کے حسن کو میلا نہیں کرنا چاہتا۔ آخر ایک دن وہ اپنی بیوی کے علاج کے لیے ڈاکٹر لطیف کو گھر لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ زنانہ بیماری میں مبتلا ہے۔ افسانے کے آخر میں درج ہے:

> ''اس نے آگے بڑھ کر اسے چارپائی پر لٹا دیا۔۔۔ یہ دیکھیں، یہ دیکھیں وہ اس کی قمیص اٹھائے ہوئے کہہ رہا تھا، یہاں درد ہوتا ہے۔''
>
> ڈاکٹر پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے اور ناظم کنوئیں کی گہرائی سے بولتا:
>
> ''آپ اطمینان سے دیکھیں، میں آپ کے لیے کوکا کولا لاتا ہوں۔''

افسانے میں ابہام کی کیفیت اس طرف بھی اشارہ دیتی ہے کہ خوبصورت بیوی پہلے سے حاملہ ہے یا ناظم ڈاکٹر سے بھی، اس کے حسن کی گواہی چاہتا ہے۔

بیویوں کی سازش

کہانی کار کی بیوی اسے اپنی تین سہیلیوں کی وہ خفیہ گفتگو سناتی رہتی ہے، جو وہ اپنے شوہروں کے بارے میں کرتی ہیں۔ کسی ایک آدھ فقرے کے باعث کہانی کار مسز شمسی پر مائل ہو جاتا ہے کیوں کہ بقول اس کی بیوی کے، اس نے کہا ہے۔ مصنف ایک اچھا Lover ہے۔ مسز شمسی کا شوہر شہر سے باہر ہے اور مصنف مسز شمسی کے گھر جا پہنچا ہے۔ مسز شمسی اسے چائے میں مرچیں ڈال کر پلا دیتی ہے۔ واپسی پر بیوی شوہر سے کہتی ہے، میری باقی سہیلیوں سے ملاقات اس سے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

مٹھائی کی پلیٹ اور دودھ کا گلاس

زرینہ کے لیے شادی ایک تکلیف دہ تجربہ ثابت ہوئی ہے۔ کمرے میں رکھی مٹھائی اور دودھ نے اس کے شوہر کی جنسی اشتہا بڑھا دی ہے، جسے وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اسی تکلیف دہ زندگی کے دوران اس کی بچی جنم لیتی ہے، ایک رات بچی بیمار ہے اور شوہر دیوانگی کے عروج پر وہ اسے سمجھاتی ہے کہ بچی کو اس وقت ماں کی ضرورت ہے لیکن معاملہ بگڑ جاتا ہے شوہر آسودہ ہو کر سو جاتا ہے اور بچی مر جاتی ہے۔ سچ ہے سب کے لیے رفاقت مٹھائی کی پلیٹ ثابت نہیں ہوتی۔

آخری سبق

ڈاکٹر سلیم اختر کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ حامد ایک شرمیلا بچہ ہے جسے ماں ایک خاتون کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجتی ہے۔ وقت کے ساتھ وہ خاتون اپنی محبت اور توجہ سے حامد کی زندگی میں اس قدر دخیل ہو جاتی ہے کہ حامد کو وہ لڑکی بھی نہیں لبھاتی، جسے استانی جی کے مشورے سے بیاہ کر لایا گیا ہے۔ حامد بہت اُداس ہے وہ اسی اُداسی میں استانی جی کے گھر جاتا ہے اور ان کے گھٹنے سے لگ کر رونے لگتا ہے، استانی جی ایک لمبی سانس لیتی ہیں اور اسے بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے جاتی ہیں۔

۱۹۷۲ء کا سانولا

کہانی کار اپنے پرانے دوست تمکین کو ایک لڑکی ناہید کے ساتھ دیکھتا ہے۔ دبلے جسم، لمبے قد، نمکین چہرے، زرد لپ اسٹک سے سجے بھرے بھرے ہونٹوں والی ناہید دیوداسیوں جیسا رنگ رکھتی ہے۔ اس کی آنکھیں سبز ہیں اور اسے رنگین لباس پہننے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ تمکین اسے اپنی سیکرٹری کی حیثیت سے متعارف کرتا ہے۔ دونوں کی کمال یگانگت سے مصنف یہ سمجھتا ہے کہ شاید تمکین اس سے شادی کا ارادہ رکھتا ہے، لیکن تمکین کا کہنا ہے کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے، جن کی وفاداری ہمیشہ مشکوک لگتی ہے۔

ایک دن ناہید اور تمکین سے ملاقات کے دوران میں معلوم ہوتا ہے۔ ناہید افسانہ نگار ہے اور افسانے شائع کروانے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مصنف اس اشاعت کا وعدہ کرتا ہے اور رسالے کے لیے ایک تصویر کا مطالبہ کرتا ہے، جسے اس کا دوست ایڈیٹر بہت اہتمام سے شائع کرتا ہے۔ ناہید شکریے کے طور پر تازہ افسانہ اور تصویر ارسال کرتی ہے۔ بہت عرصے بعد وہ اپنے شہر میں ایک سادہ بجھی اور اڑی رنگت والی لڑکی سے ملتا ہے جو ناہید ہے وہ فرم چھوڑ چکی ہے۔ بے روزگار ہے اور تنہائی کی زندگی گزار رہی ہے۔ تھوڑی مدت کے بعد وہ لاہور کے ادبی حلقوں میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہے ہر تقریب، ہر اخبار، ہر رسالے، ہر دفتر میں، افسانے پڑھتی، بحث کرتی، ریڈیو کے لیے فیچر لکھتی، ہر ادیب کی مہمان، وہ کہانی کار کے لیے ایک الجھن بن چکی ہے، ایک افسانوی نشست میں وہ ناہید کے افسانے پر بہت تنقید کرتا ہے، ناہید اس تنقید کے جواب میں اسے اپنا استاد بنانے کو تیار ہے اور اسے ملاقات کی دعوت دیتی ہے۔

> ”رات جب وہ اس کے گھر پہنچتا ہے وہ گھر پہ تنہا ہے۔ کمرے کے اندھیرے میں لپ اسٹک لگے دو ہونٹ معلق ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ مصنف جب واپس مڑتا ہے تو جانتا ہے کہ اس کے جسم کے مانند ناہید کے جسم کو بھی علم ہے کہ اب وہ کبھی دوبارہ نہیں ملیں گے۔“

بچھو

دو دوستوں کی باہمی رقابت کا جیتا جاگتا شاہکار ہے۔ ایک رومانی افسانہ نگار ہے، جو اپنے آپ کو بے

ضرر مخلوق سمجھتا ہے اور دوسرا اس کا دوست جو امتدادِ زمانہ سے امیر آدمی بن چکا ہے۔ اس کے تعارف میں مصنف لکھتا ہے:

''مرکرِ نفرت حسبِ عادت مسلسل بول کر حسبِ فطرت شام غیبت منا رہا تھا، بجو جیسے لمبوترے منہ باہر نکلے دو پیلے دانتوں اور چھوٹی چھوٹی گول کمینی آنکھوں کے مجموعی تاثر سے کراہت کا احساس ہوتا۔ اس احساس میں اس کی جھینگر جیسی سمع خراش آواز کی کراہت اعصاب شکن تھی۔ بے حد پتلے غیر مردانہ لبوں پر اس کی چھپکلی جیسی لمبی زبان مسلسل پھرتی، زبان سے ہونٹ تر ہوتے تو زردی چمک کر مردہ مینڈک کے پیٹ جیسی رنگت اختیار کر جاتی۔ اس نے دوستوں کو اتنا آزار پہنچایا کہ اس کی رگوں میں دوڑتا خون زہر بن گیا۔ اسی لیے دوستوں کے حلقے میں پیار سے اسے بچھو کہتے تھے۔''

بچھو اور افسانہ نگار کے مابین بہت سے اختلافات کے پہلو ہیں اور سب سے بڑا ان کی کالج فیلو جو آخر کار بچھو کی بیوی بن جاتی ہے۔ ایک ایسی بیوی، جس کی سماجی کارگزاریاں مشکوک ہیں۔ افسانہ نگار اس فطرتِ خاص سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دن بچھو کی بیوی کو فون کرتا ہے۔ دونوں قدیم بے تکلف ہیں اسی لیے وہ ایک ہوٹل میں افسانہ نگار کو ملاقات کی دعوت دیتی ہے۔ افسانہ نگار بچھو سے اگلے پچھلے بدلے لینے کے لیے اسے بھی غائبانہ دعوت دے ڈالتا ہے۔ افسانہ، افسانہ نگار کی اس بدفطرتی پر ختم ہوتا ہے۔

''ہاں ہاں فلم ہی سمجھ لو۔ ایسی فلم کہ اگلی پچھلی تمام فلمیں بھول جاؤ گے، پابندیٔ وقت ضروری ہے۔''؟

آخر کار ایک شریف آدمی نے بچھو کو ڈس لیا ہے۔

بکری

زرینہ ایک بانجھ عورت ہے، جو گلی میں بندھی بکری کی دردِ زہ اور پیدائش کے عمل کو اپنے اوپر منطبق کر رہی ہے۔ وہ ہم گزاری کی کیفیت سے گزرتے ہوئے بکری اور اپنے وجود میں کوئی خاص فرق محسوس

نہیں کرتی۔ محلے کی تمام عورتیں ہی پیدائش کے اس عمل کو انسانی عمل کی طرح محسوس کر رہی ہیں اور بکری کی زندگی اور پیدائش کی آسانی کے لیے دعا مانگ رہی ہے۔ زرینہ کی ساس تو باقاعدہ ورد میں مصروف ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے زرینہ کے دماغ میں بکری کی کئی مشابہتیں گزرتی ہیں۔ کبھی اسے زیادہ بچے پیدا کرنے والی ساس بکری محسوس ہوتی ہے، کبھی بابو پہاڑی بکرا محسوس ہوتا ہے۔ بکری نے دو بچے جنم دیے ہیں دونوں بکریاں ہی ہیں۔ شوہر گھر آتا ہے اور زرینہ اس کا کھانا لے کر جا رہی ہے۔

''کمرے میں داخل ہوئی تو کمرہ کے ملگجے اندھیرے میں اس کی آنکھیں قصائی کی دکان پر رکھی ''سری'' سے مشابہ بے نور اور مکروہ آنکھوں سے چار ہوئیں اس نے سوچا کاش میں بکری ہی ہوتی اور اس نے کھانے کو گھاس کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے دیکھا۔''

جانوروں اور انسانوں میں فری سیکس کا تضاد افسانے کی بنیاد ہے۔ دوسری جانب عورت اور بکری کی مماثلت سے نظریہ، ضرورت پیش نظر رکھا گیا، بکری کی بکریاں فائدہ مند ہیں لیکن معاشرے میں عورت کا وجود بے کار اور بے معنی۔

نقلی چوکیدار

باپ بیٹی کی محبت اور احساسِ ملکیت کا افسانہ ہے۔ باپ خوشی خوشی بیٹی کا رشتہ طے کرتا ہے، اور پھر گھر سے بیٹی کی رخصتی کے خیال اور نئے آدمی کے تصرف میں آنے کے تصورات سے افسردہ ہوتا ہے۔ اس نے تمام عمر لڑکی کی چوکیداری کی اور آخری لمحے اسے اسی چوکیداری سے دست بردار ہونا پڑا۔ افسانہ اس فقرے پر ختم ہوتا ہے:

''یہی یہی کہ وہ حرام زادہ اس وقت میری پھول جیسی بچی کے ساتھ کیا کچھ نہ کر رہا ہوگا۔''

جن ہتھیلیوں پر سرسوں پھولتی ہے

مصنف آزاد خیال لڑکی اور باپ کے دستِ شفقت تلے سدھائی ہوئی دو لڑکیوں کی کہانی بیان کر رہا ہے، تینوں کا مقصد مصنف کو شیشے میں اتارنا ہے۔ طریقہء واردات مختلف ہے۔

مثلث کا زاویہ

احمد اپنی کزن نجمہ سے دست درازی کی کوشش میں ایک تھپڑ کھاتا ہے۔ ہزیمت دور کرنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے اور ہوٹل میں جا بیٹھتا ہے، جہاں اسے شبیر ایک لڑکی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ لڑکی اس کی منگیتر نجمہ نہیں بل کہ ایک شادی شدہ چالو عورت ہے، جس کا شوہر آڑھتی ہے۔ شبیر کہتا ہے کہ اس کے ایسی کئی عورتوں سے تعلقات ہیں جو خود اس پر رقم خرچ کرتی ہیں، احمد رشک اور حسد میں مبتلا ہے کہ اسے باہر بھی عورتیں دستیاب ہیں اور گھر پر بھی ایک وفادار منگیتر اس کی منتظر ہے۔ وہ ان خیالات کا اظہار اپنے ایک دوست سے کرتا ہے، پھر اعتراف کرتا ہے کہ میں نے بھی بچپن میں اسے بہت تنگ کیا ہے۔ میں اس کے کھلونے توڑ دیا کرتا تھا اور بعض اوقات تو رات کو اٹھ کر اس کے بستر پر پیشاب بھی کر دیتا تھا۔ اس اعتراف کے ساتھ ہی وہ نارمل ہو جاتا ہے، کیوں کہ بہر حال شبیر کی منگیتر نجمہ بچپن میں اس کے ساتھ ابا اماں کا کھیل کھیلتی رہی تھی۔

بیلنس شیٹ

ایک کالم نگار، عورتوں کی دو اقسام پر کالم لکھ رہا ہے۔ اس کالم میں معاشرتی معاملات سے زیادہ جنسی معاملات کی مقابلہ آرائی ہے۔ اچانک بیوی کی اوقات چونکاتی ہے وہ کالم کو دو ٹکڑوں میں منقسم کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینکتا ہے اور بیوی کی جی حضوری کے لیے اٹھ کر اس کے ساتھ ''نوکر ووہٹی کا'' فلم دیکھنے چلا جاتا ہے۔ عورتوں کی کتنی بھی اقسام کیوں نہ ہوں ۔۔۔ بیوی سب سے بڑی اور مستند قسم ہے، محبوبہ، داشتہ اور دوسرے روپ آنے جانے ہیں۔

مس احمد بی۔ اے بی ٹی

ڈاکٹر سلیم اختر کے مقبول ترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ یہ افسانہ کنواری استانیوں، ان کی سہیلیوں اور شاگردوں کے گرد گھومتا ہے۔ ہم جنسیت کے رجحان کا یہ افسانہ بڑی چابکدستی سے بنا گیا ہے، آدمی کو اپنے اوپر حرام قرار دینے والی مس احمد آخری لمحے اعصابی پژمردگی کا شکار نظر آتی ہے۔

لمحات کی گریز پائی اسے ایسے مقام پر لے آئی ہے:

''آئینہ بتاتا ہے کہ تو وقت کی بازی ہار چکی ہے اور یہ ہاری ہوئی مس احمد بی اے بی ٹی خود کو لڑکیوں کے سمندر میں ایک ویران اور بے برگ و بار جزیزہ محسوس کرتی ہے۔ شریر اور چنچل لہریں آتی تو ہیں مگر واپس جانے کے لیے۔۔۔ جزیرہ پیاسا ہی ہے۔''

سیفو

افسانے کا نام یونانی شاعرہ سیفو کے نام پر رکھا گیا ہے جو ہم جنسیت کے باعث ایک علامت تصور کی جاسکتی ہے۔ دو سہیلیوں اور ایک مرد کی مثلث افسانے کو آگے بڑھاتی ہے۔ ہیرو ایک لڑکی سے ملتا ہے جو اسے اپنے بحث مباحثے، نفسیاتی طرزِ استدلال اور بوجھل اصطلاحات سے بہت مرعوب کرتی ہے۔ وہ اس دانشور لڑکی کے حصول کے لیے اس کی سہیلی گلشن کو وسیلہ بنانا چاہتا ہے جو ان سوشل اور بور ہے، مصنف رہیرو دونوں لڑکیوں کو شیشے میں اتارنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

گلشن رو رو کر اپنی سہیلی شہناز کو اس مردانہ محبت سے باز رکھنا چاہتی ہے اور آپس کی شدید محبت اور وعدے وعید کا تذکرہ کرتی ہے اور آخر کار شہناز کو چیلنج دیتی ہے کہ وہ اس سے زیادہ خوبصورت اور سیکسی ہے چناں چہ اپنی قربانی دے کر اسے اس مردانہ محبت سے محفوظ رکھے گی۔

بنجر مرد زرخیز عورتیں

کہانی کا ہیرو ایک مجہول، بےزار، بے ثمر اور لاتعلق کردار ہے، جسے کسی بھی شے سے کوئی محبت نہیں۔ وہ اپنے اندر کچھ جنسی کمزوری بھی محسوس کرتا ہے، اسے جنسی گرما گرم چھپٹے ناول پڑھنے کا شوق ہے، یہی ناول پڑھ پڑھ کر وہ اپنی بیوی کو لبھانا چاہتا ہے مگر یوں لگتا ہے اس شریف عورت کو اس کی جسمانی کمزوری سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ ہر حال میں ایک خدمتگار بیوی اور اطاعت شعار بہو ثابت ہو رہی ہے۔ ہیرو کی ماں اٹھتے بیٹھتے پوتے کی پیدائش کا رونا روتی ہے، لیکن ہیرو اپنی کمزوری کے باعث یہی کہے جاتا ہے کہ

وہ اپنی بیوی سے مطمئن ہے۔ آخر ماں بہو کو دوسری شادی کے لیے منا لیتی ہے۔ بیوی شوہر پر زور دیتی ہے کہ وہ ماں کی خواہش پوری کرے، اس کارِ خیر کے لیے وہ اپنی خدمات پیش کرتی ہے اور اپنی ایک استانی جو ملازمت پیشہ ہے سوکن کی حیثیت سے بیاہ لاتی ہے۔ گھر میں خوشحالی، امن، اتفاق اور خدمت کی ریل پیل ہے کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ اُدھر ہیرو دونوں بیویوں کے اتفاق سے مطمئن ہو کر سارا سارا دن دوستوں میں گھر ارات رات بھر میں پڑھے ناولوں کے واقعات میں حسب توفیق رنگ آمیزی کے بعد محفل گرماتا رہتا ہے اس کی گفتگو بارہ مصالحے کی چاٹ بنتی جاتی ہے اس کے ذہن سے بیوی پر سوکن لانے کا احساسِ جرم بھی محو ہو گیا۔

لیکن کہانی کے اختتام پر پردہ اٹھتا ہے اور اسے تعلقات اور اتفاق کی ثمر باری کی بنیادی وجہ سے آگاہی ہوتی ہے۔

> ''ایک دن وہ خلافِ معمول دوپہر کو گھر آیا تو باہر کا دروازہ کھلا تھا، ماں گھر میں نہ تھی، کمرہ میں آیا تو بستر کچھ مشکوک سا لگا، رضائی الٹائی تو دونوں سوتنیں لیٹی پڑی تھیں''

لولیتا

خان صاحب کی بڑی بیٹی پکی عمر کی کنواری دوشیزہ ہے جسے مرد سے محبت کی آرزو ہے اور فی الحال وہ ''زبانی جنس'' پر اکتفا کیے ہوئے ہے۔ اصغر خان صاحب کی بیٹھک کا کرائے دار ہے، میٹرک پاس ہے جنسی کشش کا مالک ہے، معمولی فرم میں معمولی تنخواہ پر ملازم لیکن اس کے معاشقے اس کے لیے وہی کرتے ہیں جو اسکول ماسٹر کے لیے ٹیوشن۔ عمر بتیس سال ہے، خان صاحب کے گھر میں ایک چھوٹی عمر کی ملازمہ لعل بی بی ہے، جسے سب لالی لالی کہتے ہیں۔ کنواری دوشیزہ زرینہ اور اصغر کے مابین رقعے بازی اور پیغام رسانی کا واحد ذریعہ لالی ہے، جسے دونوں جانب سے پپی بھی ملتی ہے اور چونی بھی، لالی ان چونیوں اور پپیوں کے دوران میں اچانک بڑی ہو گئی اور ان چھوٹی رشوتوں کے مقابلے میں بڑے کارنامے کی خواہاں ہے۔

> ''اُس نے دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑوانے کا تہیہ کر لیا ہے''

متوازی خطوط

شرف النسا اور جمیلہ کی نفسیاتی الجھنوں، اشتباہات اور جنسی خواہشات کے آدھے اعتراف کا افسانہ ہے۔ ایک طرف شرف النسا تخلیقت کے خواب دیکھتی ہے اور ایک ایسے انڈے کی اعصابیت کی شکار ہے جو اس میں بیک وقت کراہت اور بلاوے کے جذبات مشتعل کرتا ہے:

"یہ دنیا کا اختتام ہوگا، یہی قیامت ہوگی۔۔۔ اچانک پن چبھنے پر غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے ایک عجیب خواہش سر ابھار رہی تھی۔ اس انڈے کے اندر چلی آؤ، یہ انڈا نہیں کچھ اور ہے یہی جنت ہے، یہی پناہ گاہ ہے۔"

خواب نے شرف النساء کو دہلا دیا تھا۔ انڈے کے تصور اعصابی کھجلی میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس نے سوچا خواب جمیلہ کو بتائے گی، جو تعبیر کو فرائیڈ کی تھیوری میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اذان ہو رہی تھی وہ حمیدہ کے خالی بستر کے قریب پڑے، اس کے جوتے پہن کر باہر نکل گئی اور بدن پر ٹھنڈے پانی کی پھوار سے اپنے آپ کو آسودہ کرنے لگی۔

جمیلہ کا ظہور ہوتا ہے، مردانہ نائٹ سوٹ میں، اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے، جبیں بھری بھری شرف النساء جوشِ جذبات سے اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جمیلہ اسے تحلیل کرنے والی نگاہوں سے۔۔۔ وہاں کچھ نہیں، شاید شرف النسا صرف بش شرٹ اور پیروں میں الجھے پاجامے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔۔۔ جمیلہ لوٹا لیے عجیب انداز سے طہارت خانے کی طرف جا رہی ہے، شرف النسا لاحول پڑھتی ہے اور وضو کرنے لگتی ہے۔

جنس کی خواہش میں ڈوبے ہوئے، جنس سے گریزاں یہ کردار ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں کا خاصا ہیں۔۔۔ دو متوازی لکیریں جو ساتھ ساتھ چلتی ہیں مگر ان کا ملاپ نہیں ہوتا۔

تختۂ مشق

احمد علی نیا نیا بی اے بی ٹی کر کے بستی کے ایک سکول میں آیا ہے، جہاں وہ امتیاز کے ساتھ ساتھ اس کی غبی بہن کو بھی ٹیوشن پڑھانے پر مامور ہوا ہے۔ مولوی اکبر نے اسے بیٹی کی ٹیوشن پر رکھتے ہوئے قسم دی ہے کہ ان کی عزت کو داغ نہیں لگنا چاہیے۔ احمد علی وعدے کا پاس کر رہا ہے، لڑکی رقیہ اور اس کی ماں احمد

علی کو شادی کے لیے گھیرنے کے چکر میں ہیں، لیکن وہ پیش قدمی پر تیار نہیں۔ ایک دن وہ رقیہ کی کتاب میں ایک ایسا خط پڑھ لیتا ہے، جس میں اس کی شرافت کو بزدلی قرار دیا گیا ہے اور اسے نامردی کے طعنے دیئے گئے ہیں۔ احمد علی کی انا بے دار ہو جاتی ہے وہ کسی نہ کسی طرح اس بے عزتی کا انتقام لینا چاہتا ہے لیکن اپنے وعدہ کا بھی اسیر ہے۔ آخر کار وہ یہ انتقام مولوی اکبر کی بیٹی کے بجائے ان کے بیٹے امتیاز سے لے لیتا ہے۔

''اگر۔۔۔تم میری بات مان جاؤ تو میں امتحان میں تمہیں فرسٹ کرا دوں گا۔''

جنسی انتقام کی یہ شکل اپنے اندر پہلے سے کئی پیچیدگیاں اور سہولتیں رکھتی ہے کہ اس میں بظاہر ''عزت سادات'' کے جانے کا خوف نہیں۔

خبیث دا پتر

پی ٹی ماسٹر جو سکول سے پہلے اپنے حوالدار باپ کے توسط سے کچھ دیر پولیس کی وردی میں گھومتا رہا تھا۔ ٹریفک کانسٹیبل کی ملازمت راس نہ آئی تو پی ٹی ماسٹر ہو گیا، جس کے پاس چند روپوں، چند کپڑوں اور مونچھوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ماسٹر ہمہ وقت اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے اور وہ دل میں کڑھتا، اُدھر ہیڈ ماسٹر بھی اس کی بے عزتی میں برابر کا شریک تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہیڈ ماسٹر کے گھر کو آگ لگا دیتا اور اس کی کالی لڑکی کو چھت سے نیچے دے پٹختا۔ اس کے بیٹے کا مار مار کر بھر کس نکال دیتا، ایک دن ہیڈ ماسٹر کا بیٹا اسے کسی کام سے بلانے آیا اور بولا اماں نے بلایا ہے۔ وہ اسے گھورتا رہا اور سوچتا رہا یہ سوکھا مریل سالڑ کا بھی اسی کتے کا پلا ہے۔ اب اس کے ذہن میں نیا خیال آیا، وہ ایسا ارادہ باندھ رہا تھا کہ سب کچھ تباہ ہو جائے۔

اس نے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور بولا

''اوئے خبیث دے پتر ! جے تو چوں وی کیتی تے تیریاں ہڈیاں توڑ دیاں گا۔۔۔''

پابندی وقت کے فوائد

اس کا بنیادی موضوع بھی ہم جنسیت پرستی ہے۔ ماسٹر عنایت آٹھویں جماعت کو پابندی وقت کے فوائد گنوا رہا ہے، اتنے میں اقبال کلاس میں آتا ہے تو استاد اس سے پوچھتا ہے تم دیر سے کیوں آئے ہو، وہ جواب دیتا ہے اقبال ہمیشہ دیر سے ہی آتا ہے۔

ماسٹر صاحب فقرہ کے مزے لے رہے ہیں پھر جوش میں آ کر اس فقرے کی وضاحت مانگنے لگے ہیں ایک دن ماسٹر صاحب کی آنکھیں اگلی صف میں بیٹھے اقبال کے کندنی چہرے پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ ماسٹر صاحب کی بے تابی دیکھ کر تجربہ کار لڑکے کھی کھی کرنے لگتے ہیں۔ ماسٹر جی اقبال کو شیشے میں اتارنے کے لیے مفت ٹیوشن پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اقبال میں ایک کم شکل اقبال بھی ہے جو اکثر تشدد کا نشانہ بنتا ہے لیکن ماسٹر عنایت کا دل خوبصورت اقبال کے نرم گرم جسم پر اٹکا ہوا ہے۔ اچانک ماسٹر عنایت کی بیوی لڑ جھگڑ کر چلی جاتی ہے۔ میدان صاف ہے وہ ایک بار پھر اقبال کی طرف متوجہ ہیں اور اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اقبال گریزاں ہے۔ ایک دن اقبال کو واقعی کلاس میں آتے ہوئے دیر ہو جاتی ہے۔ ماسٹر عنایت اسے مرغا بننے کی سزا تجویز کرتے ہیں اور اس کی مضحکہ خیز حالت پر آسودگی محسوس کرتے ہیں۔ اقبال کا راز دار ماسٹر جی کو دل ہی دل میں گالیاں دیتا ہے۔

ماسٹر عنایت اسے کھڑا ہونے کا حکم صادر کرتے ہیں اور خشونت آمیز لہجے میں چھڑی ہلاتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''تم ہمیشہ ہی دیر سے آتے ہو، پھر تو دیر سے نہیں آؤ گے۔ جاؤ بیٹھ جاؤ،' اقبال
> ناک صاف کرتے ہوئے خاموشی سے بیٹھ جاتا ہے۔

ماسٹر عنایت شروع کیے ہوئے سبق کو وہیں چھوڑ کر نئے سرے سے پابندیء وقت کے فوائد گنوانے لگتے ہیں۔

بارھواں کھلاڑی

ہاکی ٹیم بنائی گئی ہے جس کا بارھواں کھلاڑی کھیل میں تو مشاق نہیں۔ البتہ اس کی کم عمری اور زنانہ پن محلِ نظر ہے۔ ٹیم کے لڑکے شروع شروع میں اس کا مذاق اڑاتے اور آوازے کستے ہیں، بارھواں

کھلاڑی ہمہ وقت ماسٹر صاحب کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ ٹیم ہار جاتی ہے اور افسردہ ہے، واپسی کے دن ماسٹر صاحب کو پرانا دوست ملتا ہے اور انھیں اپنے گھر لے جاتا ہے، آج ماسٹر صاحب نہیں اس لیے ان کے کمرے میں کپتان نے ڈیرا جمالیا ہے۔

''نئی بات یہ ہوئی کہ ماسٹر صاحب کے مانند کپتان کو کنڈی بند کرنی یاد نہ رہی۔ پھر نہ جانے کیسے اندھیرے میں ایک ایک کھلاڑی کی آنکھ کھلتی چلی گئی۔ اگلی صبح اسٹیشن پر ہر کھلاڑی معمول سے زیادہ ہشاش بشاش تھا تمام کھلاڑی ہنس رہے تھے۔۔اگر چپ تھا تو احسان بارہواں کھلاڑی''

آگ تاپنے کے فوائد

ماسٹر بشیر احمد بی اے بی ٹی کی زندگی ہنگامہ خیز نہ تھی۔ ایک کلرک کا بیٹا جس نے میٹرک کے بعد کارپوریشن میں ملازمت کرلی اور ٹیوشن پڑھانے کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ امتحان پاس کرتا چلا گیا۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک چڑھ گئی اور ہیڈ ماسٹر کی خوشامد نے پورا وجود جی حضوری میں ڈبودیا۔ آخر بڑی دھوم دھام سے شادی کی گویا زندگی کی معراج پالی۔ شادی کے ابتدائی ایام بہت اچھے گزرے وہ دوستوں کی محفل میں بیوی کی تعریف میں ''ہز ماسٹر وائس'' بنا رہتا۔ اپنی شاندار زندگی پر لوگوں کو رشک کرتے دیکھ کر اسے بیوی سے چڑ ہونے لگی۔ آخر ایک بار وہ سکول کے لیے کھیلوں کا سامان خریدنے لاہور گیا۔ کمیشن کے طور پر کچھ رقم بچ گئی، وہیں اسے اس کا ایک پرانا دوست اسلم مل گیا جو انشورنس ایجنٹ بن کر امیر آدمی بن چکا تھا۔ اس نے ماسٹر کو مشورہ دیا کہ کمیشن کی یہ رقم عیش کرنے پر خرچ کرنی چاہیے۔ چناں چہ وہ اس کی ملاقات کرانے ایک عورت کے پاس لے گیا۔ بھاؤ تاؤ کے پیسے لیے اور رفو چکر ہو گیا، ازاں بعد پتہ چلا کہ وہ ماسٹر کو اپنی بیوی سونپ گیا ہے۔ ماسٹر اس تجربے سے جھجک کر گزرا، لیکن جب اس گھر سے نکلا تو بہت بااعتماد تھا۔ اس نے اپنی بیوی کے لیے ایک سوٹ کا کپڑا خریدا اور مطمئن ہو کر سینہ تان تان کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔

یہ افسانہ ابتدائی طور پر ''زن مرید'' کے نام سے ڈاکٹر سلیم اختر کے پہلے افسانوی مجموعے کڑوے بادام میں شامل ہے۔

پاؤں کی جنت

ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے عورتوں کے سراپے میں سب سے زیادہ دلچسپی پاؤں سے ہے۔ پاؤں گویا اس کے لیے ہیج کا کام دیتے ہیں اور اس کی شخصی تکمیل پاؤں کے وصال سے مشروط ہے۔ خواب میں اس نے ہاتھی کے پاؤں دیکھے تھے، جو چکنی مٹی کی طرح گندھتے ہوئے جسم کی پسلیاں توڑ دیتے تھے۔ ہاتھی کہیں نہیں تھا بس اس کے بڑے اور بھدے پاؤں، وہ اس کچلے جانے کی سرشاری میں مبتلا تھا۔ وہ جب کبھی اپنی مریض ماں سے دور نوکری کے لیے آتا اسے ایسے ہی خواب گھیر لیتے۔ پاؤں اس کے اعصاب پر سوار ہو چکے تھے۔ موہنے پاؤں دیکھ کر اس کا دل ناچ اٹھتا، اس کے خیال میں عورتوں کو صرف ایسی چپلیں پہننی چاہیں تھیں، جس میں ان کے پاؤں دعوتِ نظارہ دیں۔ اس کا اور پاؤں کا ساتھ بچپن سے تھا۔ اس کی ماں کو معمولی بخار ہوا اور اس کے پاؤں سوجنے لگے حتیٰ کہ وہ چلنے پھرنے سے عاری ہوئی، ماں کے پاؤں تلے جنت تھی اور اس کے ننھے منے پھرتیلے پاؤں ہاتھی کے پاؤں جیسے ہو گئے تھے۔ کبھی اسے لگتا یہ پاؤں مکھن کے بنے ہیں کبھی ایڑیاں مرمریں گیندوں جیسی لگتیں۔ میٹرک میں اس نے ڈرائنگ کا مضمون پڑھا تو فرصت میں پاؤں بناتا رہتا۔ ایک مرتبہ ماسٹر نے میرا نصب العین پر مضمون دیا تو اس نے جوتوں کی دکان کھولنے کا ارادہ لکھ دیا۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں وہ اعتراف کرتا کہ وہ عورتوں کے پاؤں سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک دن وہ اپنے دھیان میں چلا جا رہا تھا اس نے سیاہ لفٹی میں مقید پاؤں دیکھے اور تعاقب شروع کر دیا۔

ایک دن ایک عورت زبردستی اس کے گلے پڑ گئی وہ بس اسٹاپ پر اکیلی تھی۔ پاؤں بہت اچھے تھے۔ اس نے اسے دیکھا، اس نے اسے، دونوں اس کے کمرے تک آن پہنچے۔ کمرے کی دیواروں پر پیروں کی تصویریں دیکھ کر عورت نے پوچھا تم جوتے بناتے ہو۔ وہ عورت اپنی قمیص اتارنے لگی تو اس نے اسے روک دیا۔ چارپائی پر بیٹھ کر بڑے انہماک سے اس کے سینڈل اتارے اور ایک فن کار کی مانند نیم وا آنکھوں، کھلے ہونٹوں اور تیز سانسوں سے پہلے پیروں کو دیکھتا رہا پھر دیوانہ وار چومنے لگا۔۔۔ آج پیروں کی تلاش ختم ہو گئی تھی۔

بیاہتا کمبخت Conjugal sex

مصنف اسے ایک بدذائقہ، روزمرہ کی معمولی کارکردگی قرار دیتا ہے۔

ضبط کی دیوار

(ناولٹ)

''ضبط کی دیوار'' ناولٹ ہے یا طویل افسانہ ہے، اسے ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں کے ہمراہ پڑھنا چاہیے یا اس کی بنیادی وحدت انفرادی مطالعے کا مطالبہ کرتی ہے؟۔ نرگس اور کیکٹس کے مجموعے میں اس کی شمولیت اس قسم کے مباحث سے مبرا ہو چکی ہے۔ مصنف اور اس کے ناشر نے کتاب کی درجہ بندی میں اسے آخری تحریر کا درجہ دیا ہے۔ کتاب اگر الٹی طرف سے شروع کی جائے تو اینٹی کلاک وائز نتائج بھی مختلف ہو سکتے ہیں، البتہ ایک بات طے ہے کہ افسانہ نگار نے آغاز میں اسے ایک انفرادی تحریر کی حیثیت سے ہی شائع کیا تھا اور مکتبے کا نام تھا مکتبہء عالیہ، لاہور، سن اشاعت ۱۹۷۷ء۔ ۱۹۸۰ء میں اس کا ہندوستان میں ہندی ترجمہ ہوا۔ ۱۹۸۳ء میں نصرت پبلشر لکھنؤ نے اس کا اُردو میں ایڈیشن شائع کیا۔ ۱۹۸۹ء میں ماورا پبلشر سے دوسرا اور ۱۹۹۵ء میں گورا پبلشر نے تیسرا ایڈیشن شائع کیا، اس ناولٹ پر ملک کے مایہ ناز رسائل اور افسانہ نگاروں نے بھرپور تبصرے کیے۔

کہانی کا آغاز، ارتقا اور انجام مصنف کے شعوری نظام کی گرفت سے اس قدر شناسا ہے کہ مشکل ترین لمحات میں بھی ڈاکٹر سلیم اختر لفظی اور احساساتی بریک مار کر، اس کی رفتار کم کرنے میں کامیاب ہیں۔ اس افسانے کی نفسیاتی الجھنوں کو سمجھنے کے لیے سلیم اختر کے ہی دو افسانے ''ماں بیٹا'' اور ''نقلی چوکیدار'' کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ جذبے کی منتقلی اور جذبے کی رکاوٹ دونوں انتہائیں، ہمیں یہ بھی سمجھاتی ہیں کہ شریف بچے بیٹا بننے کے قابل ہی ہوتے ہیں، انھیں زبردستی مرد نہیں بنایا جاسکتا۔ نیکی اور مسلسل نیکی کا انجذاب حاجی صاحب کے بیٹے ارشد کو جذبے کی رکاوٹ اور جذبے کے فشار کی دونوں صورتوں میں متلی، کراہت، گناہ اور بے زاری کے ثمرات ہی عطا کرتا ہے، آسودگی کی دولت نہیں، یہی ہے بزرگوں کی عائد کردہ نیکی کا حاصل۔ ذرا ''پاؤں کی جنت'' والے خیر خواہ بیٹے کے انجام پر نگاہ ڈالیے:

''اس نے شلوار کے پائنچے پنڈلیوں تک اٹھا دیے۔ اس کا اندازہ غلط نہ تھا

متناسب پنڈلیاں دو خوبصورت پاؤں پر آ کر ختم ہوتی تھیں۔ وہ ایک لمحہ کو کسی فنکار کے مانند انھیں نیم وا آنکھوں، کھلے ہونٹوں اور تیز سانسوں سے دیکھتا رہا اور پھر انھیں دیوانہ وار چومنے لگا۔"

اب ذرا "ضبط کی دیوار" کی طوائف پر نگاہ ڈالیے۔

"وہ حیرت زدہ منہ اٹھائے اُسے دیکھ رہا تھا کہ وہ اس پر جھکی۔۔اس نے منہ سے نکلی سانس کی نمی اور بو کو چہرے پر محسوس کیا۔۔۔معاً دونوں ہاتھوں کے دباؤ نے اسے اٹھنے نہ دیا۔۔۔وہ تم ایسا تھا۔۔۔تم ایسا ہی تھا۔ میرے چاند، میرے بچے۔۔۔مگر اب وہ اس کی بانہوں کے شکنجے میں تھا، وہ اسے دیوانوں کی طرح لپٹا رہی تھی۔۔وہ بھی تم جیسا ہوتا میرا اکبر۔۔۔وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا، ٹانگیں پھیلائے وہ اسے غصے سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ارشد کنڈی کھول کر بگٹٹ بھاگا جا رہا تھا۔"

اپنی ہی ذات کی قید اور ذات کی رہائی کا تیسرا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔

سلیم اختر نے ماں اور بیٹے، مرد اور عورت، نیکی اور گناہ کے تضادات کی اس کہانی کو بہت خوبصورتی سے پروان چڑھایا ہے، ہیرو ارشد حاجی محمد اشرف صدیقی کا صاحبزادہ ہے، جو ایماندار تاجر ہیں، نماز روزے کے پابند، متمول آدمی، جنھیں محلے کی مسجد کمیٹی کا چیئرمین بنایا گیا ہے، جو لوگوں کے چندے سے مسجد کی بہتری کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کے بھی دعویدار ہیں کہ اللہ کے نام پر خرچ کا ڈھنڈورا نھیں پیٹنا چاہیے۔ ارشد کی ماں بھی نہایت پرہیز گار عورت ہے، جو گھر سے رخصت ہوتے وقت ارشد اور اس کے ابا پر دم پڑھ پڑھ کے پھونکیں مارتی ہے۔ شومئی قسمت سولہ سترہ سالہ ارشد فرسٹ ائیر میں داخلے کے بعد کچھ ایسے لڑکوں کی صحبت اختیار کرتا ہے، جو بہت شوخ و شنگ ہیں اور نت نئے تجربات کے متوالے۔ اس قوال پارٹی کا انوکھا تجربہ ایک طوائف سے ملاقات اور مردانگی کے اسرار ورموز سیکھنا ہے اس تجربے میں ارشد طوائف کے مضحکہ خیز رویے اور اپنے ڈر سے ناکام رہتا ہے اور شرمندگی محسوس کرتا ہے اس کا دوست سرفراز اسے باور کراتا ہے کہ طوائف اسے یاد کرتی ہے۔ شاید اسے ارشد سے عشق ہو گیا ہے۔ ارشد کو سٹوڈنٹ کنسیشن دینے والی طوائف سے دوبارہ رجوع

کرنا چاہیے تا کہ اس کا اعتماد بحال ہو سکے۔ آخر ارشد دوسری بار پل کے پار اسی گلی میں پہنچتا ہے۔ اپنے آپ کو اس بدبودار ماحول کا حصہ بنانے کے لیے، لیکن طوائف اسے اپنے بیٹے کا نعم البدل سمجھ کر اسے نصیحتیں کرنے لگتی ہے اور اس گناہ آلود زندگی سے بچنے کی ترغیب دیتی ہے ارشد دوسری بار کی ناکامی اور اپنی تذلیل پر میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔

یہیں مصنف نے ایک اور باریک سا اشارہ رکھا ہے جو حاجی محمد اشرف صدیقی کے ماضی کا استعارہ بھی ہو سکتا ہے۔

''تم شریف آدمی کے بیٹے ہو۔۔بل کہ حاجی کے۔۔تمہاری ماں ہے۔۔اور کتنے بہن بھائی ہیں۔۔۔''

کون جانے حاجی محمد شریف بھی کبھی دیوارِ سلیم کے اس پار گئے ہوں۔۔۔اور طوائف اسی رشتے کے ناطے ارشد کو خالی ہاتھ لوٹا رہی ہو۔

افسانے کی کردار سازی، زبان و بیان، جزئیات نگاری قابلِ ستائش ہے۔ اسی وجہ سے یہ نیم جنسی، نیم اخلاقی، نیم معاشرتی، نیم نفسیاتی افسانہ ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھنے اور فکر کرنے کے لائق ہے۔

''جرسِ غنچہ'' کے افسانے

سلیم اختر کے ۲۰۱۲ء میں شائع ہونے والے مجموعے جرسِ غنچہ میں درج ذیل افسانے شامل ہیں۔
سنڈریلا، شکار، 'Color Blind'، بلی، تارا مسیح کا خاندان، آئینہ تمثال دار تھا، خوشبو کا غلام، کوہ بے اماں، جرسِ غنچہ، مقدر ساز، 'Conjugal sex II' الزائمر، مردم گزیدہ، خشوع وخضوع وغیرہ۔
زیادہ تر افسانے ڈاکٹر سلیم اختر کے انھی خیالات کی تکرار ہیں، جنھیں وہ مستقل پیش کرتے چلے آ رہے ہیں، موت کا خوف اور بلاوہ۔ کچھ افسانے لطیف طنز اور معاشرتی کج روی کا ذائقہ لیے ہوئے ہیں او رکچھ معصومانہ حیرت کی عیاری، یہاں فرداً فرداً ان افسانوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سنڈریلا

شہزادی کی گم شدہ جوتی اور شہزادے تک کی رسائی کو اس افسانے میں ایک اور سطح پر متعارف کرایا گیا ہے۔ متوسط مسلم گھرانے کی پکی عمر کی لڑکی تیس برس کی ہو چکی ہے، سکول میں پڑھاتی ہے اور شکل بھی ٹھیک ہے لیکن پاؤں بہت بڑے ہیں، نو نمبر کا جوتا پہنتی ہے اور اسی وجہ سے اس کی شادی ہونا مشکل ہو چکا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے پاؤں رگڑ رگڑ کر چمکاتی اور انھیں خوبصورت بنانے کے منصوبے بناتی رہتی ہے۔ آخر کار اس کی موتی دار جوتی کا ایک پاؤں کہیں راستے میں رہ جاتا ہے وہ خواب بنتی ہے کہ یہ جوتی کسی شہزادے کے ہاتھ لگے گی اور ایک دن وہ مرسڈیز میں بیٹھ کر اس خوبصورت جوتی والے پاؤں کی تلاش میں اس کے گھر تک پہنچے گا۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے، گلی میں ایک رکشا کھڑا ہوتا ہے، مرسڈیز والے ماں بیٹا راستہ بھول چکے ہیں، اس کے اعصاب میں ارتعاش ہے اور بستر سسکیوں سے ہل رہا ہے۔

شکار

جاگیر کا اکلوتا وارث اور والدین کا چہیتا کالج کی لائبریری میں جم کاربٹ اور کینتھ اینڈرسن کی شیر

کے شکار سے متعلق کتابیں پڑھتا ہے تو اس پر ایک نئی دنیا منکشف ہوتی ہے۔ شکاری بننے کا شوق جسم کو سنسنی سے لبریز کر دیتا ہے۔ وہ سارا سارا دن جنگلوں میں گھومتا اور شوق شکار میں شیر اور چیتے سے پاک جنگل میں پرندوں پر طبع آزمائی کرتا، آہستہ آہستہ اسے ماہر نشانہ باز تسلیم کر لیا گیا۔ ایک دن وہ مچان پر بیٹھا تھا کہ اسے آہٹ کا احساس ہوا، لیکن یہ تو صرف بکری تھی، بکری سے اسے بکری کی شکل والی پاگل لڑکی یاد آ آئی جسے بستی کے لوگ گھیرے ہوئے تھے وہ لڑکی انسانوں سے بھاگ کر جنگل کو دوڑی۔ اس نے اپنے دوستوں سے پوچھا اسے جنگل سے ڈر نہیں لگتا، دوست بولا:

''اصل ڈر تو انسانوں سے ہے، جنگل اور اس کے جانوروں سے کیا ڈرنا؟''

ایک دن اس نے دیکھا وہ لڑکی بکری سے کھیل رہی تھی۔ سٹوپڈ گرل وہ منہ میں بڑبڑایا اور درخت سے نیچے اترنا شروع کیا، پگلی نے اسے پہچان کر غوں غاں کی، اب وہ اس کی گرفت میں تھی مگر وہ اس سے چمٹا جا رہا تھا۔ اس کھینچا تانی میں وہ گھاس پر گر گئے اور پھر ایک دھاڑ۔ شیر ان کے سر پر تھا۔

Color Blind

پاکستانی معاشرے میں یورپی لڑکیوں سے شادی کو خوش قسمتی سمجھا جاتا ہے، خاص طور پر ان کی سفید رنگت کی وجہ سے۔ یہ بھی ایسا ہی افسانہ ہے۔ ایک عزیز اور اس کی نو بیاہتا کا انتظار ہو رہا ہے اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں بھی، آخر جشن اترتی ہے، امریکہ میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے کی گئی شادی پر مقامی عزیز کا فقرہ قابل توجہ ہے۔

''یہاں کیا کالوں کی کمی تھی جو ایک اور کو لے آیا۔''

بلی

قربان گاہ اور اس کے قوانین وضوابط پر لکھا گیا، دلچسپ افسانہ ہے۔ مہا پجاری گڑاھ کے سامنے، بت بنا، کھولتے تیل میں دھمال ڈالتے بلبلوں کو دیکھتے ہوئے، ان کی گپت بھاشا پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گرو، چیلے، داسیاں سب کھڑے ہیں۔ وہ رلجہ سے کہتا ہے بلی یا تو اس کنیا کی دی جاتی ہے جس کی نتھ کا موتی نہ پرویا گیا ہو یا تازہ جنم لیے بچے کی یا کسی بڑے پرش کی، رلجہ لرز گیا۔ بچے کی صورت جانی پہچانی

تھی اسے یاد آیا اسی طرح کا بچہ سنگھاسن کے دعوی دار بھائی کے ہاں پیدا ہوتا تھا۔ باپ بیٹا دونوں راجہ کے ہاتھوں مرے تھے اور پھر سب کچھ ایک چھن میں ہوگیا۔ ایسا چھن جس میں سے مر کر دوبارہ جنم پاتا ہے:

''بچے کی آنکھیں کھل رہی تھیں اور ساتھ ہی بند مٹھی بھی۔ بچہ اچھلا اور کڑاہ میں سے نکل کر راجہ کے سامنے آنے تک وہ بلوان بن چکا تھا۔ اس نے کسی بچے کی طرح لرزتے راجہ کو بازوؤں میں لیا اور اسے لے کر، ابلتے کڑاہ میں کود گیا۔''

تارا مسیح کا خاندان

ایک فوٹو گرافر کو اخبار کے لیے پھانسی کے بارے میں ایک سپلیمنٹ تیار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، تاکہ عوام کے جنرل نالج میں اضافہ ہو اور سنسنی پھیلے۔ فوٹو گرافر کو حیرت ہوتی ہے کہ پھانسی دینے والوں کی اپنی ایک دنیا ہے۔ سنسان راہداریوں میں کھڑے سنتری، پھانسی گھاٹ کے محافظ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل، سیاہ رنگ والا جلاد جس کا خاندان بھٹو کو پھانسی دینے کی وجہ سے شہرت اختیار کر گیا ہے اور اس کا نام تاریخ کی کتابوں میں ضیاء الحق کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ وہیں ایک سرخ فون موجود ہے، جس کی گھنٹی ایک لمحے میں موت کو زندگی میں بدل سکتی ہے۔ دو سنتری پھانسی دینے والے کو سہارا دیے لا رہے ہیں، جو بے حد نحیف و نزار ہے۔ مجسٹریٹ کا کام صحیح وقت پر پھانسی دلوانا ہے۔ ڈاکٹر سٹھتکوپ سے مجرم کی جانچ کر رہا ہے، کیوں کہ پھانسی دینے سے پہلے مجرم کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔ جلاد اس بات پر فخر محسوس کر رہا ہے کہ اس نے بہت سے لوگوں کو پھانسیاں دیں اور خوب پیسہ کمایا اور یہ کہ ضیا کے زمانے میں موج تھی۔

''پھانسیاں ہی پھانسیاں میرے بھائی تارا مسیح نے ان دنوں بڑا مال بنایا۔''

مجسٹریٹ اچانک اٹھا اور اس نے بالشتوں سے پھانسی پانے والے کو ناپنا شروع کیا تاکہ گلے کے پھندے کا سائز درست ہو سکے۔ مجرم مر چکا ہے۔ سنتری پھانسی پانے والے کو گھسیٹ رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے اپنی گھڑی سے اس کا جسم ساکت ہونے کا اعلان کیا ہے۔ عین اسی لمحے زندگی کی نوید دینے والے فون کی گھنٹی بجی ہے۔۔۔ افسوس پھانسی دینے والا خاندان جیت گیا ہے۔

آئینہ تمثال دار تھا

آئینہ تفصیلات اور جزئیات سمیت اسے بہت کچھ دکھا رہا تھا اگر چہ وہ خواب کے خوف سے آزاد تھا لیکن اب اس کے آئینے نے خواب منعکس کرنے شروع کر دیے تھے۔ خواب سے خالی گہری نیند میں ایک رات اس نے خود کو پھولوں سے بھری خوش منظر وادی میں پایا۔ یہیں وہ تو گل رخ، گل عذار، گل بدن، ابھی قربت کا شعلہ دہکنے ہی والا تھا کہ سہانا خواب گم گیا۔ وہ بستر سے اٹھا، آئینہ پر نگاہ پڑی۔ آئینہ بھی وہی چہرہ دکھا رہا تھا، لیکن اب گل رخ نے سرخ دوپٹے کی جگہ کفن اوڑھ رکھا تھا۔ تابوت پر عورتیں رو رہی تھیں، جنازہ اٹھایا جا رہا تھا۔ گل رخ کے بعد اسے اس کے جابر باپ کا چہرہ دکھایا، اس نے دیکھا فرشتے اسے لیے جا رہے ہیں اب سرد جہنم کی طرف، جسے وہ اپنے گناہوں سے گرمانے والا ہے۔ آنکھ کھلنے پر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ زندہ سلامت، دوزخ سے بچ نکلا۔ اسے لگتا وہ دوہری زندگی بسر کر رہا ہے، دن کی زندگی الگ اور رات کی زندگی الگ۔ آئینہ ان دو دنیاؤں کے درمیان پُل ہے۔ پھر اسے کتاب زیست کا ایک اور صفحہ یاد آیا، دلہن اور اپنی ناکردہ کاری کا خوف۔ رات ڈائن بن کر اسے اپنا نشانہ بنا رہی تھی۔ اسے اسی عالم خواب میں ماں نظر آئی، شفقت اور رحم کا تحفہ لیے:

> ”بیداری کے بعد دیر تک پلنگ پر لیٹا خواب کے مناظر ذہن میں دہراتا رہا۔ بالآخر اٹھا اور آئینے میں جھانکا۔ لمحہ بھر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، اگلے لمحے دیوار سے گر کر آئینہ کرچیوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہر کرچی اس کا وحشت زدہ چہرہ دکھا رہی تھی۔“

خوشبو کا غلام

لذتِ مرگ کا یہ افسانہ ایک مسافر کے گرد گھومتا ہے، جو کبھی حاتم کا میزبان رہ چکا ہے۔ بقول اس کے، اب وہ جانباز بس سارا دن، اپنے خیمے سے لیٹا رہتا ہے یا پھر خیمے سے باہر بیٹھا افق کو گھورتا رہتا ہے۔ ایک سیاہ پہاڑ کی چوٹی کی ہریالی اسے دعوتِ نظارہ دیتی ہے، وہ پہاڑ کا قصد کرتا ہے، لوگ کہتے ہیں مارے جاؤ گے، وہ کہتا ہے:

> ”درست! مگر اس خوشبو بھری موت میں جو لذت ہوگی اس پر کئی زندگیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔“

کوہِ بے اماں

موت کے منظر نامے کا ایک اور افسانہ ہے۔ اس کی حسین بیوی کہتی ہے۔ یقیناً میں مر چکی مگر اس کے باوجود میں فنا نہیں ہوئی۔ سانس کا رکنا، فنا ہونا نہیں۔ تم مجھے بستی کے مُردوں کے ساتھ دفن کرنے کے بجائے پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر مُردوں سے الگ، مُردوں سے دُور اور مردوں سے بلند مقام پر دفن کرو۔ بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیے وہ اسے بازوؤں میں اٹھائے پہاڑ کی طرف روانہ ہے۔ دشتِ بے اماں، راستہ سجھائی نہیں دیتا، تاریکی میں سیاہ پہاڑ پر پہلا قدم رکھنے والا وہ پہلا انسان تھا۔ رات بھر کا سفر ختم ہوا، چوٹی پر افق سے سورج طلوع ہو رہا تھا اس نے اپنی بیوی کی جانب دیکھا، چڑھتے سورج کی کرنیں بیوی کے چہرے پر گلال مل رہی تھیں، محبت اور اعتبار کا کوہِ بے اماں سر کر لیا گیا تھا۔

جرسِ غنچہ

موت کی خوشبو سے معطر ایک اور افسانہ۔ وہ قبرستان میں تھا، خوف کے ٹھنڈے پسینے سے جسم سرد تھا۔ اس قبرستان کے بارے میں بستی میں دہشت ناک قصے مشہور تھے۔ کالے کرتوں والے یہاں دفن تھے اور اب یہاں جن، بھوت، چڑیلیں، پچھل پائیاں بسیرا کرتی تھیں۔ قبرستان سے بستی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایک روایت تھی کہ یہاں کے پھولوں کی باس بے ہوش کر دیتی ہے اور درخت اچک لیتے ہیں۔ اب وہ اس قبرستان میں شکستہ قبر کے چبوترے پر بیٹھا تھا، اسے اچانک خیال آیا کہ بستی تو مطمئن، آسودہ لوگوں سے بھری پڑی ہے، اسے مہکتے لوگوں سے کیوں بدبو آنے لگی۔ اس بدبو کا آغاز اس کے گھر سے ہوا تھا۔ اسے اچانک اپنی دھلی دھلائی بیوی سے بدبو آنے لگی تھی۔ وہ اپنی ناک اور بو کا علاج کرانے معالج کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔ مجھے افسانوں میں سے بدبو خارج ہوتی محسوس ہوتی ہے لیکن اپنے آپ سے بدبو نہیں آتی۔ معالج نے کہا یہ صاف ستھری بستی ہے، یہاں پاک لوگ رہتے ہیں، ہو سکتا ہے تم پر کسی نے جادو کر دیا ہو، ہو سکتا ہے دشمن نادیدہ ہو، وہ عامل کے پاس پہنچا، جو بولا ساری خرابی تمہاری ناک کی ہے، اگر واقعی تمہیں ہر طرف یہ بو محسوس ہوتی ہے تو پھر اسی سے گزارہ کرنا سیکھو۔ تب اسے خیال آیا کہ غلط وہ خود ہے جو سب سے مختلف ہے وہ چورا ہے پر کھڑا ہو گیا اور لوگوں کو ان کے جسموں سے آتی بو کا ادراک کرانے لگا، لوگ غیض و غضب میں اسے مارنے دوڑے۔ اب وہ اپنی بستی چھوڑ کر مُردوں کی بستی میں

پناہ گزین تھا۔ صبح پرندوں نے بیدار کیا۔ بدبودار بستی اور اس کی دائمی بو کی بدمزگی کا احساس جا چکا تھا وہ اعصاب میں تازگی محسوس کر رہا تھا۔ بستی میں اس کی واپسی ناممکن تھی۔ وہ اچانک ایک تازہ قبر کے گڑھے میں لیٹ گیا، تازہ مٹی کی مہک اسے سرشار کر رہی تھی، قبر دعوت دے چکی تھی۔ اس نے لمبی سانس خارج کی اور آنکھیں موندلی۔ تب اشجار کے چھتنار نے قبر پر گنبد بنا دیا، بیلیں جھک کر قبر کو ڈھانپ رہی تھیں، پرندے خیر مقدمی گیت گا رہے تھے۔

مقدر ساز

اس سے پہلے ہم مصنف کی ''طوطا کہانی'' پڑھ چکے ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار بھی سردار طوطا ہے جو بال بچوں کے ساتھ آئیڈیل زندگی بسر کر رہا ہے، ایک دن جنگل میں کچھ مشکوک لوگ آتے ہیں اور دانہ ودام کا کھیل کھیلتے ہیں، طوطا کالے ہاتھوں کا غلام ہے، اب وہ وہی کرتا ہے جو کالے ہاتھ کہتے ہیں۔ ایک آدمی سکہ دیتا ہے، کالے ہاتھ اسے پنجرے سے باہر نکالتے ہیں وہ ہاتھوں پر رکھا دانہ کھاتا ہے اور پھر لفافے میں سے ایک کارڈ نکال کر مالک کو دیتا ہے، مالک مقدر کا حال سنا رہا ہے اور مقدر ساز طوطا لاتعلقی سے سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے۔

Conjugal Sex-II

بدذائقہ سبزیوں جیسی بیاہتا زندگی کی پہلی واردات کے بعد، یہ دوسری واردات ہے، جو ردی کاغذوں سے شروع ہو کر انھی پر ختم ہو جاتی ہے۔ عمومی زندگی میں میاں بیوی ایک دوسرے کو ردی کاغذ ہی سمجھتے ہیں۔

الزائمر

بتدریج یادداشت کے خاتمے کی کہانی ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار کو نماز بھولنے لگی ہے وہ اس پریشانی کا مظاہرہ کرتا ہے تو اسے طرح طرح کے فقرے سننے پڑتے ہیں۔ مولوی صاحب کہتے ہیں:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ آپ تو پکے نمازی تھے۔"

وہ انھیں نماز یاد کرانے کے لیے کہتا ہے۔ وہ اسے امر ربی قرار دیتے ہیں۔ وہ شاہ صاحب کی سماجت کرتا ہے جو بُرا مان جاتے ہیں اسی طرح شیخ صاحب، گیلانی صاحب، چشتی صاحب، وارثی صاحب اور رحمانی صاحب ناخوشی کا اظہار کرتے ہیں، اس کا شاعر دوست کہتا ہے:

"اچھا ہے اسی بہانے نماز پڑھنے سے بچے۔"

اسی الجھن سے نکلنے کے لیے وہ نماز کی کتاب خریدنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کتابیں ختم ہوگئی ہیں۔ وہ مدرسہ تجوید القرآن سے رجوع کرتا ہے، مہندی رنگی داڑھی اور زمرد وعقیق کی چاندی کی انگوٹھیوں والے مولانا کہتے ہیں:

"ہم تجوید القرآن کراتے ہیں، نماز سکھانے کا ٹیوشن سنٹر نہیں کھولا ہم نے۔"

وہ ذہنی سکون کے لیے داتا صاحب کے مزار کا رخ کرتا ہے۔ ایک نیم برہنہ مجذوب گلے میں موٹے منکوں کی مالا سے کھیل رہا ہے۔ وہ سننے کی کوشش کرتا ہے:

تو ناہیں، میں ناہیں، کج ناہیں
مسجد ڈھا دے مندر ڈھادے حق حق !!

مصنف نے باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ سارا معاشرہ مذہبی الزائمر میں مبتلا ہے۔ مذہب کی فروعی حالتیں تو قائم ہیں لیکن تنظیم گم ہو چکی۔ یہ ایک اچھا افسانہ ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر کی ہنر مندی کی دلیل۔

مردم گزیدہ

اس کی بنیاد غالب کے شعر پر رکھی گئی ہے:

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

آدمی کتوں کی بستی میں اور کتے آدمیوں کی بستی میں عافیت محسوس کررہے ہیں۔ ہجرت کی کہانی دوہرائی جارہی ہے۔ وہ اپنی بے مثال بستی کو چھوڑ رہا ہے اور اب اسے سمجھ آئی ہے کہ باپ دادا نے ہجرت کیوں کی تھی، بستی کا ہر فرد ایک دوسرے کو غبی، بدکردار، بدمعاش اور نانبجار قرار دیتا یا پاگل اور غدار سمجھتا۔

بستی والوں کے رویے کے برعکس وہ صبر و تحمل، شریں بیانی اور رواداری کے قابل تھا، بستی کے پاک لوگوں کو ہر طرف ناپاکی دکھائی دیتی، اس نے ناک کٹوادی اس پر کتے چھوڑ دو۔ پیٹ چاک کر کے حرامی بچے کو ختم کر دو، زندہ گاڑ دو، زندہ جلادو، کے فتوے صادر ہوتے رہتے اور ناک کٹوانے والیاں ناک کٹواتی رہتیں، غیرتوں کے جنازے نکلتے رہتے۔ پاک لوگ بے لگام عورتوں کو زنجیر ڈالنا چاہتے تھے بل کہ بستی کو عورتوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے حق میں تھے پھر بچے پالنے کا سوال آجاتا۔ وہ اس صورتِ حال میں ناخوش تھا اس کے باوجود حسن و خیر کے گیت لکھتا۔ ایک رات بیوی بھی بے وفائی کر گئی اور وہ افسوس و پشیمانی میں بستی سے باہر نکل آیا اس قدر آہستگی سے کہ کتے بھی نہ بھونکے۔ درخت کی چھالوں تلے نیم غنودگی میں تھا کہ قدم رکے، کون ہو، وہ بولا: ''مسافر'' سوال کیا گیا۔ کیا جرم کر کے بھاگے ہو؟ تسلی پر اجنبی اس کے پاس بیٹھ گیا اور اسے بستی کے کالے کرتوتوں اور کالی زبانوں کے بارے میں بتانے لگا اور کہا اس قبرستان کے کنارے پر ایک بزرگ ہے اس کے پاس چلے جاؤ۔ بوڑھے نے بھوبل میں سے ایک آلو نکالا اور کھانے کی دعوت دی، چہار اطراف سے کتے چلے آرہے تھے۔ بوڑھے نے دودھ بھری ناندان کے سامنے رکھ دی اور بغیر شور مچائے شکم سیر ہو کر چلے گئے۔ استفسار پر بوڑھا بولا: میں مطمئن زندگی بسر کرتا تھا لیکن دوسروں میں کیڑے نکالتا، ایک دن گلی میں ایک خاموش زدہ کتا نظر آیا، مجھے دیکھ کر عاجزی سے بھونکا میں اشتعال میں آگیا اور اسے مارا، اس نے جاتے جاتے مڑ کر عجیب نظروں سے دیکھا، اُدھر کتا مرا اِدھر میرا مرشد حاضر ہوا اور کہا: ''احمق مجھے مرشد مانتا ہے اور پہچانتا نہیں'' اور بولے:

> ''ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی جانور بھی ہوتا ہے: کسی میں شیر، کسی میں گیدڑ، کسی میں لومڑ، کسی میں کتا، کسی میں چوہا، کسی میں چمگادڑ۔ یہ جانور انسان کا ہمزاد ہے اگر سدھالو تو پالتو، ورنہ شخصیت پر حاوی آدمی اس کا غلام بن جاتا ہے۔ جاؤ اپنے اندر کے کتے کو پابند کرو، تم انسانوں میں رہنے کے لائق نہیں۔''

''اس واقعے نے میری کایا کلپ کر دی، دن رات گلیوں بازاروں میں پھرتا، بھوکے کتوں کا پیٹ بھرتا، انھیں نہلاتا، زخموں پر مرہم لگاتا۔ ہوتے ہوتے آدم بے زار ہوا اور مجھے لوگوں کا اندرونی جانور نظر آنے لگا اب مجھے نیا سفر درپیش ہے کتوں کی بستی میں شاید کچھ انتظار میرا انتظار کر رہے ہوں۔''

یہ علامتی افسانہ ہے مصنف نے انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے اور وہ خود بھی ایک سطح پر مرشد ہی ہے۔

خشوع وخضوع

''الزائمر'' کی توسیع ہے، پاکستان کے جدید تہذیبی، مذہبی اور معاشرتی احساسات کا افسانہ ہے۔ مصنف نئی تہذیب کے تضادات، انسانی نفسیات کے ٹکراؤ اور عمومی انسانوں کی ذہنیت کا بھرپور نقشہ کھینچنے میں کامیاب ہے۔

سماجی تضاد کی ابتدا کہیں سے بھی کی جاسکتی ہے۔ تجریدیت کے اس منظرنامے میں ہیرو محلے کی غریبانہ مسجد میں بیٹھا ہے۔ مکھیاں اور بوسیدہ صفیں سوہانِ روح ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر یہ ڈیفنس کی مسجد ہوتی تو قالین بچھے ہوتے اور سردیوں میں وضو کے لیے گیزر لگے ہوتے۔ نماز میں وہ فلمی گیتوں پر غور کر رہا ہے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ بنک کیشئر ہے اور بیوی کی فرمائشوں سے تنگ ہے، ایکٹرسوں کی تصویریں اسے کیک پیسٹریاں لگتی ہیں، وہ بلیو فلموں کے بارے میں سوچتا ہے۔ پھر بھاگ کر شادی کرنے والی لڑکیوں کا خیال آجاتا ہے اور وہ اس قیامت کی نشانی کو ہمیشہ کے لیے مٹادینا چاہتا ہے:

> ''ایسی حرام زادیوں کو جب غیرت کے نام پر قتل کیا جاتا ہے تو ٹھیک کیا جاتا ہے۔ بس یہاں طالبان آجائیں تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ ان عورتوں کی ناک، کان، چوٹی کاٹ کر جب انھیں گھروں میں بند کر دیا جائے گا تو سب سیدھی ہوجائیں گی۔ خالص شریعت کی حکومت ہوگی۔ جب کوڑے پڑیں گے تو سب سیدھے ہوجائیں گے۔ سینما بھی بند ہوجائیں گے جہاں بڑی بڑی چھاتیوں والی ایکٹرسیں فلموں میں گندے ناچ ناچتی ہیں۔ یہ سب ختم ہوجانا چاہیے، صرف طالبان ہی یہ کام کرسکتے ہیں۔۔۔ اگر طالبان آگئے تو میں بھی داڑھی رکھ لوں گا۔''

اس کے بعد وہ نماز کے دوران میں سری دیوی کے سراپے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے اور پھر اپنے محلے کی بیوہ بی بی کی یاد آجاتی ہے۔ پھر بیوی اور مہنگائی آنکھ مچولی کھیلتی ہیں:

''مولوی صاحب کہہ رہے تھے رمضان میں شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں، شیاطین واقعی قید کر دیے جاتے ہیں، مگر آڑھتیوں اور ذخیرہ اندوزوں کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔''

اُسے پھر بیوی کے نخرے یاد آتے ہیں۔ پھر مالکِ مکان کے خیال پر طالبان:

''بس طالبان کو آلینے دو۔ شریعت کی رو سے ہمارے کرائے معاف ہو جائیں گے۔۔۔ جزاک اللہ۔۔۔ فحش سی ڈیز اور گندی فلموں کی کیسٹس تباہ کر کے ان لوگوں نے دین کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔۔۔ اور پھر ایسی ہی اور شاندار باتوں کے باعث خشوع و خضوع والے نمازی کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔۔ لاحول ولا۔''

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے کا سفر جاری ہے اور ان کے لیے دلچسپ موضوعات کی کمی نہیں۔

نشانِ جگرِ سوختہ

(خودنوشت)

اسے سنگِ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔ تخلیق کی ہیئت اور اظہار کے مسئلے کو شعوری ادراک کے نفسیاتی مطالعے میں بدلتے ہوئے، مصنف نے پیش لفظ کی حیثیت سے آپ بیتی اور خودنوشتوں کی ایک موثر تاریخ بیان کردی ہے، بل کہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اپنے تنقیدی ہتھیار اپنی خودنوشت کی اکھاڑ پچھاڑ کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ بظاہر مصنف نے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی اور اپنی وراثتی، اخلاقی، خاندانی، نفسیاتی زندگی کے بہت سے کردہ اور ناکردہ نمونے قارئین کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ غیر مربوط اور تجریدی سطح پر دورانِ خالص یا زمانِ خالص کئی مقامات پر شعور کی رو کے ساتھ کسی اور مقام پر اپنی جلوہ گری میں مصروف ہے۔ خودنوشت کی زبان سادہ، آسان اور رواں ہے۔ اسے کوئی مافوق الفطرت رنگ دینے کی کوشش نہیں کی گئی بل کہ بہت سے مقامات پر ڈاکٹر صاحب کے افسانوں کے کردار اور تنقیدی اصطلاحات یک جا ہو کر خودنوشت کا حصہ بن گئی ہیں۔

اپنی خودنوشت میں ڈاکٹر صاحب نے اپنا تعارف ایک متوسط طبقے کے نیک، شریف، مرنجان مرنج شخص کی حیثیت سے کرایا ہے اور اپنے لیے ''بیبا'' یعنی 'سادہ لوح' کا عنوان چنا ہے۔ یہ بیبا لڑکا اپنے اندر ایک خاص قسم سے کا کھلنڈرا پن رکھتا ہے اور دنیا میں اپنے آپ کو ہیرو یا پلے بوائے کی حیثیت سے منوانا چاہتا ہے، لیکن روایتی گھرانے کے فرد کی حیثیت سے، اس کے یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتے۔ اسے کم عمری میں ہی معاش کی طلب میں اپنا گھر چھوڑ کر ایک ذہنی ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ دو تین سال کا یہ عرصہ جو لاہور کے بجائے وہ پشاور میں بسر کرتا ہے، اس کی نفسی زندگی میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔ ماحول سے بے زاری اور ناپسندیدہ ملازمت انقباض کی صورت پیدا کرتی ہے اور وہ کلرکی و کالم نگاری کی فضا سے چھٹکارے کا متقاضی ہے۔ اس کی ادبی دنیا کا آغاز ملتان کی تہذیبی سرزمین پر ہوتا ہے، جہاں اسے لیکچررشپ کے ساتھ ساتھ ادیبوں کا ایک بہت بڑا گروہ میسر آیا، جس میں مرد و زن اساتذہ اور شاگرد اور دوسرے اہلِ قلم شامل تھے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی میں کامیابی کا دوسرا بڑا قدم اپنی شریکِ حیات کی رفاقت کو قرار دیتے ہیں۔ بیوی کی ہمدردی، خلوص، اعتماد، مالیاتی سہارے، خاندانی خدمت اور اتفاق نے ان کی کایا پلٹ دی۔ ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی، ان کے احباب کی نظر میں ایک مثالی زندگی ہے۔

آپ بیتی کا وہ چہرہ، جسے اپنی زندگی کی شناخت کے لیے ہم خود منتخب کرتے ہیں، دوسرے کے انتخاب سے اکثر لگا نہیں کھاتا۔ اس لیے افسانہ نگار اور کالم نویس بزرگ ادیب انتظار حسین نے نشانِ جگر سوختہ کو ''ذاتی محبت'' کی ایک کتاب قرار دیا ہے، جس میں مصنف نے ایک جگہ اپنے آپ کو ظالم تنقید نگار قرار دیا ہے۔ انتظار حسین کا خیال ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر اُردو ادب کے سب سے زیادہ رحم دل نقاد ہیں اور انھوں نے ہر طریقے سے لکھنے والوں کو اپنی کسی نہ کسی فہرست میں ضرور جگہ دی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نشانِ جگر سوختہ ''الفتِ ذات'' کے اثرات لیے ہوئے ہے، مصنف نے اپنے بارے میں دل کھول کر اشارے بھی دیے ہیں اور پھر خود جوازیت کے حق کو استعمال کرتے ہوئے بہت سے مقامات پر اپنے آپ کو کئی مقدمات سے بری بھی کر دیا ہے۔ مصنف نے زیادہ تر اپنا سوفٹ امیج ابھارنے کی جو ابتدائی کوشش کی ہے، اس کی رومان پروری، بہت دور تک اس کا ساتھ نہیں دے سکی، چناں چہ یہ سوفٹ امیج مصنف کی ذاتی مہربانی سے ہی آہستہ آہستہ کئی دوسرے رنگ بھی چھوڑنے لگا ہے۔ مصنف کی معصومیت کس طرح اپنے دشمنوں میں اضافہ کرتی ہے۔ طبیعت کا اضمحلال اور اشتعال کس طرح گھر والوں کے لیے سوہانِ روح ہوتا ہے انھی نیوراتی اثرات کے ساتھ ساتھ مصنف کے مجہول معاشقوں کا بیان ان کی تحلیل نفسی میں کام آ سکتا ہے جس میں وہ ہر بار کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر کے ملبہ دوسرے فریق پر ڈال دیتے ہیں۔ مصنف نے لکھا ہے: وہ تنہائی پسند ہے اور مجلسی آدمی نہیں۔ اس کے باوجود ان کے ملاقاتیوں کی تعداد کم نہیں۔

مصنف کی آپ بیتی کے وہ حصے، خیال انگیز اور قابل ذکر ہیں، جہاں اس نے اپنے خوف اور اپنی آرزوئیں گنوائی ہیں۔ کسی ادیب کی زندگی میں اس کے خوابوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی خودنوشت ان خوابوں اور تمناؤں کی کتابوں میں سے ایک ہے۔ داستانوی رومان کی اولین پرچھائیوں اور مجمع باز پتلی گروں کے مکالموں سے تراشے ہوئے لمحات تمام عمر ان کا پیچھا کرتے رہے ہیں۔ بظاہر ڈاکٹر صاحب کی زندگی ایک کامیاب آدمی اور کامیاب ادیب کی دنیا دارانہ صلاحیتوں کا منبع ہے اور اسی لیے اسے ہر شخص کو پڑھنا چاہیے تاکہ لوگ اپنی افسردگی، مایوسی، اضمحلال اور یاسیت کی گہری کھائیوں سے باہر آ سکیں اور تحریمات سے ہلکے ہلکے ٹکراؤ کے بعد اپنے راستے کی رکاوٹیں دور کر سکیں۔ خودنوشت کا طرزِ تحریر بے حد دلچسپ ہے۔

کلامِ نرم ونازک

اس کتاب کا جدید ی ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۴ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ مضامین کی تفصیل اس طرح ہے۔

زندگی برباد کرنے کا نسخہ، خاوند کو بے زار کرو، بیوی کو بے زار کرو، شوہر و بیو یو متحد ہو کر گھر اجاڑو، بچے بگاڑو، بنو مجرم پھولو پھلو، ہدایت نامہ طلبا، جدید رہنمائے اساتذہ، سور کھاؤ مزے پاؤ، پیر پکڑو بیڑا پار کرالو، گرینڈ کلیرنس سیل، منافقت بہترین خوبی ہے، سی آئی اے، مجھے خریدلو، ماڈرن قصاب خانہ، کس رزق سے موت اچھی، استحصال کی جنت، شہر نامہ، لاہور گائیڈ، کرایہ نامہ، اصلی تے وڈی ہیر، نئی درآمدی و برآمدی پالیسی، کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں، الیکشن گائیڈ۔

ان مضامین کی نوعیت قدرے نفسیاتی اور ہنگامی ہے، ہماری روزمرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ اس طرح لیا گیا ہے کہ سنجیدہ معاملات بھی مسکراہٹ کی لکیر بن گئے ہیں۔ چند فقرے دیکھیے

☆ اگر دجلہ کو قطرہ میں دیکھنا ہو تو کالج کی سیاست کا جائزہ لینا چاہیے۔ (ص ۲۰)

☆ منافقت فرد کے لیے شیش محل ہے تو قوم کے لیے بارہ دری۔ (ص ۳۱)

☆ خدا وہ دن جلد لائے جب ہم یہ سب فلمیں سری نگر جا کر دیکھیں، بھلا بیس انچ کی سکرین پر ہیما مالینی، شرمیلا ٹیگور یا زینت امان دیکھنے میں کیا رکھا ہے۔"

ڈاکٹر سلیم اختر اگر افسانے اور تنقید کے کل وقتی کام کا انتخاب نہ کرتے تو وہ پاکستان کے شگفتہ کالم نگار کی حیثیت سے بھی نام پیدا کر سکتے تھے۔ بقول سید ضمیر جعفری:

> "سلیم اختر اندھیرے میں لاٹھی گھمانے کے قائل نہیں، انہوں نے قلم کے ذریعے آج کی اجتماعی زندگی کی منافقت، بے راہ روی، کھوکھلے پن کے منفی رویوں کے خلاف کھلم کھلا جہاد کیا ہے۔"

سفرنامے

ابھی تک ڈاکٹر سلیم اختر کے دو سفرنامے شائع ہو چکے ہیں۔

عجب سیر تھی۔ یہ کتاب ۲۰۰۲ء میں فیروز سنز نے شائع کی۔ ڈاکٹر صاحب غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے بین الاقوامی غالب سیمینار میں ۱۶؍دسمبر ۱۹۸۸ء میں اور پھر میر تقی میر سیمینار دوحہ قطر نومبر ۱۹۹۶ء میں تشریف لے گئے۔ ۱۳؍اکتوبر ۱۹۹۸ء کو انھیں سر سید احمد خاں صدی تقریبات میں موریشس جانے کا موقع ملا۔ دسمبر ۱۹۹۹ء میں وہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی دعوت پر میر تقی میر سیمینار میں شرکت کے لیے گئے۔ یہ سفرنامہ انھی تقریبات اور ہندوستان سے اس تہذیبی، لسانی اور تاریخی بازیافت کا نتیجہ ہے جو دونوں ممالک کو بہت سے مقامات پر قریب کرتی ہے۔ اس کا ایک حصہ ڈنمارک سے متعلق ہے، جہاں ڈاکٹر سلیم اختر اپنی بیٹی سائیکی اور اس کی فیملی سے ملنے گئے۔

اک جہاں سب سے الگ۔ اپنے بھائی کی دعوت پر ڈاکٹر سلیم اختر سیر و تفریح کی غرض سے امریکہ تشریف لے گئے اور دو اڑھائی ماں قیام کیا۔ گرین کارڈ سے لے کر امریکہ کی سرسبزی و شادابی اور ترقی کے واقعات کے ساتھ ساتھ مسلم تہذیب کا تقابلی جائزہ مصنف اور اہلِ خانہ کے احساسات، امریکی مشاہیر، عمارات، عجائبات، برق رفتاری، ایجادات، انسانی حقوق مصنف کی گہری نظر نے افسانہ طرازی اور حقیقت نگاری کا کوئی موقع نہیں چھوڑا۔

سفرناموں کی زبان افسانوی ہے۔ مصنف نے کسی مقام پر بھی قارئین کو اپنی گرفت سے آزاد ہونے کا موقعہ نہیں دیا۔

درشن جھروکہ

(خاکہ نگاری)

یہ کتاب خاکہ نگاری کے علاوہ تاثرات نگاری کی کتاب ہے۔ بیشتر مضامین احباب کی وفات پر لکھے گئے ہیں۔ چناں چہ ان میں افسوس کے ساتھ ساتھ ادب نوازی کے محکمے کی بھی ایک صورت پیدا ہوگئی ہے، اگرچہ ڈاکٹر سلیم کا کہنا ہے وہ مجلسی آدمی نہیں، لیکن انھوں نے اپنے تعلقات کو خوب نبھایا ہے۔ شخصیات کے احترام اور ذاتی موانست میں کمی نہیں چھوڑی اور جہاں کہیں کوئی اختلافی پہلو نکل آیا ہے اسے خوبصورتی سے نبھادیا ہے۔ ایک اچھے دنیادار تعلق دار کی طرح۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے اس درشن جھروکے میں، جن لوگوں نے چہرہ نمائی کی ہے ان میں کئی طرح کے مشاہیر موجود ہیں۔ محمد طفیل عرف محمد نقوش، خلیل صدیقی، عبدالوہاب، خان سلیم، رام لعل، آغا سہیل، تاج سعید، جوش صاحب، اے بی اشرف، طاہر تونسوی، معراج نیرّ، محسن نقوی، منیر احمد شیخ، اختر انصاری اکبر آبادی، صابر دت، ابن حنیف، فہیم اعظمی، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، حفیظ لدھیانوی، قدرت اللہ شہاب، عرش صدیقی، فارغ بخاری، جابر علی سید، پروفیسر محمد عثمان، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، دلیپ سنگھ اور دوسرے۔ یہاں مختلف خاکوں کے تاثرات کا عکس قلم بند کیا جاتا ہے۔ محمد طفیل عرف محمد نقوش۔ اُردو کے معتبر رسالے نقوش کے مدیر تھے۔ نقوش نے متعدد نمبر شائع کیے، جن میں رسول نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر نمبر، انیس نمبر اور غزل نمبر قابل ذکر ہیں۔ بقول سلیم اختر:

> ''طفیل صاحب کی مدیرانہ صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا لازم ہے کہ وہ صاحبِ اسلوب خاکہ نگار بھی تھے۔ اسی طرح پاکستان رائٹر گلڈ کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے انھوں نے جو کارنامے انجام دیے، وہ ایک الگ داستان ہے''

محمد طفیل کی شگفتہ بیانی کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

''چائے کا قصہ شروع ہوا، انھوں نے اپنے ملازم کو بلایا اور پوچھا ''تمہارا روزہ ہے۔''

''جی ہاں'' اس نے جواب دیا۔

اسے کہنے لگے۔ ''دیکھو میری تو صحت خراب ہے اور اس شخص کا دماغ خراب ہے۔'' اس لیے ہم دونوں کے لیے فرسٹ کلاس چلائے بنالاؤ۔''

صدقِ خلیل کے عنوان سے خلیل صدیقی کا تذکرہ ہے، جو زمانہ ملتان کے دوست تھے، ازاں بعد کوئٹہ چلے گئے، بقول ڈاکٹر صاحب:

''خلیل صدیقی تیغ لسان کے ماہر نہ تھے، اس لیے کسی نے بھی، کسی کے بارے میں بھی، ان سے نا ملائم الفاظ نہ سنے۔ حالاں کہ اس وقت شعبہ میں ایک دو ایسے احباب بھی تھے جو نا ملائم کلمات ہی نہیں بل کہ نا قابل اشاعت الفاظ کے بھی مستحق تھے۔ سٹاف روم میں خوش گپیاں ہو رہی ہیں محفلِ غیبت زوروں پر ہے۔۔۔ مگر کیا مجال جو خلیل صدیقی اس کارِ خیر میں ہاتھ بٹائیں۔ بس یوں ہی تکلفاً ذرا مسکرا دیتے۔ ایسا مسکرانا جیسے مسکراہٹ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی تیار کر رہے ہیں۔''

''دوستی کا گل سر سبز عبدالوہاب خاں سلیم'' یونیورسٹی کے زمانے کا دوست ہے، جس سے اب بھی دوستی چلی جاتی ہے۔ بقول مصنف:

''یاد رہے حاتم بھی عرب تھا۔ ہمارے عہد کا ہمارا دوست وہاب عربی تو نہیں لیکن اپنے اسلوب میں وہ بھی یہی رسم ادا کر رہا ہے کہ دور۔۔۔ سات سمندر پار ہم جیسے منیر شامیوں کی ہر طلب پوری کرتا ہے۔ ہم کون سا شہزادیوں کا سوال کرتے ہیں اور اگر شہزادی مل بھی جائے تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیں گے لہٰذا کتاب ہی میں عافیت ہے۔''

رام لعل اور لاہور

افسانہ نگار رام لعل کے ساتھ ساتھ شہر لاہور کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے:

''اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ لاہور کی نفسیات کیا ہے تو میں اسے صرف ایک لفظ ''نرگسیت'' سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں کے ادیب، فن کار، اداکار، گلوکار، صحافی اور بہت سے دوسرے، جیسے سری پائے بیچنے والے، پنواڑی، مالشیے، جیب کترے، اٹھائی گیرے، طوائفیں اور کٹنیاں دراصل وہ مختلف آئینے ہیں، جن میں یہ نرگسی شہر اپنے جمال کا مختلف زاویوں سے نظارہ کرتا ہے، چناں چہ یہ اور اس نوع کے دیگر آئینے مل کر اس شیش محل کی تشکیل کرتے ہیں جو طلسمی داستانوں کے پراسرار محل کے مانند راہ چلتوں کو اپنی محبت میں اسیر کر لیتا تھا لیکن ایک بات ہے کہ آپ لاہور کی محبت میں تو گرفتار ہو سکتے ہیں لیکن اسے فتح نہیں کر سکتے ہیں۔''

To sir with love

یہ مضمون آغا سہیل کی ریٹائرمنٹ کے موقع پر لکھا گیا ہے۔

''میں اور آغا صاحب اب عمر کے اس دور میں ہیں، جہاں ہمارا سب سے بڑا اور انقلابی قدم ہماری دوسری شادی نہیں ریٹائرمنٹ ہے۔ سو آغا صاحب نے یہ منزل سر کر لی ہے۔''

تاج سعید

رسالہ قند اور رسالہ جریدہ کے مدیر تاج سعید اور ان کی بیوی مشہور افسانہ نگار زیتون بانو کو خراج پیش کیا گیا ہے اور تاج سعید مرحوم کے اوصاف گنوائے ہیں:

''دوست زندہ ہوتا ہے تو قربت، محبت اور خلوص کی وجہ سے Taken for granted لیتے ہیں۔۔۔ لیکن جہانِ فانی سے رخصت ہو جانے کے بعد، اس کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے خلا کے نتیجے میں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کیسا اچھا انسان گنوا دیا۔۔ اور اب ہم کتنے خسارے میں ہیں۔''

''تاج سعید نے اگرچہ تمام اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن اس کی پہچان دوہا اور گیت ہیں۔ وہ ہندی کے کومل الفاظ کے برمحل استعمال سے اپنی کویتا کا رنگ چوکھا کر لیتا، سوچ سمندر اور رتوں کی صلیب کے علاوہ ''لیکھ' ہندکو شاعری کا مجموعہ ہے۔''

پُر جوش

لاہور کے بزرگ شاعر جوش صاحب تقریبات منعقد کرنے اور ادیبوں شاعروں کی محبت و خدمت کے باعث بہت مقبول تھے۔ اے۔ جی۔ جوشی کے بارے میں مصنف نے لکھا:

''متضاد اور برعکس رویوں کو قابو میں رکھنے والا، کوئی ایک مرکزی اور بے حد قوی رویہ/رجحان/میلان بھی ہوتا ہے، جسے شخصیت کے نظام شمسی میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور یہی فرد کی شخصیت کے طلسمی غار میں داخلہ کے لیے کھل جا سم سم کا کام کرتا ہے۔ اس لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ جوش صاحب کی شخصیت کے جملہ عناصر ترکیبی کو لفظ ''خوشی'' سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ آپ خوش خوراکی کا نام دے لیں، خوش وقتی کہہ لیں، خوش ذوقی، خوش نمائی، خوش اطواری یا خوش جوش۔ جوش صاحب نے حلقہء ارباب ذوق کو حلقہء خوش خوراکاں میں تبدیل کر دیا۔۔ جو شخص اتنا معصوم ہوا ہے اسے بے وقوف نہیں بنایا جاتا، اس سے صرف پیار کیا جا سکتا ہے۔''

ہیرو

ملتان کے خوش پوشاک استاد اے بی اشرف کا خاکہ لکھا ہے:

''اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ ڈاکٹر اے بی اشرف یونیورسٹی کی مجبوریوں یا نوجوانوں سے مسابقت کی وجہ سے سمارٹ بنا رہتا ہے تو یہ خیال غلط ہے۔ دراصل اس کی لچھن شروع سے ہی ایسے تھے۔''

''اے بی اشرف کی بلند قامتی میں ملتانی کافی کی اٹھان نظر آتی ہے۔''

''اس کی آنکھوں میں دوستوں کے لیے خلوص کی جو چمک ہے، وہ اس کے دلِ بے ریا کی مظہر ہے، وہ دل جس میں روہی کا پھیلاؤ ہے آج اے بی اشرف دوستوں کے لیے شجرِ سایہ دار میں تبدیل ہو چکا ہے۔''

گرم لہو کی دھمال' ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے عزیز شاگرد ڈاکٹر طاہر تونسوی کی شان میں لکھا ہے اور بزرگانہ محبت کا حق ادا کر دیا ہے:

''بس میرا اور طاہر تونسوی کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ ہم استاد شاگرد ادب کا تعزیہ اٹھائے پھر رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں عزیز طاہر تونسوی یہ اپنا تعزیہ مجھے دے دو، سنبھال لوں گا لیکن وہ انکار کرتے ہوئے کہتا ہے۔ سر آپ اپنا تعزیہ بھی مجھے دے دیں۔ میں آپ کے تعزیے کے ساتھ ساتھ بہاؤ الدین یونیورسٹی کا تعزیہ بھی اٹھا سکتا ہوں۔''

بقول مصنف:

''ہر طوفان کے مرکز میں سکون اور عافیت کا دائرہ ہوتا ہے، جسے جغرافیہ دان طوفان کی آنکھ کہتے ہیں، تو طاہر تونسوی کی طوفاں بداماں شخصیت میں بھی سکون کا ایسا ہی دائرہ ہے۔''

ڈارک آئس برگ

ستار طاہر کے بارے میں لکھا گیا مضمون ہے:

''طاہر کو میں نے ہر رنگ اور ہر رُوپ میں دیکھا تھا۔ بہت قریب سے بھی اور محدب شیشہ میں رکھ کر بھی لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس کی بہت سی باتوں مخصوص افعال وحرکات اور ان سے وابستہ محرکات کو میں نہ سمجھ پایا۔''

۔۔۔یوں دیکھیں تو ستار طاہر بھی ایک طرح کا آئس برگ ہی تھا اپنی وضع میں نرالی اور اپنے رنگ میں منفرد ڈارک آئس برگ۔''

یہ ایک تفصیلی مضمون ہے۔ کالم نویس ستار طاہر کا جائزہ عمدہ تنقید کا نمونہ ہے۔

بیبا

یہ نیک اور شریف آدمی معراج نیرّ ہے۔۔۔ایک گول مٹول شخصیت:

''گھر میں گئے تو ہماری بھابھی صاحبہ ان سے خوش، کالج آئے تو صدر شعبہ ان سے خوش، کلاس میں لڑکیاں ان سے خوش اور تو اور ہمارے نائب قاصد بابو خان بھی ان سے خوش۔

''انھوں نے مجھے بتایا کہ ''پلک بسیرے'' کے ٹائٹل پر جو آنکھیں ہیں وہ آرٹسٹ نے نہیں بنائیں بل کہ میری آنکھوں کا فوٹو ہے۔ اس جدت پر وہ بہت خوش تھے۔ معراج نیرّ کی آنکھیں تو بند ہوگئیں لیکن خاکوں کی کتاب پر اس کی آنکھیں زندہ رہیں گی اور ہم سے باتیں کرتی رہیں گی۔''

فن کے صحرا میں آبلہ پا

یہ مشہور شاعر محسن نقوی کا خاکہ ہے، جو ڈاکٹر سلیم اختر کا شاگرد بھی تھا:

''گھنگھریالے بالوں، موٹی موٹی، کچھ سوئی کچھ جاگی یعنی اپنی غزل جیسی آنکھوں والا محسن نقوی، کلاس میں سب سے آخر میں بیٹھتا تھا۔ یہ اس کی شاعرانہ ادا تھی بل کہ ''مکرِ شاعرانہ'' کہ سب سے پیچھے بیٹھ کر سب سے آگے بیٹھنے والی لڑکیاں دیکھتا۔ اسی میں اس کے شاعر ہونے کا راز مضمر ہے۔''

شہزادہ

منیر احمد شیخ کی وفات پر لکھا گیا مضمون ہے:

''وہ گریڈوں کے شہر اسلام میں رہتا تھا لیکن شعوری کاوش سے خود کو ذات پات

کے نظام سے الگ رکھا اور ہر ممکن کوشش کی کہ وہ عہدوں سے جنم لینے والی دفتری نظام کی چھوت چھات کی مشین کا محض کل پرزہ بن کر نہ رہ جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ادب، موسیقی اور فنونِ لطیفہ کی صورت میں اپنے لیے ایک چور دروازہ تلاش کر رکھا تھا۔۔ منیر احمد شیخ نے تمام عمر خوبصورت الفاظ کی ذائقہ شناسی اور سُسر کے جمالیاتی خط میں بسر کی اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت اچھی زندگی بسر کی۔''

نخلستان

''نئی قدریں'' کے مدیر اختر انصاری اکبر آبادی پر لکھا گیا مضمون ہے۔

کچھ صابر دت کے بارے میں

جریدہ فن و شخصیت کے مدیر صابر دت کے بارے میں لکھا گیا مضمون ہے، جس میں ان کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ابن حنیف

ملتان کے مشہور محقق پہ لکھا گیا مضمون ہے۔ ابن حنیف نے اساطیر پر بہت اچھا کام کیا اور آثارِ قدیمہ کے مطالعہ کو ایک فن بنا دیا۔ یونانی اور رومن اساطیری ادب کو اُردو میں روشناس کرایا۔ انتھروپالوجی کے ماہر ابن حنیف کے بارے میں مضمون لکھتے ہوئے مصنف نے لکھا:

> ''ہمارے ہاں اب بھی سائنس کو مشکوک سمجھا جاتا ہے، مگر یہ امر فراموش کر دیا جاتا ہے کہ ہماری دین داری میں بے دینی کی کتنی ملاوٹ ہے۔ ابن حنیف اور اس جیسے تمام حضرات جاہل معاشرے اور کاٹھ کے لوگوں میں مس فٹ ہوتے ہیں اس لیے تنہائی ایسے لوگوں کا مقدر ہوا کرتی ہے۔''

فہیم اعظمی

ماہنامہ ''صریر'' کے مدیر کے بارے میں لکھا گیا مضمون ہے۔فہیم اعظمی تنقید کے جدید نظریات کے ساتھ ادب میں جدیدیت کے قائل تھے۔ لاکھوں شاعروں والے شہر کراچی میں فہیم صاحب احساسِ تنہائی رکھتے تھے۔ان کے بے تکلف دوست محدود تعداد میں تھے۔

احمد ندیم قاسمی

سب اچھا کہیں جسے، حریت فکر کا داعی: احمد ندیم قاسمی، احمد ندیم قاسمی: تخلیقی شخصیت، احمد ندیم قاسمی: الوداع۔ چاروں مضمون جناب احمد ندیم قاسمی کے ترقی پسندانہ خیالات اور انقلابی رجحانات کی طرف اشارہ دینے کے ساتھ ساتھ ان کی فعال شخصیت، عملی دانش وری، عمرانی اور نفسیاتی اقدامات اور تخلیقی مدارج کے جائزے کے مضامین ہیں۔احمد ندیم قاسمی کی جرأت، ان کے کلیدی خطبات اور ضیاء الحق کے زمانے میں اہل قلم کے نقطہ نظر کی وضاحت کو مصنف نے احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ بے شک

> ''انسان ہر دیانت دار ادیب کا موضوع ہے اور اگر اس کے لیے یہ موضوع بے معنی ہے تو وہ خود بے معنی ہے اور معاشر اور قوم او رعالم انسانیت کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' (سب اچھا کہیں جسے)

ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے:

> ''کیلنڈر عمر بسر کرنے والے افراد کے پاس محض شخصیت ہوتی ہے جب کہ تخلیق کار تخلیقی شخصیت کا بھی حامل ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمد ندیم قاسمی بھی ایک تخلیقی اور کرشماتی شخصیت تھے اسی لیے، جو ان سے ملا، ان کا ہو کر رہ گیا۔''
> (حریت فکر کا داعی)

> ''افسانے کے مانند ان کی شاعری بھی تلخ سچائیوں پر سے اخفا کے پردے سرکانے کی سعی تھی۔ یہ طے ہے کہ بحیثیت تخلیقی فنکار احمد ندیم قاسمی نہ صرف اپنے زمانے کا استعارہ تھے بل کہ زندگی کے محاذ پر انھوں نے قلم سے جو کام لیے وہ ہر ادیب کے لیے ممکن نہ تھے۔''

''بلاشبہ احمد ندیم قاسمی وہ شجر سایہ دار ہے جس کی شاخیں محبت کے پھل سے جھکی جاتی ہیں، جس نے زندگی کی کڑی دھوپ کھائی مگر احباب پر آنچ نہ آنے دی بل کہ اپنی محبت کی چھاؤں سے کسی کو محروم نہ کیا حتیٰ کہ انھیں بھی جو ان کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کرتے رہے۔''

تعزیت۔ فیض احمد فیض

اس مضمون میں مصنف نے لکھا ہے:

''علامہ اقبال کے بعد فیض ہی ایسے شاعر تھے، جنھیں صحیح معنوں میں بین الاقوامی مزاج کی شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب فیض کی بات چلی ہے تو اس سلسلے میں یہ عرض کرتا چلوں کہ ان کے لہجے کی نرمی، اطوار کی شائستگی، دل کی دردمندی اور مزاج کی انکساری سے انسان دھوکہ کھا جاتا تھا کہ یہ معصوم صورت ڈھیلا ڈھالا انسان غالباً موم کی ناک ہے۔ لیکن یہ ظاہری روپ تھا درحقیقت وہ عزم کی چٹان اور استقامت کا کوہ گراں تھے۔ ان کی شخصیت بہترین عناصر کا جوہر تھی۔ میں نے فیض صاحب کے جنازے میں ہزاروں افراد کو دیکھا۔ ان میں دوستوں، ساتھیوں اور نادیدہ مداحوں کے ساتھ ساتھ دشمنوں اور مخالفوں کی بھی خاصی تعداد موجود تھی۔ تب مجھے ندیم کا یہ شعر یاد آیا

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

حفیظ جالندھری

''وہ شاعری میں ہی نہیں بل کہ عام زندگی میں بھی ''ابوالاثر'' تھے، چناں چہ کیا مجال جو کسی محفل میں ہوں یا مشاعرے میں ہوں یا سٹیج پر ہوں اور پھر ان کے سامنے کسی کا چراغ روشن ہو سکے۔ بلا کے فقرے باز تھے اور ان کی فقرہ بازی

کے جوہر اس وقت کھلتے تھے جب یہ مشاعرہ میں کچھ پڑھ رہے ہوں اور پھر
اردگرد بیٹھے اور احباب کو مخاطب ہو کر جو جو کچھ کہہ جاتے وہ شنیدنی ہوتا۔''

قدرت اللہ شہاب

قدرت اللہ شہاب نے ادب اور ادیبوں میں دو طرح سے شہرت حاصل کی ایک تو اپنی تخلیقات سے اور دوسرے بعض حکومتوں میں اہم کلیدی اہمیت کے منصب کی بنا پر، چناں چہ رائٹرز گلڈ کی تشکیل اور نیشنل پریس ٹرسٹ سے ان کی وابستگی نے انھیں کسی نہ کسی صورت موضوع گفتگو بنا رکھا۔''

عرش صدیقی رفارغ بخاری

عرش صدیقی سیلف میڈ انسان تھے، وہ تخلیق کار تھے اور نقاد بھی وہ بنیادی طور پر مجلسی آدمی تھے۔ اسی طرح فارغ بخاری ترقی پسند سوچ کے ترجمان تھے، آخری عمر میں یادداشت کھوگئی مگر راہِ عدم نہ بھولے۔

جابر علی سید

جابر علی سید کا مسئلہ یہ تھا کہ انھوں نے مزاج شاعرانہ پایا مگر ذہن ماہر لسانیات کا تھا۔ جہاں شعر گوئی نے ان میں جوہری بن کر لفظوں کے نگینے سجانے کا شعور پیدا کیا وہاں لسانیات کے مطالعے نے لفظ کی قدر و قیمت کا سلیقہ بخشا۔ اسی۔ لیے وہ ادب کے مطالعے میں اور تخلیق کے تجزیے میں بالعموم موضوع یا مواد کے مقابلے میں اسلوب اور لفظ کے محل استعمال سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے۔ ان میں ذہانت کی کمی نہ تھی۔ حسن ذوق بھی تھا، شعورِ نقد بھی لیکن نہ جانے کہاں ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔''

پروفیسر محمد عثمان

پاکستان میں اقبال شناسی کی توانا روایت میں پروفیسر عثمان کی تنقیدی صلاحیتوں نے قابل قدر اضافہ کیا۔ حیات اقبال کا ایک جذباتی دور، فکر اسلامی کی تشکیل نو اور اقبال کا فلسفہء خودی پروفیسر عثمان کی وہ کتابیں ہیں، جنھوں نے فکر اقبال کے متعدد گوشے منور کیے۔ بقول مصنف:

''پروفیسر عثمان اقبال کی ہمنوائی میں اسلام کو دین فطرت اور حرکی مذہب تصور کرتے تھے۔ وہ اسلام کو ایک ترقی پسند مذہب سمجھتے تھے۔۔۔ وہ ایک بے حد فعال شخصیت تھے، ایسا دانشور جو زندگی میں عقلی رویوں کا متلاشی رہا۔''

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

جہاں تک ڈاکٹر صاحب کی قلمی کاوش کا تعلق ہے تو اُردو شاعری کے کلاسیکی عہد اور اس سے متعلق شعرا سے انھیں خصوصی دلچسپی تھی، انھوں نے عمر بھر خود کو تنقید، تحقیق اور لسانیات کے مطالعے کے لیے وقف رکھا۔

دلیپ سنگھ

''دلیپ سنگھ کے طنزیہ مزاحیہ مضامین بھارت اور پاکستان میں چھپتے رہے، وہ بات میں سے بات پیدا کرنے کا گر جانتے تھے۔۔۔ اگر شہروں کا بھی افراد کی طرح مزاج اور شخصیت متعین کی جائے تو لاہور نرگسی شہر قرار پاتا ہے''۔۔۔ صرف چند ہی ایسے دیکھے جنھیں لاہور نے کھلے بازوؤں سے خوش آمدید کہا۔ دلیپ سنگھ انھی میں سے ایک تھے۔

الغرض ڈاکٹر سلیم اختر کی اس پکچر گیلری میں درجنوں تصویریں اپنی چھب دکھا رہی ہیں اور ان کے بنیادی نظریات وخیالات کی جدیدیت اور فعالیت کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ

عرفِ عام میں ہم ان افسانوں کو ایک شرمیلے اور ہپے نوجوان کی پوشیدہ کارگزاری سے تعبیر کر سکتے ہیں جسے شعوری طور پر نیک، پرہیزگار، متقی بل کہ راہبانہ طرزِ زندگی کا اس طرح راستہ دکھایا گیا کہ اس کی عورت تک رسائی داستانوی اور اساطیری کرداروں کی بدولت ہی ممکن ہو سکی ہے۔ وینس کی دیوی، فسانہء عجائب کی حسن آراء، اور یونگ کی متعارف کردہ سائیکی۔ یہی ہیں عورت کے فوٹو اسٹیٹ جنھوں نے سلیم اختر کی خیال کی دنیا کا احاطہ کیا ہوا ہے اور انھی کی سراپا نگاری میں ان کا قلم ہر مصورانہ چال چل گیا ہے:

> ''اس کے حسن کی قصیدہ خوانی میں شعراء نے گیت لکھے تو کنول کے پتوں جیسی ملائم ہتھیلیوں کے بادام جیسے ناخنوں کو برگِ گل قرار دیا۔ کومل بازوؤں میں بید مجنوں کی لچک بتائی گئی، نرم کولہوں میں ملائمت کا کمال تھا تو سخت چھاتیوں میں سختی کا عروج، سفید اور ہموار پیٹ میں ناف، دیوتا کی تیسری آنکھ سے مشابہ قرار دی گئی، جب کہ مصوروں نے زلفوں کی سنہری آبشار کے پس منظر میں گھنے جنگلوں والی سبز آنکھوں کی پراسرار گہرائی میں وہ جھیل دیکھی، جس کے کنارے خودمحوی کے عالم میں نارسس نے جان دی تھی۔'' (قفسِ رنگ)

جیون جل کی شہزادی دیکھیے

> ''مطلا حاشیے سے بنے نقرئی تاروں والے پردہ کے ادھر شہزادی، ستاروں جیسی خواصوں کے جھرمٹ میں مثلِ ماہِ چہاردہم، پردے کے نقرئی تار مہین و ملائم اور نفیس اتنے کہ دوستِ تصور سے بھی لرزاں اور اس دھواں دھواں براق پردہ کے پیچھے حسنِ جہاں سوز کا شعلہ۔۔ لپکتا، دمکتا، جھمکتا! وہ حسن جس نے منیر شامی کے خرمنِ ہوش و خرد پر بجلی گرائی، گھربار سے بیگانہ کیا اور عاشق حرماں نصیب بنا کر چھوڑا۔'' (جیون جل)

''مشعلوں کی گرم روشنی میں رقاصہ کا انگ انگ لچک رہا تھا، پنڈلیاں، رانیں، کمر، ناف، سینہ، گردن، ہونٹ، آنکھیں اور کھلے لہراتے بال سب عالم رقص میں تھے۔'' (جنم روپ)

''سیاہ بھونرا نین، سانولی کا روپ سہانا من لبھانے کو، ہونٹوں کی لالی کا رس ٹپکنے کو، لامبے سیاہ بال کمر کے نیچے ابھار تک پہنچنے کو، مدھرا سے بھری کٹورا چھاتیاں انگیا سے باہر آنے کو، میدے جیسے لوچ والے پیٹ میں ناف کا بھنور تیل کی پلی پی جانے کو۔'' (ہر خواہش پہ۔۔۔)

اس حسن کی انتہا اور سرور سلیم اختر کے افسانے ''لہو کی چہچہاہٹ'' میں عروج پر ہے جب مرد اس کے گوشت اور لہو کی دعوت اڑاتے ہیں اور جسم کے مزیدار حصے بھون بھون کر کھاتے ہیں، لہو کا ذائقہ، چربی کی پیاس صرف انھیں ہی نہیں سارے ماحول کو دیوانہ کیے دیتی ہے۔ آدم خوری کا یہ ذائقہ نسل در نسل، بدن در بدن سفر پر ہے اور الاؤ کی آگ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے:

''الاؤ پوری طرح دھک چکا تھا، شعلوں کی زبانیں سانپوں کی طرح لہریا لے رہی تھیں، جلتی لکڑیاں تڑخ تڑخ کر انگاروں میں تبدیل ہو رہی تھیں، الاؤ میں سب سے پہلے عورت کا دھڑ رکھا گیا، اس کے بعد دونوں رانیں اور پھر دونوں بازو اور مدھم آنچ پر خستگی برقرار رکھنے کے لیے، ان سب کے اوپر، دونوں چھاتیاں جواب محض چربی کی دو گیندیں بن کر رہ گئی تھیں ان کے اصل ذائقے کی برقراری کے لیے بے حد احتیاط کی ضرورت تھی۔'' (لہو کی چہچہاہٹ)

عورت کے اس سراپے کی ضد میں بدصورتی کے بیان کے لیے، دیویوں کے روپ جیسی لکشمی، پاربتی، سرسوتی کی ضد میں جادوگرنیاں اور بدہیئت عورتیں تراشی ہیں:

''وہ قریب ہوئی تو جسم سے اٹھتے تعفن کے بھبھوکوں کی وجہ سے دم گھٹتا محسوس ہوا۔ وہ بارہ سنگھے کے سینگوں جیسی آڑی لکڑی لیے، اسے چپچپاتی چندھی آنکھوں سے گویا اپنی اور کھینچ رہی تھی کندھے پر لٹکتا بڑا سا تھیلا، جس کے بارے

میں باور کیا جاتا تھا کہ وہ دودھ پیتے بچے اٹھا کر اس تھیلے میں ڈال لیتی اور پھر جنگل میں چھپ کر انھیں کوئلوں پر بھون کر کھا جاتی ہے۔" (تیرہواں برج)

"اچانک اس نے خود کو جادوگرنی کے سامنے پایا جو جھاڑو پر اڑتی تھی۔ وہ جس کچھوے پر سواری کرتی، اس کی پشت اونٹ کے کوہان سے بھی اونچی تھی، وہ چھپکلیوں کا ناشتہ کرتی، سیہہ کا شوربہ پیتی، غصے میں آتی تو بال سانپ بن کر پھنکارے مارتے، اپنا بال توڑ کر آگ میں ڈال دیتی تو اڑتی چنگاریاں بونوں میں تبدیل ہو جاتیں۔۔ ایسے بونے جن کے بھالے زہر میں بجھے ہوتے۔۔ اس کا گوشت ہڈیاں چھوڑ چکا تھا۔ پیلے منہ میں سیاہ دانت سنگریزوں کی مانند تھے مگر جھریوں کے بھنور میں انگارہ آنکھیں اس کی منتظر تھیں۔" (پکار)

حقیقی دنیا کی عورتیں انھی اساطیری عورتوں کا پرتو ہیں، وہ کاسانو وا ۱۹۷۲ء کی ناہید ہو یا طوطا کہانی کی بیگم جمال۔ علامتی مرد کی بھٹیاری یا بسیرے کی جورو، ان عورتوں کی ساخت اسی سپید و سیاہ مٹی سے گوندھی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے مردانہ کرداروں میں جس مردِ خدا نما کی سب سے زیادہ تکرار ہے وہ ہے حاتم:

"حاتم بندہ ءحرکت تھا، عمل سانس کے مانند ناگزیر مہم جوئی رگوں میں دوڑتے خون کے مانند۔ اسی لیے دوسروں کی دلجوئی اور خوش نودی کے لیے سرگرم رہتا کہ خدمت خصلت میں تھی۔ عرب کے کتنے ہی قبائل تھے لیکن جیسا نام قبیلہ طے کا اس نے روشن کیا اور کسی نے اپنے قبیلے کا نام اونچا نہ کیا۔ دوسروں کی مراد براری کے لیے حاتم نے خود پر دن کا آرام اور راتوں کی عیش حرام کر رکھی تھی۔ وہ دوسروں کی خاطر گھر سے بے گھر ہوا۔ غیروں کے لیے اجنبی زمینوں میں جاں گسل مہمات سر کیں۔ بیگانوں کی بہبود کے لیے کیسے خطرناک طلسم توڑے اور کیسے کیسے ساحروں کو مات دی۔ وہ تو زمین کا گز بنا رہا، نہ اپنے لیے نہ اولاد کے لیے اور نہ ہی عزیز و اقارب کے لیے۔ صرف غرض مند غیروں کے لیے، خالص خدمت کی بہترین مثال۔" (حاتم طائی کا زوال)

حاتم کی خدمت گاری کو ڈاکٹر سلیم اختر اسی طرح شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس طرح قیس و فرہاد، عیسیٰ اور یوسفؑ کے کارناموں کو مرزا غالب اپنی مہم جوئی سے کم گردانتے تھے۔ حاتم کے توسط سے کئی افسانے ملتے ہیں، حاتم طائی کا زوال، جیون جل تو خیر براہ راست افسانے ہیں، جن کا لب لباب یہ ہے کہ حاتم نے دوسروں کے گھر کے چراغ روشن کیے اور اپنا گھر بے چراغ رہا، منیر شامی کی بجی سجائی اور خود حسن آرا کے عشق میں بے مراد رہا ہے، اس موضوع کا کلائمکس ہمیں افسانہ ''پیرِ تسمہ پا'' میں نظر آتا ہے:

''تب ایک پُر شباب نوجوان کا گزر ہوا، جس کے تیور دیکھ کر حاتم کو اپنی جوانی یاد آئی۔ اس نے صدا لگائی'' اے جانے والے۔''

''کیا بات ہے بابا۔'' نوجوان نے قریب آ کر ادب سے پوچھا۔

''بیٹا ذرا ندی پار کرا دو۔''

''کیا آپ کو تیرنا نہیں آتا؟''

''آتا تو تھا بیٹے۔ کبھی بہت کچھ آتا تھا، مگر اب میں بے بس ہوں۔ تم برائے خدا میری مدد کرو اور دوسرے کنارے پر اتار دو۔''

نوجوان نے حاتم کو، اپنے پر قوت بازوؤں سے اٹھا کر، اپنے مضبوط کندھوں پر بٹھا لیا اور چلا ڈلکی! حاتم نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی اور اپنے جسم کو نوجوان کے جسم کے ہچکولوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔ اسے بہت مزہ آ رہا تھا، عافیت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ تختِ رواں پر بیٹھا گویا چوتھے آسمان کی جانب محوِ پرواز تھا۔'' (پیرِ تسمہ پا)

حاتم کی پرچھائیں ایک اور افسانے میں جلوہ گر ہوتی ہے:

''چند روز کے بعد ایک سمت کا راستہ لیا تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک آدمی پر نظر پڑی کیا دیکھتا ہے کہ وہ اس کی طرف آ رہا ہے۔ جب نزدیک پہنچا تو حاتم کو سلام کیا اور آئینہ بغل سے نکال کر، حاتم کو دیا۔ حاتم نے لے کر منہ دیکھا اور پوچھا کہ ''تُو تو حجام ہے جو آئینہ دکھاتا ہے۔'' (زنجیر)

ایک اور افسانے میں حاتم کا ذکر دیکھیے۔

''اور تب حاتم نے کہ سفر کی گرد میں ملبوس تھا۔'' آن کر کہا۔

''سن اے ماہ لقا! کوہ ندا کا راز خاموشی ہے۔''

''کیا تم اس خاموشی کا راز پانے کے لیے سفر نہ کرو گے۔

ہر گز نہیں۔

اس کے لیے مجھے داخلی خلا میں جانا ہوگا۔

اسی سے فرار کے لیے تو میں دوسروں کے لیے مہمیں سر کرتا پھرتا ہوں۔

اور یوں اس پاگل سوال نے حاتم کا شاندار کیریئر تباہ کر دیا۔'' (خاموشی کا کیپسول)

ڈاکٹر سلیم اختر کی مردانہ کردار نگاری کا جوہر، دوسری بار وہاں کھلتا ہے، جہاں وہ قریبی تجربے سے سکول ماسٹروں اور فو دولتیا دوستوں یا بزرگوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کرداروں میں کچھ ہم جنسیت کی جانب مائل نوخیز لڑکوں کے شکاری ہیں۔ آگ تاپنے کے فوائد کا ماسٹر بشیر احمد، بی ٹی جو بتدریج اپنے آپ کو ست اور بور محسوس کرنے لگا ہے؛ رگوں کا سرخ اور گرم خون پہلے پانی اور اب سیہ ہو چکا ہے اور اب وہ اپنی مستقل سستی اور اعصابی چڑ چڑاہٹ کا علاج ڈھونڈ رہا ہے۔ اچانک اسے کمیشن میں ملنے والی رقم کے عوض، اس کے دوست کی بیوی کی، جسمانی رفاقت حاصل ہوتی ہے اور وہ چونچال ہو جاتا ہے۔ دوسرا خبیث دلپٹر کا پی ٹی ماسٹر ہے، جس کے نقشہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس طرح کھینچا ہے:

''پی ٹی ماسٹر انتہا کے غصہ، جوش، محبت اور خوشی کا اظہار پنجابی میں کرتا تھا۔ ویسے بھی وہ کوئی عالم فاضل یعنی بی اے بی ٹی ماسٹر تو تھا نہیں، حوالدار باپ کی تین بیٹیوں کے بعد یہ چوتھا بیٹا تھا اور بذا من فضلِ ربی کے باوجود بھی وہ دو بیٹیوں کے جہیز کی فکر میں ایسا ڈوبا کہ اس نے بچے کے لیے لمبی چوڑی تعلیم کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کم تعلیم کی کسر یوں پوری کر دی کہ خوشامدوں، سفارشوں اور اپنی حسنِ کارکردگی کے سہارے اسے سپاہی بنوا دیا۔ حالات کے زوال کے باعث وہ سپاہی سے ماسٹر تو بن گیا لیکن قانون کے محافظ سے قوم کے خادم کے رتبہ پر آ گرنا، آسمان سے گرا کر چاہِ بابل میں قید کر دیے جانے کے مترادف تھا۔۔ وہ سوائے ہیڈ ماسٹر کے، کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔۔۔ موٹے تازے جسم پر خاکی

قمیص اور بالوں سے بھری رانوں کو نیکر میں پھنسائے ہاتھ میں سیاہ رول لیے اور مونچھیں پھڑ پھڑاتا سکول کے برآمدوں میں یوں اکڑ اکڑ کر چلتا گویا ایس پی ''لائن'' کے معائنے کو نکلا ہو۔'' (خبیث دا پتر)

ایک کردار احمد علی کامران بی ٹی کا ہے، کسی انجمن کے زیر اہتمام چلنے والے ہائی سکول کی ٹیچری، اس کی زندگی کی معراج تھی۔ وہ اس معراج پر تو پہنچ گیا لیکن مولوی اکبر کی صاحبزادی رقیہ بیگم کے ہاتھوں شرمندگی کے باعث امتیاز کو تختہء مشق بنانے کا منصوبہ بنا بیٹھا۔ کامران اس لمحے اسی احساسِ جرم اور خوف میں مبتلا ہے، جس میں سلیم اختر کے کم و بیش مردانہ کردار میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں:

''سرد پانی اسے جلتے سینے میں ایک برے کی طرح اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ خود میں عجیب سی سنسناہٹ محسوس کر رہا تھا، امتیاز نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ماسٹر جی کی متغیر حالت دیکھ کر سہم گیا۔ کامران نے کپکپاتے ہاتھوں سے اس کے کندھے پکڑ لیے اور تھوک نگل کر، جب وہ بمشکل بولا تو اس کی آواز محض کپکپاتی سرگوشی تھی۔'' (تختہء مشق)

ایک ایسا ہی کردار ہمیں افسانہ ''پابندیء وقت کے فوائد'' میں دکھائی دیتا ہے، ماسٹر عنایت، وہ عنایت آج کل ذہنی لحاظ سے بہت پریشان تھا، اس کی زندگی بالکل سپاٹ تھی۔ اس میں نشیب و فراز اور جذباتی موڑ نہ تھے۔ عام سے گھرانے میں پیدا ہوا، مگر بی اے بی ٹی کیا اسے فوری ملازمت مل گئی۔ کچھ ٹیوشن بھی مل جاتی یوں وہ معقول پیسے بنا لیتا:

''بعض اوقات کوئی لڑکا اعصاب پر سوار ہو جاتا تو پھر پیرِ تسمہ پا کی طرح، اس کے تصورات کو جھٹکنا ناممکن ہو جاتا۔ اس نے اس رجحان پر قابو پانے کے لیے جنس ابھارنے والے ناول پڑھے، انگریزی فلمیں دیکھیں، بعض خرانٹ دوستوں کی مہمات کے تذکرے بھی سنے مگر وہ عورت کو دیکھ کر کبھی بھی بدمست نہ ہو سکا۔''

چناں چہ ماسٹر عنایت کو کم صورت بیوی کی رفاقت راس نہ آئی اور جوں ہی وہ حاملہ ہوئی اس نے اسے گھر بدر کر دیا۔ اب ظاہر ہے، اسے خوبصورت لڑکوں پر اکتفا کرنا تھا اور اگر وہ ہاتھ نہ آتے تو پھر انھیں

"اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔" کی داخلی منطق سمجھانے کے لیے پابندی وقت کا درس دیتا تھا۔۔۔ سو وہ اسی درس پر کار بند رہا۔ یہیں کچھ چکنے، امرد پرستی کی طرف مائل کرنے والے لڑکوں کا ذکر ہو جائے:

"اس کے گلابی ہونٹ بھرے بھرے تھے۔ نچلا ہونٹ بھرا بھرا ہونے کی وجہ سے اور نیچے لٹکا تھا، اوپر کا باریک ہونٹ ایک خاص طرح کی سنجیدگی لیے تھا بالائی لب اور بالوں کی سرمئی لکیریں، گلابی تل دمک رہا تھا، ماسٹر عنایت نظروں نظروں سے اسے گھول کر پیے جا رہا تھا۔" (پابندیء وقت کے فوائد)

"جب ماسٹر ہمدم نے ٹیم کا انتخاب کیا تو احسان کو، بارھویں کھلاڑی کی حیثیت سے، ٹیم میں شامل کیے جانے پر، بعض کھلاڑیوں نے چہ مگوئیاں کیں۔ آٹھویں جماعت کے اس طالب علم کو کپتان ہی نے ماسٹر ہمدم سے متعارف کرایا تھا گو اس امریکہ کی دریافت کا سہرا کپتان کے سر بندھتا ہے۔ احسان میں بظاہر تو نسوانی حسن اور گلے کے علاوہ اور کوئی خوبی نظر نہ آئی، کندنی رنگت میں عجب قسم کی نمکینی بھی تھی۔ روشن بھوری آنکھیں اور خمیدہ لبوں پر عجب شرمیلی مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ بغیر بالوں کی بھری بھری رانوں اور پتلی کمر کے درمیانی ابھار میں نیکر پھنس کر رہ جاتی۔۔۔ اس کی چال میں خمیدہ شاخ جیسی لچک تھی، ایسے محسوس ہوتا، جیسے وہ چلتے وقت اپنے آپ سے بھی شرماتا ہو۔" (بارھواں کھلاڑی)

ماسٹر ہمدم کی قلمی تصویر بھی ذہن نشین ہو جاتی ہے:

"شاعر ہونے کے باعث اصولی طور پر تو انھیں اُردو یا فارسی کا ماسٹر ہونا چاہیے تھا لیکن وہ اُردو کے نہیں بل کہ جغرافیے کے ماسٹر تھے۔ چھوٹا سا قد، سیاہ چمکیلا رنگ اور گول مول جسم اتنا گول کہ قمیص سے ان کی دو چھاتیوں کا ابھار دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ غیر شادی شدہ تھے اور ان کے بارے میں کچھ شادی شدہ دوستوں یا بعض ناخلف شاگردوں نے بُری بُری باتیں مشہور کر رکھی تھیں۔" (بارھواں کھلاڑی)

اُداسی اور تنہائی کے لمحات میں وہ کبھی نشاط کو خط لکھتی، کبھی نشاط کی تصویر کے سامنے خط لکھتے ہوئے اس

کا جسم کانپ اٹھتا۔ وہ اپنا ٹرنک کھولتی جس میں عطر میں بسے ڈی ایم سی کے دھاگوں سے کاڑھے گئے رومال تھے، کچھ محبت نامے اور کم گو استانی کی راز دار سہیلی اس کی ڈائری، مس رشیدہ احمد مالیاتی مصیبت میں نہیں، صرف اپنے بھائیوں اور بھابیوں کی فوج ظفر موج سے فرار کے لیے ملازمت کا سہارا لیے ہوئے تھی۔ بچپن میں ماں فوت ہوگئی، جو ہمہ وقت پیٹ میں غم کے گولے کی شکایت کیا کرتی تھی۔ سب چھوٹوں کی شادیاں ہوتی چلی گئیں لیکن مس احمد پر باپ کی نظر ہی نہ پڑی:

"پہلے تو وہ اپنے باپ کو اتنی چھوٹی نظر آتی رہی کہ وہ اس کے رشتے کا سوچ ہی نہ سکا اور جب وہ جوان نظر آنے لگی تو رشتہ دیکھنے والیوں کو بوڑھی۔ سکول میں پہلے وہ "آپا جی رفعت" پر جان نچھاور کرتی رہی، اس سے پہلے ناز، پر جو بڑے باپ کی لاڈلی بیٹی تھی اور جس کا قرب رشیدہ کے اعصاب پر مستقلاً نشہ طاری کیے رہتا، لیکن آپا جی رخصت کی قربت اور مردانہ محبت کی نفرت کے مستقل سبق نے مس احمد کو یہ ارادہ کرنے پر مجبور کیا تھا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی۔۔۔ چناں چہ اب وہ کچھ کچھ ہسٹریائی کیفیات کا شکار ہوتی چلی گئی۔ اسے بورڈنگ میں ایک طالبہ کے ساتھ ملوث پایا گیا تو اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ نئے شہر میں اس نے نئی طرح کی زندگی اپنائی، لڑکیاں اسے کسی المیہ کی ہیروئن سمجھتیں، وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتی، بہت کام کرتی اور اپنی ڈائری میں مگن رہتی۔"

کھونٹا، بنجر مرد اور زرخیز عورتیں، متوازی لکیریں، بسیرے کی جورو اور سیفو بھی اپنی اپنی جگہ جنسی ناآسودگی، ہم جنسیت اور مردانہ وار زندگی گزارنے کے اوصاف رکھتی ہیں اور جلے پاؤں کی بلی کی طرح اپنا بہروپ بدلتی رہتی ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں میں ناجائز بچوں اور طوائفوں کے لیے ایک نرم گوشہ موجود ہے، وہ اس صورت حال کو گناہ سے زیادہ ایک حادثہ قرار دیتے ہیں۔ اس جرم میں شریک مرد اور بستیاں ان کے نزدیک عذاب کی زد میں ہیں۔ آدھی رات کی مخلوق، بے چراغ بستی کا چراغ، چھوٹی اینٹ، کنول کنڈ عذاب میں گرفتار بستی، کانا چور، آخری سبق انہی موضوعات کے افسانے ہیں۔ زیادہ چابک دستی سے لکھا گیا ڈاکٹر سلیم اختر کا افسانہ گندہ خون اس موضوع پر ناقابل فراموش افسانہ ہے۔ ناظم کے دادا بڑے

خان صاحب کی جلالت مآب شخصیت کی پیکر تراشی ملاحظہ ہو:

''چوڑی ہڈیاں اور قوی جثہ رکھنے والے وجیہہ بزرگ تھے۔ سفید پٹے اور بڑی بڑی سفید مونچھیں آواز کی گرج عمر کی چغلی نہ کھاتی تھی۔ بڑے خان صاحب قدیم دور کے وہ روایتی راجپوت معلوم ہوتے تھے، جو اب صرف کاسٹیوم فلموں میں دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ایسے راجپوت تو اب راجستھان میں بھی ناپید ہیں۔ ان کے مزاج میں بھی وہ طنطنہ تھا، جو اس جاگیردار کے مزاج میں پایا جاتا ہے، جو ایک سیکنڈ کے تردد کے بغیر اپنے مزارعے کے پچاس جوتے لگوا سکتا ہو۔ انھیں اپنی اعلیٰ نسبی پر بڑا فخر تھا اور انھوں نے بھی اپنے آبا کی مانند ہزار جتن سے خون کو ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ رکھا تھا۔۔ سب مالک سفید گول چٹے اور سرو قد تھے۔ ان کی آنکھوں میں جو سنہری مائل نیلاہٹ تھی، اس نے صدیوں سے رنگ نہ بدلا تھا۔ جب کہ کھڑی ناک کو ان کا ٹریڈ مارک سمجھا جا سکتا تھا۔'' (گندہ خون)

لیکن افسانے کا ڈراپ سین اس شاندار اور پاکیزہ خون کے خواص ظاہر کرتا ہے

''موجو نے اپنے بیٹے کو کان سے پکڑ اکر اٹھایا اور سب سے مخاطب ہوا ''حضور اسے دیکھیے کیا یہ سفید رنگ میرا ہے؟ کیا یہ اونچی ناک میری ہے؟ کیا یہ چمکیلی آنکھیں میری ہیں۔۔۔ یہ گندہ خون ہے، یہ گندہ خون میرا نہیں ہو سکتا۔ میرا خون ہوتا تو میری مانند آپ کی جوتیوں میں رہتا۔'' پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر چیخا ''بول کنجری۔۔ بول۔۔ یہ کس حرام زادے کا ہے۔'' (گندہ خون)

کرداری افسانوں میں جہاں سانتا کلاز کی سراپا نگاری کی گئی ہے اور حاتم کی طرح اسے استہزا کا نشانہ بنایا گیا ہے، وہیں رزق حلال کے ماسٹر صاحب کا تذکرہ اشد ضروری ہے:

''ماسٹر کرم داد دینیات کے استاد تھے اور اپنی سخت گیری کے لیے خاص شہرت رکھتے تھے۔ داڑھی کھچڑی، گھٹا ہوا سر، ٹخنوں سے اونچی شلوار، سر پر رومی ٹوپی، جب غصے میں آتے تو دانتوں میں داڑھی لے لیتے اور ہاتھوں میں لڑکے کے

بال۔ ان کا جثہ اور ہاتھ دونوں ہی بھاری تھے۔۔۔ ایک ہاتھ کے ناخن بڑھا رکھتے تھے اور جس بدقسمت پر زیادہ غصہ آتا کان کی لو میں دونوں ناخن یوں چبھوتے کہ گوشت چیر کر ناخن مل جاتے۔"

امتدادِ زمانہ سے ماسٹر کرم داد کے حلیے میں اس طرح تبدیلی آجاتی ہے:

"داتا صاحب کا عرس تھا، ہجوم میں ماسٹر کرم داد نظر پڑے۔ داڑھی سفید تھی اور سر کی رومی ٹوپی میل سے چکٹ ہو رہی تھی۔ اس کا پھندنا ندارد تھا اور ڈھیلی ہو کر کانوں کو ڈھانپ رہی تھی۔ چہرے کا سانولا پن اب باورچی خانے کی دھواں کھائی دیوار کی رنگت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی البتہ آواز کا کڑاکا ویسا ہی تھا۔ لے لو پنج سورے، دعائے گنج العرش لے لو، آیت الکرسی، داتا دے پیاریو، لے لو۔" (رزقِ حلال)

تیسری بار ماسٹر کرم داد یوں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

"میں پلٹ کر دکان میں آیا تو واقعی ماسٹر کرم داد ہی تھے۔ مجھے گلے لگایا تو عطرِ حنا کی مہک آئی، سفید بے داغ لباس، روشن چہرہ، آنکھوں میں سُرمے کی لکیر، نورانی داڑھی اور مہندی میں رنگلے بال، سر پر کلہ باندھ رکھا تھا۔ یہ وہی ماسٹر کرم داد ہیں جو رزقِ حلال کمانے کے لیے آنہ لائبریری والوں کے لیے جنسی کہانیاں چھاپنا چاہتے ہیں"۔ (رزقِ حلال)

"کم بخت کتنی ہی کیوں نہ چھاپ لو، طلب ہی ختم نہیں ہوتی ان کتابوں کی۔"

ڈاکٹر سلیم اختر کے کرداری افسانوں میں ایک اور افسانہ جو جنسیت کے مکمل مفہوم کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور جہاں مرد و زن ایک ہی سطح پر کھڑے، ایک دوسرے کی ساحری کو للکار رہے ہیں، گرو دکشنا کے نام سے اپنی مثال آپ ہے۔

افسانے میں شاگرد کا گرو بھی اس سے وہی کچھ طلب کر رہا ہے، جو اس چیلے سے ناری نے طلب کیا ہے۔ دونوں ایک ہی شخص پر دنیا و مافیہا کے راز آشکار کرنا چاہتے ہیں؛ دونوں اس کے خیر خواہ اور تربیت

کرنے والے ہیں؛ دونوں اسے کائنات کے موہ مایا کے جال سے رہائی دلانے والے ہیں؛ دونوں اسے مغلوب کرنے کے داؤ پیچ جانتے ہیں:

''چیلا ایک دوراہے پر کھڑا اس وچار میں تھا کہ ودوا اور ویشیا میں سے کون اگنی ہے اور کون جل پھر وہ سوچتا ہے: ''یہ چنتا میری تو نہیں نہ میرا ودوا سے سمبندھ نہ ویشیا سے۔ میرا تو سرے سے ناری سے ہی کسی طرح کا سمبندھ نہیں۔۔ میرے لیے تو دونوں ہی بے کار ہیں، خواہ اگنی ہوں یا جل۔۔۔ ہم برہم چاری ہیں ناٹک اور رس سے کیا لینا؟''

اور یہیں ادھ کھلے ہونٹوں اور سفید دانتوں کے چمکیلے موتیوں والی ویشیا اسے کہتی ہے:

''شکتی شالی منش بھوگ کی پرکشا میں سپھل رہتا ہے، پرنتو ناری کے یدھ میں وجے اسی پرش کو پراپت ہوتی ہے، جو اپنی جوالا کے لیے ناری کی جوالا کو جل لینے کی شکتی رکھتا ہو۔۔۔ ناری رس ہی جیون رس ہے مہاراج''

اور وہ لچھمن ریکھا الانگ گیا اور اب سوچتا ہے کیسے بتائے گرودیو کو! یہ دکشنا تو وہ کسی اور کو دے آیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں کی دوسری بڑی خصوصیت منظر نگاری کا اسرار ہے۔ اکثر افسانے ایک مخصوص خوف، جبر، گھٹن، حبس اور عصابیت کے دباؤ کے اظہار سے شروع ہوتے ہیں، ان فضاؤں میں آہستہ آہستہ اپنے پنکھ پھیلاتے ہیں، جو دیو مالائی داستانوں کی صحبت میں پروان چڑھی ہیں:

''حبس، ایسا شدید حبس کہ اپنے چپچپاتے جسم کے پسینے کی بو کے حصار میں دم گھٹ جائے۔ پسینہ میں بھیگے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا گویا مردے کے بال سہلا رہا ہو۔ وہ مردہ جس کے سر میں پسینہ چیونٹیوں کے مانند مرگیا۔۔۔ جنگل کے درخت افسردہ، آزردہ کسی کے ماتم میں سر جھکائے ساکت، طائروں کی آوازوں اور پروازوں سے خالی وحشت ناک، دہشت ناک۔۔ سیاہ چیونٹے دیوانہ وار بھاگے جارہے۔ نادیدہ غذا کی خوشبو کی ڈور سے بندھے۔۔ اصل خوف تو تھا ان بدروحوں کا، جو جنگل کے بلند اشجار، گھنی

جھاڑیوں اور کھوکھلے تنوں میں بسرام کرتیں۔۔۔پلید کی روح، غلیظ کی روح۔۔
نانہجار کی روح۔۔۔سب بدروحیں یہاں جمع تھیں، تیز ہوا کی سرسراہٹ میں
سانپوں کی سرگوشیاں (بے چراغ بستی کا چراغ)

ایک اور آغاز دیکھیے:

''عجب خطہ تھا، سیاہ رنگ کی کوڑھیالی زمین ایسی گویا دھرتی کے رستے زخم، جم کر، کھرنڈ میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ کنارہ کے اشجار اور پودوں سے خالی پایاب ندی میں رینگتا سیاہ گاڑھا پانی، گویا لاوا جم جانے کو ہے۔۔اشجار کے زخمیلے تنے، زنگ خوردہ شاخیں، مردہ بدن سے لٹکے بے جان بازو تھے، خارش زدہ چھال والے درختوں پر گویا پتھریلے پرندے سستی سے چونچ کھولتے مگر خرخرا کر رہ جاتے۔'' (جبل ممنوعہ)

''تیرہواں برج'' کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''عجب سماں اور عجیب تر منظر تھا۔ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی کمی کا احساس کرچی کے مانند چبھن پیدا کر رہا تھا۔ چھتر چھایا سے محروم اشجار کی جڑیں مردے کی سوکھی اور مڑی تڑی ٹانگوں جیسی تھیں، اوپر کو اٹھتی شاخیں، گویا دستِ بدعا کی بے خون انگلیوں کی ہڈیاں ہوں۔ بے ثمر اشجار کی جڑوں میں کھردری کھال والے ایسے سانپ کلبلاتے، جو عالم جوش میں دُم کھڑی کرتے تو وہ جھنجھنے کے مانند بج اٹھتی۔۔۔موت کا یہ زہریلا جھنجھنا ان بے برگ و بار درختوں کی جڑوں میں مسلسل بجتا رہتا۔ بے مہک جنگل کی مردہ ہوا سانپوں کے جھنجھنے کی آوازیں اوپر نیچے دائیں بائیں لے جاتی۔ بے رنگ باغ میں سانپوں کے جھنجھنے مسلسل گونجتے رہتے۔ یہ اس منظر کا حصہ بن چکے تھے۔'' (تیرہواں برج)

خوف اور دہشت کا یہ منظر نامہ اپنے صوتی تاثرات رکھتا ہے، یوں لگتا ہے مصنف کے سامنے ناظر اور سامع بیٹھے ہیں اور وہ پردہ خیال پر، اپنے پسندیدہ منظر نامے تشکیل دیتے ہوئے اشکال اور صوتیات کی مدد سے ان کی جان قبض کر لینا چاہتا ہے۔ بہت سے افسانوں میں ان خوف کے منظر ناموں نے پس منظر

کا کام کیا ہے۔ اس پس منظر کی اکائیوں سے مصنف اپنے علامتی افسانوں کو آگے بڑھاتا ہے۔ جبر، گھٹن ، اسرار، لذت مرگ اور بلاوے کی تاثیر رکھنے والے پس منظر سے کہانی کے کردار اس طرح ابھرتے ہیں جیسے صحرا میں نخلستان آ گیا ہو:

''چمکیلے بالوں کے سیاہ ہالے میں نمکین مکھ دمک رہا تھا۔ بڑی بڑی کٹوار آنکھیں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔'' (تیرہواں برج)

یہ علامتی خوف ان افسانوں میں اور بھی کامیاب ہے، جہاں مصنف نے زمانہء خیال کو زمانہء حال سے ملا دیا ہے اور زباں بندی کی فضا قدیم وجدید مطالبات سے سج گئی ہے۔ ایسے افسانوں میں کاٹھ نگر میں پتلی تماشا، احمق کٹھ پتلی، کھجوروں کا موسم، پانچویں کھونٹ، اماوس اور تذکرہ اشجار بطور خاص قابلِ ذکر ہیں:

''وہ دوبارہ ہنسی۔ ابھی اس کی ہنسی کی گونج ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک طویل القامت شجر جھکا؛ اس کی مضبوط شاخوں کے پھیلے بازوؤں نے انھیں اچک لیا۔ پیشتر اس کے کہ ان کے کھلے حلقوں سے خوف کی چیخیں برآمد ہوتیں، دونوں شجر میں سما چکے تھے۔'' (تذکرہ اشجار)

''مشاق ہاتھوں نے درخت کا تنا دبایا تو انسانی جسم کی مانند گرم پایا۔ واقعی یہ عجیب درخت ہے، درخت کا تنا بازوؤں کے حلقہ میں لے کر بھینچا تو درخت میں دوڑتے خون کی سنسناہٹ محسوس کی، درخت واقعی زندہ وجود محسوس ہو رہا تھا؛ گویا ابھی پھیلے بازو سمیٹ کر، اسے گلے لگا لے گا۔ پھر وہ لرز گیا یہ سوچ کر کہ کہیں یہ جنگل کا آسیب تو نہیں یا کوئی پلید روح یا پھر چھلاوہ۔'' (کاٹھ نگر میں پتلی تماشا)

''پھر ایک دن وہ سچ مچ ہی پاگل ہو گیا۔ اس نے کلہاڑی اٹھائی اور کھجور کے درخت کے تنے پر اپنی پوری دیوانگی کی شدت کے ساتھ ایک کاری ضرب لگائی اور لوگوں کی حیرت سے پھٹی آنکھوں نے دیکھا کہ اس کے دوست کو کھا جانے والا درخت ایک ہی ضرب میں ڈھ گیا۔ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا مگر پیشتر اس

کے کہ اس کا کھلا منہ بند ہوتا ایک اور درخت، اسے اچک چکا تھا۔'' (کھجوروں کا موسم)

اسی طرح ''عذاب میں گرفتار بستی'' کا اختتام دیکھیے۔

''یہ کیا؟ بادل کے ساتھ چلنے والی ٹھنڈی ہوائیں کیا ہوئیں، لو کے تھپڑ تو اسی طرح پڑ رہے تھے اور پر بادل بھی بہت چھوٹا تھا، تمام آسمان پر چھا جانے والے یہ مست ہاتھی نہ تھے بل کہ یوں لگتا تھا جیسے صرف ایک ہی ہاتھی ساتھیوں سے الگ ہو کر ادھر آنکلا ہے اور اب وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ بادل نہ تھا یہ تو کچھ اور تھا۔ ہوا میں عجیب شور تھا اور پروں کی سائیں سائیں، یہ تو ٹڈیاں تھیں، ٹڈی دل، ہزاروں لاکھوں ٹڈیاں! مال غنیمت کے متلاشی فتح یاب لشکر کی طرح ان پر ٹوٹ پڑیں۔ انھوں نے جی بھر کر آدمی کھائے، موٹی موٹی خوبصورت سپنے دیکھنے والی آنکھیں، بھری بھری چھاتیاں، سپنوں میں دھڑکتے دل، پیار کے گیت گانے والے ہونٹ، زمین کا سینہ چیرنے والے ہاتھ، بالوں میں کنگھی کرنے والی انگلیاں، بچوں کا نرم گوشت۔'' (عذاب میں گرفتار بستی)

اعصابی تشنج اور غیر معمولی ہیجانات کے یہ افسانے حقیقت نگاری کی تلخی اور سفاکی لیے ہوئے ہیں۔ الجھاؤ، بے معنویت، استحصال اور دیوانگی کی اسی اجتماعی فضا سے بچہ جمورا، شاہی دستر خوان اختتام اور ظلِ ہما جیسے حیران کن افسانے برآمد ہوئے ہیں۔

ظلِ ہما بہت شاندار افسانہ ہے، بادشاہت کی تہذیب اور حماقت کے عرفان کو یک جا کرتے ہوئے جس لمحہ ظلِ الٰہی ظلِ ہما بھون کر کھا جاتے ہیں اور اپنے وزیر با تدبیر کے لگے بندھے موتیوں کی خوراک پر غالب آجاتے ہیں تو بنیادی حقوق، مشورہ پسندی اور دوسروں کی بلا جواز اجارہ داری کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

آئینہ تکرار تمنا، بے چہرہ لوگ، خاموشی کا کیپسول کو تجریدی افسانے قرار دیا جاسکتا ہے کہ ان افسانوں میں کہانی ابہام کی گرہیں نہیں کھولتی۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں کی تیسری بڑی خوبی مصنف کا اسلوب، زبان دانی، جزئیات نویسی اور

کہیں کہیں طنزِ لطیف کے شاندار سٹروک ہیں۔ ایسے مقام پر ان کا قلم کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوتا۔ بیان کی اسی خوبی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذرا یہ تفصیلات دیکھیے:

''وہ اسے جنگل کے اس حصے میں لے آئی، جہاں آج تک اس کا گزر نہ ہوا تھا، برق گرنے سے سوختہ گھاس کے نیم دائرے میں جلے درخت کا سیاہ کھوکھلا تنا تھا۔ لمبی سانس لے کر وہ اس پر بیٹھ گئی، جو گھاس یا پھول جلنے سے بچ گئے تھے، جس کی بوجھل فضا میں وہ مردہ ہو رہے تھے۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ بغور دیکھا تو بڑھیا کا سربل کہ سارا جسم ہی بالوں کے بغیر پایا، زرد سلوٹوں والے چہرے پر پلکیں ندارد، بالوں بغیر بازوؤں اور پنڈلیوں کا گوشت ہڈیاں چھوڑ چکا تھا۔ زرد گوشت کے لوتھڑے نے، بے دانت کا منہ کھولا تو سرخ زبان گویا باہر گرنے کو ہے۔ بحیثیت مجموعی اس سے خوف کم اور کراہت کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ جسم سے خارج ہونے والی بدبو، جس میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ یہ بدبو صدیاں بغیر غسل گزار دینے کے باعث تھی یا مردہ خوری کی وجہ سے۔۔۔ کون جانے؟ اس کے جسم میں جھرجھری کی لہر دوڑ گئی۔ (بے چراغ بستی کا چراغ)

زبان دانی کا یہ طریقہ اور تفصیل سازی کے ذرائع، مصنف نے داستانوی مطالعے اور اپنی افتادِ طبع سے حاصل کیے ہیں:

''راہیانِ خوش بیان کی بموجب مینوسواد مملکت میں بدخواہیوں، بدباطنوں، بدساعتوں اور بداندیش باغیوں اور سازشیوں کی کمی نہ تھی۔ جبھی تو آئے دن ڈھول پیٹ کر نقیب کسی مجرم باغی کی سزا کا مژدہ سناتا تو لوگ ہزار کام چھوڑ کر سزا میلے میں شرکت کرتے لیکن پھر بھی یہ نہ سمجھ پاتے کہ ایسے رحمدل، عادل، سخی اور اسی لیے مقبول و ہردل عزیز شاہ کی مخالفت کیسے کی جاسکتی ہے۔ دراصل بنائے فساد وبے نام ونسب، جعلی شاہزادے تھے، جو زمان غیر منکوحہ سے ملاپ کی ضمنی پیداوار کے طور پر معرض وجود میں آ گئے تھے۔ مورخانِ خوش قلم طراز ہیں کہ شاہوں کے شبینہ اشغال کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں چناں چہ ان کے والد اور پھر

ان کے والد کے شبینہ اشواق کے نتائج بد بھی تو دعویٰ رکھتے تھے، مگر نادان یہ نہ جانتے کہ شاہی محل میں پیدائش کا شہزادگی اور تاج و تخت کی وراثت سے کوئی تعلق نہیں، شہزادہ تو شاہی محل کے علاوہ بھی جنم لے سکتا ہے۔ یہ بیج اور زمین کی مثال سے کہیں اونچی اور گہری بات تھی، جس کی رمز وہ کوڑھ مغز نہ سمجھ پاتے لہٰذا آئے دن قلعہ کی فصیل سے نیچے گرائے جاتے۔" (بلندی کی حد)

جزئیات نگاری اور تاثرات کی گہری چھاپ کے لیے مصنف کسی بھی چیز کو علاحدہ علاحدہ کر کے دیکھنے اور دکھانے کا ہنر جانتا ہے۔ افسانے میں جزئیات کی یہ خوبی کردار اور واقعے سے قاری کی گہری مانوسیت کی دلیل ہے:

"روش کا موڑ کاٹا تو نگاہ کی قوس کے کنارہ پر اسے پایا۔ سرخ پھولوں کے انگاروں میں نمکین پھول، وجود کی خوشبو میں گم، پیشانی میں انہماک کی شکن، دراز پلکوں کے سایہ میں بادامی پپوٹے، چہرے کی سانولی کتاب پر تل کا سیاہ نقطہ اور بیضوی ٹھوڑی میں چھوٹا سا دائرہ۔۔۔ مانندِ تصویر ساکت، صرف گردن تلے ابھار میں سانس کی لرزش۔" (پریاں قطار اندر قطار)

"اب تک اس نے کبھی عورت سے اگر پہلے تعلق کے بارے میں سوچا تو اس کے ذہن میں ہمیشہ سرخ جوڑا پہنے، زیوروں سے لدی، ابٹن میں نہائی اور عطر میں بسی، اجلے بستر پر گٹھڑی بنی دلہن کی تصویر ابھری تھی، اس دلہن کے نقوش مبہم سہی مگر ماحول کی دیگر جزئیات، سرہانے رکھے دودھ کے گلاس اور مٹھائی کی پلیٹ سمیت بالکل واضح ہوتی تھیں۔ (ضبط کی دیوار)

ان افسانوں میں تقابلی صورت حال اکثر مضحک ہو کر طنزیہ پُر مسرت فقروں میں ڈھل جاتی ہے:

"پانچ سالہ ازدواجی زندگی، خاوند کی سر توڑ کوششوں، ماں کے تعویزوں اور ساس کے طعنوں کے باوجود وہ حاملہ نہ ہو سکی تھی۔" (بکری)

"۔۔۔اسے ابھی تک ایسا موقع کیوں نہ ملا تھا، وہ تو آڑھتی کی بیوی کو راکٹ بنا کر اڑا دیتا اور جب سے شبیر نے یہ بتایا کہ اس نے ایک دو اور عورتوں سے بھی

اس کے تعلقات کروا دیے ہیں تو وہ خود کو چارج شدہ بیٹری ایسا محسوس کرنے لگا۔'' (مثلث کا ایک زاویہ)

''جب میں اس گھر گیا تو دونوں بیٹیوں نے چائے کے ساتھ پیسٹریوں کا کام کیا۔ تن پر پیڈ والی انگیا سجائے دونوں تن کر بیٹھی تھی جیسے باپ کے اشارے پر توپ چلا دے گی۔۔ دوسری بہن کے گلے کی وی اتنی گہری تھی کہ اسے کچھ بولنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔'' (جن ہتھیلیوں پر سرسوں پھولتی ہے)

ان تحریروں میں جنسی چٹخارے کی ہنر مندی اسے فن پارہ بنا دیتی ہے۔ سوشل بننے سے سوشل اینمل بننا زیادہ مشکل ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر سلیم اختر نے افسانے کے ہنر کو ایک باطنی نشوونما عطا کی ہے۔ ان کے کردار، مکالمے اور منظر نامے شخصیت اور تخلیقی شخصیت کے درمیان بڑی ہنر مندی سے حدِ فاصل کھینچتے ہیں۔ مصنف اپنی شخصیت کے متصادم رجحانات اور نفسی میلانات کو بھی ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے چناں چہ ہر طرح کے موضوع کے افسانے کی تفہیم بہت آسان ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی اپنی شخصیت کے خوف اور اضطرار کے باوجود، اسے کوئی گنجلک یا پیچیدہ شخصیت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہر لحہ اپنے اعمال کو اپنی میزان میں تولنے والے مصنف نے شعوری سطح پر اپنے افسانوں میں اپنے آپ کو اور اپنے کرداروں کو زیادہ کھل کر کھیلنے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ اس طرح یہ افسانے معاشرتی اور تہذیبی دائروں میں گھومتے ہوئے اسی جسمانیت کے غماز ہیں، جو اپنے اندر مافوق الفطرت یا مافوق الاعادت رجحانات نہیں رکھتی۔ ان افسانوں کا مطالعہ، قاری کو گرماتا یا اضطرار میں مبتلا نہیں کرتا، بل کہ کسی پرانے حکیم کی طرح، مصنف ہر افسانے کا ایک نہ ایک اخلاقی پہلو دریافت کرتا اور لوگوں کی تربیت کرتا نظر آتا ہے۔ ''نسوانی روح'' کی موجودگی کے باوجود، انھیں سنسنی خیز افسانے نہیں کہا جا سکتا۔ داشتاؤں، طوائفوں اور ناجائز بچوں کی موجودگی بھی ان افسانوں کے اخلاقی درس و تدریس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر سلیم اختر ایک آدھ مزیدار جملے یا اشارے کے ساتھ ہی قصے کی طوالت کو اختصار کا جامہ پہنانے لگتے ہیں۔ اس طرح کردار اپنے آپ کو پوری طرح آشکار نہیں کرتے اور قرب کی سرشاری خمار کے آخری درجے سے دو چار قدم پیچھے رہ جاتی ہے۔ بظاہر مصنف آزادانہ جنسی میلانات کا علمبردار کہلانے کی کوشش میں مصروف ہے لیکن یہ میلانات مختلف افسانوں میں ضبط کی دیواروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

زیادہ تر افسانوں کا انداز خطیبانہ اور بیانیہ ہے؛ اس بیان بازی کا سہرا مصنف نے اپنے سر ہی باندھا ہے۔ بیشتر افسانوں میں وہ اُردو کے پروفیسر کی حیثیت سے، نفسیاتی نقاد بن کر یا افسانہ نویس کی شکل میں اپنی وحدت قائم رکھتا ہے۔ بکری، بسیرے کی جورو، سیفو، جن ہتھیلیوں پر سرسوں پھولتی ہے، بچھو، کا سانو وا ۱۹۷۲ء، رزقِ حلال، نیک پروین، سویٹ ہارٹ، دوسائے، محاذ ۱۹۷۱ء، میاں بیوی اور جیمز بانڈ، چالیس منٹ کی عورت، سیاہ حاشیہ اور آدھی رات کی مخلوق ایسے ہی افسانے ہیں۔ افسانوی کرداروں کے ساتھ ساتھ اپنے نفسیاتی عوامل کی تگ و دو نے افسانوں کو حقیقت نگاری کا رنگ دے دیا ہے۔ اپنی موجودگی کے باعث مصنف کو اپنے افسانے کی بست وکشاد کے لیے مصنوعی تاویلیں تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں کی بڑی خوبصورتی، ان کا اختصار اور یک پہلو وحدت نگاری ہے۔ وہ اپنی بات کو قاری تک پہنچانے کے لیے بھول بھلیوں کا راستہ اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی ماورائیت کے معنوی تصور کو عام فہم قاری کے لیے مشکل پسندی کا پیراہن پہناتے ہیں۔ اُردو ادب میں اتنا مختصر اور جامع افسانہ شاید ہی لکھا گیا ہو۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی دیگر تحریروں کی طرح، ان کے افسانے بھی ایک افادی پہلو رکھتے ہیں۔ فینٹسی ہوں، مکالمہ ہو، تمہید ہو، کردار کا تعارف ہو، رومان پرور واقعات ہوں، سلیم اختر، حسن کی تکمیل کے ساتھ ساتھ کہانی کو کسی نہ کسی منطقی انجام تک لے جائیں گے اور اپنے کرداروں سے ہمدردی رکھتے ہوئے انھیں مجہولیت سے محفوظ کرنے کا جواز فراہم کریں گے۔ ان افسانوں کا مجموعی، خواب، ایک ایسے معاشرے کی بنیاد اور ساخت سے جڑا ہوا ہے؛ جہاں امن ہو، انصاف ہو، خوش حالی ہو، خوش خیالی ہو، حسن ہو، اعتبارِ ذات ہو اور لوگ متوازن رویوں کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ سلیم اختر کا یہ بھی خیال ہے کہ شاعر، مصور اور موسیقار اس دنیا کو اپنے خیالات کی روشنی سے جگمگا سکتے ہیں لیکن جبر، استبداد اور ناانصافی کے کارندے اس دنیا کو امن کا گہوارہ بننے نہیں دیتے۔۔۔ کاش یہ دنیا کاٹھ نگر ہونے کے بجائے خواب نگر ہو، جہاں لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح غلامانہ زندگی بسر کرنے کے بجائے، آزاد پرندوں اور خوبصورت پھولوں کی طرح آباد رہیں اور کوؤں کی بستی جگنوؤں کے جزیرے میں بدل جائے۔

آراء

''ڈاکٹر سلیم اختر ایک کثیر الجہت ادبی شخصیت کے مالک ہیں، تنقید، نفسیات، افسانہ نگاری، تاریخ ادب، بچوں کے ادب کی تخلیق۔۔۔ یہ سب ان کے ادبی کارناموں کے مختلف پہلو ہیں۔ تنقید بطور خود ایک ایسی صنفِ ادب ہے، جس کے حدود بہت، دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ صنف جہاں خود متعدد ضمنی اصناف کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے، وہاں پر ذیلی صنف وسعت اور گہرائی میں بحرِ بے پایاں سے کم نہیں۔ سلیم اختر اس بحرِ بے پایاں کے ایسے شناور ہیں، جو اس کی گہرائی سے نئے ادبی اور تنقیدی گوہر ڈھونڈ کے لے آئے ہیں۔''

پروفیسر جگن ناتھ آزاد:

''اس کتاب کو جو چیز تاریخ و تنقید کے نقطہء نظر سے زیادہ اہم بنا دیتی ہے، وہ شعرا اور مصنفین کے بارے میں مصنف کی رائے کی اصابت و سنجیدگی ہے۔۔۔ بات یہ ہے کہ سلیم اختر نے ادیب یا ادب پارے کو دوست یا دشمن کی نگاہ سے نہیں ادب کے ایک سچے اور دیانت دار ناقد کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ نتیجتاً ان کی تنقیدی رائیں بے لاگ بھی ہیں اور خاص و عام سب کے لیے قابلِ اعتماد بھی۔''

ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''تاریخِ ادب ادبی تعبیر و تشریح اور تجزیے کا عمل ہی نہیں مواد کی چھان پھٹک اور قاری تک درست مطالب کی ترسیل کا وسیلہ بھی ہے۔ سلیم اختر اپنے قاری کو اس لحاظ سے بھی مایوس نہیں کرتا ہے۔''

ڈاکٹر وحید قریشی:

''یہ تاریخ کہنے کو مختصر ترین تاریخ ادب اُردو ہے، لیکن اس میں اہم لکھنے والوں کا جائزہ اس قدر تفصیل سے لیا گیا ہے کہ ان کے ادب کی بنیادی خصوصیات واضح

ہو جاتی ہیں۔ یہ ایسی خصوصیت ہے، جو سلیم اختر سے دگنی ضخامت میں تاریخ ادب لکھنے والے بیشتر لوگوں کو حاصل نہیں ہوسکی۔ یہ تاریخِ ادبِ اُردو اس بات کی مستحق ہے کہ ادب کے سنجیدہ طلبہ اس کا مطالعہ کریں۔''

ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا:

''ہمارے مشہور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے اگر غالب کو شعور اور لاشعور کا شاعر قرار دیا ہے تو یہ ایک ناقابلِ تردید سچائی ہے۔ سلیم اختر کی نئی تصنیف ''شعور اور لاشعور کا شاعر''۔ غالب، اس لحاظ سے ہماری تنقید میں اولیت رکھتی ہے کہ اس سے پہلے غالب کے کلام کا نفسیاتی مطالعہ اِکا دُکا مضامین میں تو کیا گیا ہے مگر باقاعدہ ایک کتاب کی صورت میں، غالب کی سی بڑی شخصیت کا نفسی تجزیہ شاید پہلی بار ہوا ہے۔''

(احمد ندیم قاسمی)

''پروفیسر سلیم اختر ادبِ اُردو کے مورخ اور نقاد کی حیثیت سے اب اتنے معروف اور مقبول ہیں کہ ان کا تعارف مسلمات کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔ ان کے تنقیدی شعور میں علم اور عقل کی سنجیدگی کا امتزاج ہے اور ادب کی تاریخ نگاری سے ان کی خاص دلچسپی ظاہر کرتی ہے کہ ان کی واقعاتی حِس بڑی تربیت یافتہ ہے۔''

(ڈاکٹر سید عبداللہ)

''ڈاکٹر سلیم اختر کی ''مختصر ترین تعریف'' یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ پیتل کے بہت بڑے ڈھیر میں سونے کی ایک ڈلی ہے اور سونا کبھی پرانا نہیں ہوتا۔''

(قتیل شفائی)

''سلیم اختر کی اس کتاب کا امتیاز یہی ہے کہ اس میں شاعرانہ محاسن اور افکار و تصورات سے زیادہ علامہ کے ذہنی مطالعے اور نفسی تجزیے کی طرف غالباً پہلی مرتبہ باضابطہ اور سنجیدہ کوشش کے نشان ملتے ہیں۔۔۔ سلیم اختر نے جرات سے کام لیا، جو علامہ اقبال کے نفسیاتی مطالعے کا بیڑا اٹھایا، وہ بہت توازن اور احتیاط سے لکھنے والے ہیں۔۔۔ اب اس سلسلے میں جتنا بھی کام ہوگا، سلیم اختر کی پہل تسلیم کی جائے گی اور تنقیدِ اقبال میں ایک نئی اور اہم جہت کی دریافت کا

سہرا ان کے سر رہے گا۔"

(پروفیسر محمد عثمان)

"سلیم اختر نئی نسل کا فرد ہے۔ وہ نئی نسل کے بعض کوتاہ فکر ساتھیوں کی طرح جذباتی باغی نہیں۔ روایات سے بغاوت بھی کرتا ہے اور روایات کا احترام بھی کرتا ہے اس نے اُردو کے کلاسیکی ادب کے بیشتر دور کا بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، اس لیے جب بھی وہ کوئی بات کرتا ہے، اس میں وزن ہوتا ہے، فکری گہرائی ہوتی ہے، توازن اور اعتدال ہوتا ہے اور خود اعتمادی کا وہ احساس ملتا ہے جو ایک باشعور، دیدہ ور اور ذمہ دار مصنف کا خاصہ ہے، ادب کی دنیا کا یہ مسافر ہر دم تازہ دم ہے۔ تیز رو تو یقیناً ہے مگر قدم اٹھانے میں بڑا محتاط ہے۔"

(میرزا ادیب)

"سلیم اختر نے فرائیڈ سے جو گہرے اثرات لیے ہیں ان کی وجہ سے ان کے افسانوں میں لاشعور کو خاصا دخل رہا ہے لیکن چوں کہ وہ صاحبِ مطالعہ اور صاحبِ بصیرت ادیب ہیں، اس لیے ان کے ہاں شعور کی رو لاشعور کے ساتھ مل کر چلتی ہے۔"

(ڈاکٹر عرش صدیقی)

"مٹھی بھر سانپ" کی کہانیوں میں ایک چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ ان کے ہاں تمام زنانہ کردار؛ کم رُو، بدوضع اور ناقابلِ توجہ سے ہیں۔ یہ صورتِ حال فکشن کی روایتی دوشیزاؤں، محبوباؤں اور ناریوں کے جمال کے تذکروں کے بالکل برعکس ہے۔ ممکن ہے موضوعات کی نوعیت نے افسانہ نگار سے ایسے کردار تخلیق کروائے ہوں۔۔ ان کہانیوں پر ڈاکٹر سلیم اختر کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے۔ سادہ زبان، بے تکلف اظہار اور بے ساختہ اسلوب افسانہ نگار کی پہچان ہے۔۔۔ وہ نظارے جو ہم دوسروں کے سامنے دیکھنے سے کتراتے ہیں۔ سلیم اختر ہمیں دکھا دیتے ہیں، انھیں پوری ہمت اور حوصلے سے لکھ دیتے ہیں۔ یہی وصف ان کی کہانیوں کی دلکشی اور تاثر کا بڑا سبب ہے اور میرے خیال

میں یہی وصف سلیم اختر کو اس دور کا کامیاب ترین افسانہ نگار ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔''

(ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی)

''سلیم اختر کی ایک خوبی نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا ہے کہ ان کے یہاں ایک توازن ہے، اظہار میں، بُنت میں، کرداروں کے رویے میں، کہانی کی اٹھان میں۔ یہ خوبی ''ضبط کی دیوار میں'' پوری طرح موجود ہے۔''

(ڈاکٹر رشید امجد)

''ضبط کی دیوار'' سلیم اختر کے تنقیدی اسلوب کی آنچ میں نکھرا ہوا ایک ایسا افسانوی ادب پارہ ہے جو اپنے مخصوص کونٹنٹ اور کہانی کے لطیف انداز کے حوالے سے اُردو ادب میں منفرد ہے۔''

(مستنصر حسین تارڑ)

''سلیم اختر کے افسانوں کی کردار نگاری میں ایک بات جو سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ سلیم اختر کے تقریباً سارے کردار individual ہوتے ہیں Types نہیں ہوتے۔۔۔۔ان کی شخصیت کی اپنی Limitations, Oddities اور Accenteries ہوتی ہیں۔۔۔یہ سب کے سب لوگ ایک نہ ایک نفسیاتی لمحے کی گرفت میں ہیں اور وہی نفسیاتی لمحہ ان کے کردار کی تشکیل، تکمیل، ارتقا اور اس کی تفہیم میں مدد دیتا ہے۔ سلیم اختر کے افسانوں کے کردار static یا جامد نہیں Dynmaic متحرک، رواں دواں اور ارتقا پذیر ہیں۔''

(فرخ درانی)

''ڈاکٹر سلیم اختر ان معدودے چند اہلِ قلم میں سے ہیں، جو بیک وقت افسانہ نگار، نقاد اور ادبی مورخ ہیں لیکن ان کی تینوں حیثیتیں اتنی مستحکم ہیں کہ کیا مجال کوئی ان کی تنقید کو افسانہ دافسوں کا نام دے سکے یا ان کی ادبی تاریخ کو طبع زاد کہانیوں کا مجموعہ کہہ سکے۔ وہ جب بھی کسی موضوع پہ لکھتے ہیں ڈوب کر لکھتے ہیں بل کہ قاری کو بھی گلے گلے ڈبو دیتے ہیں۔''

(مشفق خواجہ)

''ڈاکٹر سلیم اختر کا ذہن قاموسی ہے اوران کا تنقیدی وژن غیر معمولی اور گہرا ہے انھیں محض نفسیاتی نقاد باور نہیں کرنا چاہیے بل کہ تنقید کے تمام تر دبستانوں میں ان کی رسائی کا احساس کرتے ہوئے انھیں ادبی تنقید کی تاریخ میں انتہائی اہم مقام دینا چاہیے۔''

(ڈاکٹر جلیل اشرف)

''ہمارے افسانہ نگار کے گرد جو سماجی نظام پھیلا ہوا ہے وہ معاشی آسائش، خاندانی اقدار، جاگیردارانہ ہٹ بازی اور سرمایہ دارانہ تعیش کا نظام نہیں۔ یہ تو ان لوگوں کی کہانیاں ہیں، جو غربت اور تعلق داری کی جبریت تلے پیدا ہوئے اور سبزہء نو دمیدہ کی طرح سر اٹھاتے ہی پامال ہو گئے۔ ان کے چہرے چمک سے، جیبیں مال وزر سے، بدن قوتِ نمو سے اور دل خالص محبت سے خالی ہیں، اس طرح سلیم اختر کا ہیرو مجموعی طور پر ایک مفلوک الحال سفید پوش، نفس پر ضرورت سے زیادہ جبر کرنے والا اور نفس پر ہی ضرورت سے زیادہ انحصار کرنے والا اسکول ماسٹر یا اسی قبیل کا نیم متوسط کوئی دوسرا درویشِ بیمار ہے، جس کی ظاہری حالت میں کوئی ایسی ادا نہیں جو قبولیت، ہمدردی اور محبت کے مقامِ محمود پر پہنچتی ہو، وہ بار بار دھتکارے جانے کے عمل سے گزر کر، ایک ایسی موضوعیت میں ڈھل گیا ہے کہ لوگ اسے جنسِ دگر خیال کرتے ہیں۔''

(ڈاکٹر شاہین مفتی)

''ادب کے قارئین کے لیے یہ سوال بہت اہم ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر کی شناخت کا اولین حوالہ کیا ہے؟ تخلیق کار، محقق یا مورخ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہوگا۔۔۔ نفسیاتی تنقید پر اُردو کے جتنے نقادوں نے ابھی تک قلم اٹھایا ہے۔ ان کے لیے ڈاکٹر سلیم اختر کی کتب بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔۔ کچھ عرصے پہلے ان کی بنیاد پرستی پہ کتاب آئی تھی، جس میں انھوں نے ایک مختلف انداز اپنالیا، اس میں جرات اظہار بھی ہے، جو انھیں نفسیاتی نقاد کے ساتھ ساتھ عمرانی نقاد بناتی ہے۔''

(ڈاکٹر روبینہ ترین)

''ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک ماہر غزل گو کی طرح اپنے ہر افسانے کی نوک پلک

خوب اچھی طرح سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا ہر افسانہ اعلیٰ علمی معیار کی سند تسلیم کیا جاتا ہے۔۔۔ جب تک اُردو افسانے کا نام رہے گا ڈاکٹر سلیم اختر کا نام تابندہ بل کہ پائندہ رہے گا۔"

(ڈاکٹر شبیہ الحسن)

"انشائیے کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کے اپنے الگ اور منفرد نظریات ہیں اور ان کی رائے، ہر پہلو سے صحیح ہے کہ انشائیہ نگار، انشائیہ لکھ کر اپنی سائیکی کے اس پہلو کو سامنے لاتا ہے جسے نسوانی روح سے تعبیر کیا جا چکا ہے۔۔ سلیم اختر نے قافیہ اور ردیف کو بھی نفسیاتی اہمیت کا حامل گردانتے ہوئے مقطع کو شاعر کے ذاتی حوالے سے نفسی تسکین اور لاشعوری محرکات کا مظہر قرار دیا ہے۔"

(ڈاکٹر طاہر تونسوی)

اعزازات

☆ ادبی اعزازات

۱۔	صدارتی تمغہ حسنِ کارکردگی برائے ادب	۲۰۰۷ء
۲۔	داؤد ادبی ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید	۱۹۷۲ء ''ادب اور لاشعور''
۳۔	گلڈ انعام برائے تنقید	۱۹۸۲ء بھارت ۔ ۱۹۸۸ء (سفرنامہ)
۴۔	نیاز فتح پوری ایوارڈ	۱۹۹۳ء
۵۔	اٹھارواں عالمی فروغِ ادب اردو ایوارڈ، دوحہ قطر، ۲۰۱۴ء	

☆ خصوصی گوشے

۱۔	سیپ	کراچی	اگست ستمبر	۱۹۷۵ء
۲۔	ماہِ نو	لاہور	جنوری	۱۹۸۴ء
۳۔	الفاظ	کراچی	مارچ	۱۹۸۴ء
۴۔	افکار	کراچی	جون	۱۹۸۵ء
۵۔	فنون	لاہور	دسمبر	۱۹۸۷ء
۶۔	بیسویں صدی	نئی دہلی	اپریل	۱۹۸۴ء
۷۔	تخلیق	لاہور	اگست	۱۹۹۵ء
۸۔	دنیائے ادب	کراچی	جون	۲۰۱۲ء
۹۔	سیپ	کراچی	اگست	۱۲۰۲ء

۱۰۔	مسلک	ملتان		۱۹۹۸ء
۱۱۔	تسیطر	لاہور		۱۹۹۹ء
۱۲۔	راوی	لاہور	اگست	۱۹۹۹ء
۱۳۔	چہارسو	راولپنڈی	اپریل	۲۰۰۰ء
۱۴۔	بیاض	لاہور	دسمبر	۲۰۰۳ء
۱۵۔	شام وسحر	لاہور	مارچ	۲۰۰۷ء
۱۶۔	وجدان	لاہور	مارچ	۲۰۰۹ء
۱۷۔	مجلسِ فروغِ اردوادب، دوحہ قطر،			۲۰۱۴ء

☆ اعترافِ فن وشخصیت

ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت اورفن کے بارے میں مرتبہ کتب:

۱۔ ہم سفر بگولوں کا، از ڈاکٹر طاہر تونسوی، لاہور، ۱۹۸۵ء/نئی دہلی ۱۹۹۲ء

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت نقاد، از ڈاکٹر جلیل اشرف، ہزاری باغ، بھارت ۱۹۹۸ء (تیسرا ایڈیشن سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸ء)

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر: ایک مطالعہ، مرتبہ تاج سعید، سپوتنک، لاہور، ۲۰۰۱ء

۴۔ ذوقِ سلیم، مرتبہ جاوید اقبال ندیم، لاہور، ۲۰۰۲ء

۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر اشاریہ، مرتبہ محمد سعید، لاہور ۲۰۰۲ء

۶۔ ڈاکٹر سلیم اختر جہت ساز قلم کار، ڈاکٹر طاہر تونسوی، لاہور، ۲۰۰۳ء

۷۔ مکالماتِ سلیم (انٹرویوز) مرتبہ عاصمہ اصغر، ۲۰۱۲ء

۸۔ رقعاتِ مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر سلیم اختر، مرتبہ خالد ندیم ۲۰۱۲ء

☆ غیرملکی تراجم

۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے ناولٹ ''ضبط کی دیوار'' کے پاکستان اور بھارت میں پانچ پانچ ایڈیشن

طبع ہوئے۔ اس کے ہندی اور عربی میں تراجم ہوئے۔

۲۔ تنقیدی دبستان کا شوکت مغل نے سرائیکی زبان میں ترجمہ کیا۔

۳۔ متعدد افسانوں کے انگریزی، ہندی، پنجابی، ترکی اور آسامی میں تراجم ہوئے۔

☆ اہم کانفرنسوں میں شرکت

۱۔ اقبال انٹرنیشنل کانگریس، جامعہ پنجاب لاہور، ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۹۸ء

۲۔ بین الاقوامی فکر اقبال کانفرنس، خانۂ فرہنگ ایران، لاہور ۱۹۹۶ء

۳۔ بین الاقوامی اُردو کانفرنس ملتان، ۱۹۹۲ء

۴۔ انٹرنیشنل جوش صدی سیمینار کراچی، ۱۹۹۹ء

۵۔ غالب بین الاقوامی سیمینار غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، ۱۹۸۸ء

۶۔ میر تقی میر سیمینار دوحہ قطر، ۱۹۹۶ء

۷۔ سرسید احمد خاں صدی تقریبات مارشیس ۱۹۹۸ء

۸۔ میر تقی میر سیمینار، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۱۹۹۹ء

☆ علمی، ادبی، تہذیبی اداروں کی رکنیت

۱۔	دائمی رکنیت	اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور۔
۲۔	مستقل رکن	اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد۔
۳۔	رکن	مرکزی فلم سنسر بورڈ، لاہور
۴۔	رکن	مجلسِ دفتری زبان حکومتِ پنجاب
۵۔	رکن	لاہور آرٹس کونسل

اس کے علاوہ قومی سطح پر دیئے گئے انعامات کے ضمن میں منصف کے فرائض انجام دیے۔

۶۔	منصف	ہجراہ ایوارڈ	اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
۷۔	منصف	پانچواں عالمی فروغ ادب ایوارڈ، دوحہ قطر، ۲۰۰۰ء	

۸۔ منصف پروین شاکر ٹرسٹ ایوارڈ، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

۹۔ قومی اقبال ایوارڈ اقبال اکادمی لاہور، ۹۵،۹۴،۹۳،۹۲،۱۹۹۱ء

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی ایوارڈ لاہور ۲۰۰۱ء

☆ تحقیقی راہنمائی

ایم اے اور ایم فل کے درجنوں طلباء کے تحقیق مقالات کے نگران اور ممتحن رہے یہاں صرف پی ایچ ڈی مقالات کی تفصیل درج ہے۔

۱۔ سید عابد علی عابد: شخصیت وفن از ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان ۱۹۸۴ء

۲۔ علی عباس حسینی: حیات اور فن از ڈاکٹر اسلم عزیز درانی، ایضاً، ۱۹۸۹ء

۳۔ فیض احمد فیض: شخصیت وفن از ڈاکٹر صلاح الدین حیدر، ایضاً، ۱۹۹۱ء

۴۔ اُردو افسانے میں ابنارمل کردار، ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی، ۲۰۰۸ء

☆ اعلیٰ مدارج کے نصاب میں شامل کتب

۱۔ اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سی ایس ایس۔ پی سی ایس اور بی اے

۲۔ تنقیدی دبستان، ایم۔ اے اُردو، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان، راج شاہی یونیورسٹی بنگلہ دیش، پشاور یونیورسٹی پشاور۔

۳۔ نفسیاتی تنقید، ایم اے سرائیکی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ایم اے اُردو پشاور یونیورسٹی

۴۔ انارکلی کا تجزیاتی مطالعہ، مراۃ العروس کا تجزیاتی مطالعہ، امراؤ جان ادا کا تجزیاتی مطالعہ، اے لیول کے اُردو نصاب میں شامل ہے۔

۵۔ تاریخِ ادب اُردو (حصہ دوم) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد ۲۰۰۰ء

۶۔ اُردو تنقید، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد ۲۰۰۰ء۔

مطبوعہ تخلیقات

☆ ناولٹ

۱۔ ضبط کی دیوار، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۷۷ء (بھارت سے ہندی ترجمہ) ۱۹۸۰ء

۲۔ ایضاً اُردو ایڈیشن، نصرت پبلشرز لکھنو ۱۹۸۳ء

۳۔ ایضاً ماورا پبلشرز لاہور ۱۹۸۹ء

۴۔ ایضاً گورا پبلشرز لاہور ۱۹۹۵ء

☆ افسانہ

۱۔ کڑوے بادام، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء دوسرا ایڈیشن ایضاً ۲۰۱۲ء

۲۔ کاٹھ کی عورتیں، پولیمر پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۰ء دوسرا ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء

۳۔ مٹھی بھر سانپ، وکٹری بک بنک، لاہور ۱۹۹۲ء

۴۔ چالیس منٹ کی عورت، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۳ء، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۲ء

۵۔ آدھی رات کی مخلوق، الرزاق پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۹ء دوسرا ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲

۶۔ نرگس اور کیکٹس (افسانوی کلیات) سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۵ء

۷۔ جرسِ غنچہ سنگ میل " " ۲۰۱۲ء

☆ سفرنامہ

۱۔ اک جہاں سب سے الگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۱ء

۲۔ عجب سیر تھی، فیروز سنز، لاہور ۲۰۰۲ء

☆ آپ بیتی

۱۔ نشانِ جگر سوختہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۵ء

☆ خاکہ نگاری

۱۔ درشن جھروکہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۹ء

مطبوعہ تصنیفات وتالیفات

☆ تنقید

۱۔ نگاہ اور نقطے، جدید ناشرین، لاہور بار اول ۱۹۶۸ء، چوتھا ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۹ء

۲۔ دلی والے میر امن کی باغ و بہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (مرتبہ) میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۸ء

۳۔ اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، طبع اول ۱۹۷۱ء، ایضاً بائیسواں ایڈیشن ۲۰۱۲ء

۴۔ تنقیدی دبستان، مکتبہ، عالیہ لاہور، ۱۹۷۳ء، پانچواں ایڈیشن (نظر ثانی واضافہ) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۷ء

۵۔ تنقیدی دبستان (سرائیکی ترجمہ) مترجم شوکت مغل، سرائیکی ادبی بورڈ ملتان ۱۹۹۷ء

۶۔ تنقید اور تاریخِ ادب (جامع فہرست مطبوعات پاکستان) نیشنل بک سنٹر آف پاکستان، لاہور ۱۹۷۳ء

۷۔ ادب اور لاشعور، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۷۶ء، دوسرا ایڈیشن (اضافے کے ساتھ) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸ء

۸۔ تنوع، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور ۲۰۰۲ء

۹۔ حیاتِ جاوید (تلخیص) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور جدید ایڈیشن ۱۹۷۶ء
حیاتِ جاوید تیسرا ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۹ء

۱۰۔ تخلیق اور لاشعوری محرکات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۳ء
،، ،، دوسرا ایڈیشن ایضاً ۲۰۰۸ء

۱۱۔ ادب اور کلچر، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۸۴ء

۱۲۔ نفسیاتی تنقید، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۸۶ء
،، دوسرا ایڈیشن ایضاً ۲۰۰۶ء

۱۳۔ انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۶ء

۱۴۔ جوش کا نفسیاتی مطالعہ، فیروز سنز، لاہور ۱۹۸۷ء

۱۵۔ پاکستان میں اُردو ادب سال بہ سال (سالانہ ادبی جائزے، ۱۹۸۷ء۔۱۹۷۷ء) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۸ء

۱۶۔ تخلیق، تخلیقی شخصیات (تنقیدی کلیات)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۹ء

۱۷۔ داستان اور ناول: تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء

۱۸۔ افسانہ اور افسانہ نگاری: تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء

۱۹۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری (کتابیات) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۲ء

۲۰۔ مجموعہ تحقیق و تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء

۲۱۔ اُردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۹۵ء

۲۲۔ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۵ء

۲۳۔ مغرب میں نفسیاتی تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۸ء

،، دوسرا ایڈیشن ایضاً ۲۰۰۸ء

۲۴۔ اُردو زبان کیا ہے؟ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۹ء

۲۵۔ شعور اور لاشعور کا شاعر غالب (تین ایڈیشن) فیروز سنز، لاہور ۱۹۸۴ء

۲۶۔ غالب شناسی اور نیاز و نگار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۸ء

۲۷۔ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء

۲۸۔ اقبال، شخصیت، افکار و تصورات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۳ء

۲۹۔ اقبال اور ہمارے فکری رویے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۲ء

۳۰۔ اقبال کی فکری میراث، بزم اقبال، لاہور ۱۹۹۲ء

۳۱۔ شرح ارمغانِ حجاز (اُردو) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۴ء

۳۲۔ پاکستانی شاعرات: تخلیقی خدوخال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

۳۳۔ میرا من سے میرا جی تک (مقدمات) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۱ء

۳۴۔ تنقیدی اصطلاحات: توضیحی لغت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۱ء

۳۵۔ نظر اور نظریہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۹ء

۳۶۔ بنیاد پرستی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۶ء، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۲ء

۳۷۔ کلامِ نرم و نازک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۴ء

۳۸۔ تین بڑے نفسیات دان، ایضاً ۱۹۹۴ء

مرتبہ تنقیدی کتب و رسائل

۱۔ اصطلاح سازی، تاریخ، مباحث (مرتبہ) مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۳ء

۲۔ پاکستانی ادب ۱۹۹۲ء (انتخاب حصہ نثر) اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

۳۔ پاکستانی ادب ۱۹۹۳ء (انتخاب حصہ نثر) ایضاً ۱۹۹۴ء

۴۔ پاکستانی ادب ۱۹۹۴ء (انتخاب حصہ نثر) ایضاً ۱۹۹۵ء

۵۔ پاکستانی ادب ۲۰۰۰ (انتخاب حصہ نثر) ایضاً ۲۰۰۱ء

۶۔ پاکستانی ادب ۲۰۰۴ (انتخاب حصہ نثر) ایضاً ۲۰۰۵ء

۷۔ خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی (مرتبہ۔۔شریک مرتبین شبنم شکیل، خالدہ حسین) وزارت ترقی خواتین، حکومت پاکستان اسلام آباد ۲۰۰۵ء

۸۔ فکرِ اقبال کے منور گوشے (مرتبہ) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۷ء

۹۔ اقبال کا ادبی نصب العین (مرتبہ) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۷ء

،، دوسرا ایڈیشن اقبال اکادمی، لاہور ۲۰۰۵ء

۱۰۔ علامہ اقبال: حیات فکر و فن ۔ ۱۰۱ مقالات (مرتبہ) سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۳ء

۱۱۔ اقبالیات کے نقوش (مرتبہ) اقبال اکیڈمی، پاکستان ۱۹۷۷ء، دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء

۱۲۔ اقبال ممدوح عالم (مرتبہ) بزم اقبال لاہور ۱۹۷۸ء

۱۳۔ اقبال شعاعِ صد رنگ (مرتبہ) سنگ میل لاہور، ۱۹۷۸ء

۱۴۔ ایران میں اقبال شناسی کی روایت (مرتبہ) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۳ء

۱۵۔ اقبال شناسی اور فنون (مرتبہ) بزم اقبال، لاہور ۱۹۸۸ء

۱۶۔ فکرِ اقبال کا تعارف (ترجمہ) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۹ء

لوس کلوڈ شیخ کی فرانسیسی کتاب کے انگریزی ترجمے، تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء

از ملا عبدالمجید سے ماخوذ

☆ عمومی نفسیات

۱۔ صبح کرنا شام کا (آزاد ترجمہ How to live on 24 Hours a day)
مصنف آرنلڈ بینٹ، جدید ناشرین ۱۹۶۱ء دوسرا ایڈیشن بعنوان ''روزانہ چوبیس گھنٹے کیسے زندہ رہیں، مکتبہ میری لائبریری لاہور ۱۹۷۱ء

۲۔ عورت جنس اور جذبات، مکتبہ جدید، لاہور ۱۹۸۴ء ساتوں ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۸ء

۳۔ ہماری جنسی اور جذباتی زندگی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۵ء، تیسرا ایڈیشن، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۴ء

۴۔ عورت جنس کے آئینے میں (ترجمہ) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۶ء، دوسرا ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۶ء

۵۔ مرد جنس کے آئینے میں (ترجمہ) شیخ غلام علی اینڈ سنز شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۶ء

۶۔ شادی، جنس اور جذبات (ترجمہ) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۶ء، دوسرا ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۹ء

۷۔ ستائیے اور زندگی بڑھائیے ترجمہ (Relax and live) از جوزف اے کینڈی مکتبہ میری لائبریری لاہور ۱۹۷۶ء

۸۔ خود شناسی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۱ء

☆ سوانح

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ایک جہت نما، صاحب قلم ۔۔ الوقار، لاہور، ۲۰۰۴ء

۲۔ سید عابد علی عابد، فن اور شخصیت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۰۰۷ء

☆ نصابی کتب

۱۔ انارکلی کا تجزیاتی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۸ء

۲۔ مراۃ العروس کا تجزیاتی مطالعہ ایضاً ۱۹۹۸ء

۳۔ چھ افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ ایضاً ۱۹۹۸ء

۴۔ نیا اُردو نصاب ایضاً ۲۰۰۶ء

۵۔ اُردو نصاب (افسانے، غزلیات) ایضاً ۱۹۹۹ء

۶۔ شاعری ایضاً ۲۰۰۱ء

۷۔ امراؤ جان ادا کا مطالعہ ایضاً ۲۰۰۲ء

۸۔ نیا اُردو نصاب (او لیول) ایضاً ۲۰۰۶ء

۹۔ ایضاً ایضاً ۲۰۰۸ء

۱۰۔ تاریخ ادب اُردو (حصہ اول) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد ۲۰۰۰ء

غیر مدون مضامین

۱۔ ہماری قومی ثقافت اور فیض احمد فیض، قومی زبان، فیض نمبر، کراچی جون ۲۰۱۱ء

۲۔ فیض کا تصورِ ادب میزان کی روشنی میں، ادبیات، فیض نمبر، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

۳۔ کیا آج فیض کی ضرورت ہے، سیپ، کراچی، ۲۰۱۲ء

۴۔ جوش کا تصورِ ادب، سیپ جوش شناسی نمبر ۴، کراچی

۵۔ صدورق، صد خیال، جمیل الدین عالی، قومی زبان، کراچی، جولائی ۲۰۰۹ء

۶۔ آہ قرۃ العین حیدر، قومی زبان، کراچی، جنوری ۲۰۰۸ء

۷۔ کچھ مسعود اشعر کے بارے میں، کولاژ، کراچی

۸۔ اپنا وارث شاہ، سید وارث شاہ کا عمرانی فلسفہ، از ڈاکٹر شائستہ نزہت، ماہ نو، لاہور

۹۔ یادگارِ انیس، مخزن، لاہور

۱۰۔ انیس سے اقبال تک، چہار سو، راولپنڈی

۱۱۔ حقیقت سے حقیقت تک کا سفر، ادبیات، امرتا پریتم نمبر، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

۱۲۔ تہہ خانے سے (ترجمہ انیس ناگی)، فنون، لاہور ۲۰۰۹ء

۱۳۔ ادا جعفری، سنگت، کوئٹہ، ۲۰۰۶ء

۱۴۔ کشور ناہید، سنگت، کوئٹہ، ۲۰۰۶ء

۱۵۔ دِلی یاترا، تخلیق، لاہور

۱۶۔ امریکہ میں دل گرفتہ، فرحت پروین، بیاض، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۷۔ بیانِ حلفی (شان الحق حقی) چہار سو، راولپنڈی

۱۸۔ شائستہ اطوار نقاد ڈاکٹر مظفر عباس، شام و سحر، لاہور، اپریل ۱۹۹۹ء

۱۹۔ ڈاکٹر آغا سہیل، شام و سحر، آغا سہیل نمبر، لاہور

۲۰۔ کچھ قیصر بارھوی کے بارے میں، شام و سحر، لاہور، ۱۹۹۹ء

۲۱۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی بطور سوانح نگار، ماہ نو، لاہور

۲۲۔ حسن عابد اور قفسِ خواب، شام وسحر، لاہور، دسمبر ۱۹۹۲ء

۲۳۔ دھرتی کا بیٹا شیر افضل جعفری، شام وسحر، جعفری نمبر جنوری ۱۹۹۰ء

۲۴۔ محبت کا نیلا رنگ ۔۔ (عمار مسعود کا افسانوی مجموعہ)، بیاض، لاہور

۲۵۔ بادِ شمال (بخش لائل پوری) کا سرسری مطالعہ، معاصر انٹرنیشنل، لاہور

۲۶۔ ایک بھلا مانس کالم نگار ۔۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، شام وسحر، لاہور

۲۷۔ العطش، شام وسحر، لاہور

۲۸۔ ترغیبات از شبیہ الحسن، شام وسحر، لاہور

۲۹۔ سیف زلفی کے مرثیے، شام وسحر، لاہور

۳۰۔ مصلوب، فنون، لاہور

۳۱۔ زبانوں کا زوال اور معدومیت، ایوانِ اُردو، جنوری ۲۰۱۳ء

۳۲۔ سرقہ، توارد اور جعل سازی، مخزن، لاہور، شمارہ ۱۸

۳۳۔ ادبی چوریاں، فنون، لاہور، ۲۰۱۲ء

۳۴۔ سبکِ منٹو، اجرا، کراچی شمارہ ۱۲

۳۵۔ اسلوب میں طرزِ نو کا موجد (محمد حسین آزاد)، اجرا، کراچی ۲۰۱۰ء

۳۶۔ اُردو افسانہ حقیقت نگاری سے آگے، سیپ، کراچی، ۲۰۱۲ء

۳۷۔ معتوب کا نفسیاتی مطالعہ، قومی زبان، کراچی، مارچ ۲۰۱۲ء

۳۸۔ غالب ۔۔ اکیسویں صدی میں، قومی زبان، کراچی، فروری ۲۰۱۲ء

۳۹۔ اُردو شاعری کلاسیک سے جدت تک، اجرا، کراچی، شمارہ ۶

۴۰۔ اُردو تنقید ایک مختصر جائزہ، قومی زبان، کراچی، جولائی، ۲۰۰۹ء

۴۱۔ سرسید تحریک کی فکری اساس، قومی زبان، کراچی، جولائی ۲۰۱۰ء

۴۲۔ عصری آگہی اور اقبال، اجرا، کراچی، ۲۰۱۳ء

☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر شاہین مفتی اردو ادب کی دنیا میں شاعری اور تحقیق و تنقید کے حوالے سے اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔ جدیدیت کے رجحانات، وجودی نفسیات، اثباتیت کے امکانات اور تخلیقی نثر ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔ پاکستانی ادب کے معمار کے سلسلے میں ان کی دو تحقیقی کتابیں انیس ناگی: شخصیت اور فن 2008ء اور کشور ناہید: شخصیت اور فن 2010ء قارئین کی پسندیدگی حاصل کر چکی ہیں۔ اکادمی ادبیات ان کی تیسری کتاب ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت اور فن آپ تک پہنچا رہی ہے جو یقیناً آپ کے ذوق کی آبیاری کرے گی۔ موصوفہ کی دیگر تحقیقی کتب میں جدید اردو نظم میں وجودیت، فیض کی شاعری میں رنگ، اردو ادب کا اینٹی ہیرو اور امکان کی بازیافت کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ 2014ء میں ڈاکٹر شاہین مفتی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی جانب سے تمغۂ امتیاز عطا کیا گیا ہے۔

ISBN-978-969-472-285-6